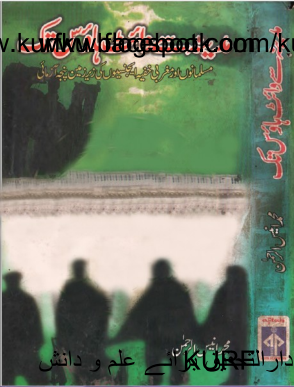

www.kurfku.blogspot.com/ www.facebook.com/ku
دارالعلم KURF برائے علم و دانش

اظہارِ خیال

محمد انیس الرحمٰن صاحب نے اس کتاب میں نہایت قیمتی معلومات کا ذخیرہ جمع کردیا ہے۔ معلومات ایسی وسیع اور اتنی دقیق ہیں کہ ہر شعبے میں غور وفکر اور سوچ کے دروازے کھلتے ہیں۔ مغربی اقوام اپنے خودغرضانہ مفادات کو پروان چڑھانے کے لئے جن تہہ درتہہ سازشوں اور ریشہ دانیوں کا سہارا لیتی ہیں وہ ساری دنیا پر آشکار ہوگئی ہیں۔ بظاہر دل کش چہروں کے پیچھے چھپے ہوئے خون خوار درندے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہے۔ منافقت کے اس میدان میں لاتعداد انٹیلی جنس ادارے مغرب کی اصل طاقت اور بازوئے شمشیرزن ہیں جن کی منافقانہ صلاحیتوں کی گیرائی اور گہرائی میں ہر آن اضافہ ہورہا ہے لیکن یہ ادارے ہی ان کی ناکامی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی بن گئے ہیں۔ محمد انیس الرحمٰن صاحب نے ان معلومات کے ذریعے مغرب کے دوغلے پن سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ لوگ جو روزمرہ کے واقعات کے پیچھے اصل ہاتھ تلاش کرنے کا ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف دلچسپی کا سامان ہے بلکہ مزید ریسرچ کے لئے معاون بھی ثابت ہوسکتی ہے تاہم میں پڑھنے والوں سے یہ ضرور کہوں گا کہ اسے پڑھنے کے بعد مغرب کی کرشماتی طاقت یا مہلک اثر سازشوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت

صلیبی جنگوں میں فکر مدینہ کے خلاف یہ مراکز کلی طور پر یورپ میں فرانس، جرمنی اور روم منتقل ہوگئے اور صلیبی جنگوں کے ساتھ زیر زمین جنگ کا ایک نیا اور جدید مرحلہ شروع ہوا۔اس جنگ میں مغرب کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی مفادات کارفرما تھے جبکہ مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

زیر زمین جنگ کا جدید سلسلہ اٹھارویں صدی میں اس وقت سامنے آیا جب مغربی استعمار نے سطح زمین پر مسلمانوں کو ان کی اخلاقی کمزوریوں اور علمی انحطاط کی بنا پر اپنی کالونیوں میں شامل کرنا شروع کیا مگر اس پر آشوب دور میں بھی اللہ کے بندے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں پیغام محمد ﷺ اور فکر مدینہ کی تحریک کو اپنا سب کچھ لٹا کر زندہ رکھے ہوئے تھے۔تاریخ انسانی کی اس طویل ترین جنگ میں اسلام فکر مدینہ کی بنیاد پر ثابت قدم رہا جبکہ عالم کفر اس جنگ میں اپنے مراکز بدلتا رہا۔ان کی جانب سے زیر زمین جنگ کا اولین مرکز یہودیوں کا قلعہ خیبر تھا۔اس کے بعد ایران اور قسطنطنیہ مرکز بنے۔بعد میں اس جنگ میں یہودیت کے ساتھ عیسائیت بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہوگئی اور یوں اس کی کمان لندن، پیرس اور برلن منتقل ہوئی، انیسویں صدی میں ماسکو کا کیمونزم بھی دشمنوں کی صف میں شامل ہوا، آج اکیسویں صدی میں فکر مدینہ اسی آب و تاب کے ساتھ کھڑی ہے مگر عالم کفر کی تمام قوتیں وائٹ ہاؤس کی قیادت میں جمع ہو چکی ہیں افغان جنگ کے بعد زیر زمین جنگ ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کا احاطہ میں نے گذشتہ نصف صدی کے دوران ہونے والی کشمکش کے تناظر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلامی تحریکوں اور مغرب کے درمیان پنجہ آزمائی 11 ستمبر 2001ء کے بعد ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔گزشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی اس کشمکش نے تاریخ کے کئی نئے دور دیکھے۔یہ کشمکش جدید دور میں جس کا آغاز مسئلہ فلسطین سے ہوا، افغانستان کے محاذ پر ایک نئی شکل میں سامنے آئی۔مسئلہ فلسطین کو عالمی سطح پر ''ام القضایا'' کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی کوکھ سے ایسی اسلامی تحریکوں نے جنم لیا جنھوں نے

مسلمانوں میں مغرب سے ٹکر لینے کا جذبہ پیدا کیا۔افغانستان، مقبوضہ کشمیر، فلپائن، شیشان اور بلقان میں ہونے والے جہاد کا اولین مقصد اصل میں قبلہ اول بیت المقدس کی آزادی ہے۔آزادی فلسطین کی تڑپ اور افغانستان کا میدان جہاد وہ فکری نقطہ ارتکاز ہے جس نے بیسویں اور اکیسویں صدی میں مجاہدین اسلام کو ایک بنیادی مقصد پر لا کھڑا کیا۔امریکہ، عالمی صیہونیت اور سرمایہ داری نظام نے مسلمانوں کا محاصرہ تنگ کرنا شروع کیا تو افغانستان اور مقبوضہ فلسطین کی اسلامی تحریکوں نے علم جہاد بلند کیا۔یوں نصف صدی سے جاری اسلامی تحریکوں اور مغرب کے مابین زیر زمین جنگ سطح زمین پر آ گئی جس کا پہلا بڑا معرکہ خرقہ پوش درویش صفت طالبان نے افغانستان میں لڑا۔اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والے اسلامی ملک پاکستان کی حکومت نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر سب سے پہلے پیٹھ دکھائی اور اسلام کے نام پر قائم نظریہ پاکستان کی ہی نفی کر دی۔اسی جفاکیشی کی بنیاد پر امریکہ افغانستان میں طالبان حکومت ختم کرنے میں کامیاب ہوا مگر طالبان اور القاعدہ کے وجود کو ختم کرنے میں بری طرح ناکام ہوگیا۔امریکہ کی اس ناکامی میں سب سے بڑا کمال القاعدہ اور دیگر اسلامی تحریکوں کا طرز جنگ ہے۔

امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کو طالبان اور القاعدہ سے کیا خوف ہے؟ وہ کون سے مقاصد ہیں جن کے لیے سی آئی اے، موساد، ایم آئی۔6، سائفر اور روس کی کے جی بی اسلامی ملکوں اور تنظیموں سے زیر زمین جنگ میں مشغول ہیں۔اسے جاننے کے لیے ہمیں تھوڑا سا تاریخ کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔دنیا پر اس وقت ایک نادیدہ مثلث حکمرانی کر رہی ہے۔عالمی صیہونیت، بین الاقوامی تیل کمپنیاں اور عالمی سرمایہ کار کمپنیاں۔تین خانوں میں منقسم نظر آنے والی یہ مثلث حقیقت میں ایک اکائی ہے۔یہی دنیا کے تمام مصائب کی جڑ ہے۔امریکی اور دیگر مغربی حکومتیں، سی آئی اے، موساد، عالمی میڈیا، اسلامی دنیا کی بیشتر مقامی حکومتیں اصل میں اسی ''شیطانی مثلث'' کے ذیلی ادارے ہیں جن میں امریکی صدر کی حیثیت کسی ''ہیڈ کلرک'' سے زیادہ نہیں ہوتی۔

1950ء کی دہائی میں جب ایران کے وطن پرست رہنما ڈاکٹر محمد مصدق نے تیل کی دولت کو قومیانے کا اعلان کیا تو دنیا میں پائے جانے والے تیل کو اپنی جائیداد تصور کرنے والی عالمی تیل کمپنیوں نے امریکی حکومت اور سی آئی اے کو ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے خلاف ''کوڈیٹا'' کی راہ دکھائی اور یوں اس عالمی شیطانی ٹولے نے ڈاکٹر مصدق اور ان کی تودہ پارٹی کے خلاف عالمی سطح پر پراپیگنڈے کا آغاز کر دیا۔ انہیں کمیونسٹ اور روس نواز قرار دے کر اسلامی ملکوں اور مقامی مسلمانوں کے درمیان ناپسندیدہ بنانے کی کوشش کی گئی اور آخر میں سازشی انقلاب کے ذریعے امریکن کٹھ پتلی رضا شاہ پہلوی کو ایران پر طویل عرصے کے لیے مسلط کر دیا۔ یوں ایرانی تیل کے ٹھیکے پھر عالمی تیل کمپنیوں کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر مصدق کے خلاف امریکی کارروائی میں دو اہم کرداروں میں ایک سابق امریکی صدر روز ویلٹ کا پوتا کرمٹ روز ویلٹ اور دوسرا 90ء کی خلیجی جنگ میں امریکی فوج کے قائد جنرل شیوارزیکوف کا باپ نارمن شیوارزیکوف شامل تھے۔

تیل کی دولت ہڑپ کرنے کے لیے ''عالمی شیطانی مثلث'' نے دوسرا بڑا کھیل 1990ء کی دہائی میں خلیج میں کھیلا۔ جب ایک منصوبے کے تحت صدام حکومت سے کویت پر قبضہ کرایا گیا۔ پھر آزادی کویت کے نام پر یہاں کی تیل کی دولت پر قبضہ کر لیا گیا۔ جارج بش اول کا وزیر دفاع ڈک چینی عراق کی تیل کی تنصیبات تباہ کرانے میں پیش پیش رہا۔ بعد میں اسی کی کمپنی ٹیکساس آئل کو ان تنصیبات کی مرمت کا ٹھیکہ ملا.......
یوں کویت کی آزادی کے نام پر تمام علاقے کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کی گئی۔

شرق الاوسط میں پیر جمانے کے بعد اب تیسرا مرحلہ بحیرہ قزوین (کیپیئن) کے بے پناہ تیل اور گیس کے ذخائر تک رسائی کا تھا جو متحدہ سوویت یونین کی شکل میں کسی طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کی یہ ''شیطانی مثلث'' طویل عرصے سے طے شدہ منصوبے کے تحت کام کر کے آخر کار سوویت یونین کو افغانستان کے کفر کش میدان میں

گھسیٹ لائی۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے.............اس طویل اور ہولناک جنگ میں جہاں مغرب کی ''شیطانی مثلث'' امریکہ کے ذریعے اپنے مقاصد کی جنگ لڑ رہی تھی تو وہاں پچاس سال سے جدوجہد کرنے والی اسلامی تحریکیں بھی استعمار کے خلاف ایک نیا تجربہ حاصل کر رہی تھیں۔ افغان جہاد نے دنیا بھر کی اسلامی جہادی تحریکوں کو بے پناہ خود اعتمادی سے نوازا۔ کم عمری کے باوجود میں نے افغانستان میں یہ سنہری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ افغان مجاہدین تو امریکیوں کو اس جنگ میں اتحادی تصور کر کے تعاون حاصل کرتے تھے مگر افغانستان میں لڑنے والے عرب مجاہدین نے کبھی امریکیوں کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ شرق الاوسط اور دیگر اسلامی ملکوں سے آنے والا بے پناہ سرمایہ ہی ان مجاہدین کا وسیلہ جہاد تھا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ یہ صحرانشین عرب پہاڑی گوریلا جنگ کے لیے جس سے تربیت لینے کے لیے راضی ہوئے پاکستان کے بعد وہ ملک چین تھا۔

سوویت یونین کی تحلیل اور افغان جہاد کی کامیابی کے بعد اصل معرکے نے اپنی جگہ بنانی شروع کی۔ یہ معرکہ یا جنگ اب ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ تحریکوں اور ملکوں کے درمیان لڑی جانی تھی۔ جس میں ملکوں کی قیادت امریکہ اور تحریکوں کی قیادت القاعدہ کو کرنا تھی، یہ نہ ختم ہونے والی جنگ اب شروع ہو چکی ہے۔ اس کے میدان جغرافیائی حدود سے ماوراء ہیں۔ شخصی تاثر سے عاری یہ تحریک کسی اسامہ یا ملاعمر کی محتاج نہیں۔ ان حضرات سے پہلے بھی یہ تحریک جاری تھی ان کے بعد بھی جاری رہے گی۔ یہ جنگ زیر زمین بھی جاری ہے وہاں اب سطح زمین پر بھی اس کے آثار ابھر رہے ہیں۔ اسرائیلی موساد کا اثر پی ایل او میں شامل بعض تنظیموں نے یورپ میں زائل کر دیا تھا، سی آئی اے ناکامیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ مغرب کی ''شیطانی مثلث'' نے سب سے زیادہ کامیابیاں اسلامی ملکوں کی مقامی قیادتوں کے ذریعے حاصل کیں۔.......

مئر. نے اپنی اس کتاب ''مدینہ سے وائٹ ہاؤس تک'' میں مختلف حوالوں سے مغرب اور اسلامی تحریکوں کی اس پنجہ آزمائی کو موضوع بنایا ہے جو مختلف ادوار میں مختلف

محاذوں پر ہوئے۔ مغرب کس طرح فکری سطح پر اس کشمکش کا جائزہ لیتا ہے اس کا اندازہ مجھے یورپ میں تعلیم اور مختلف ذمہ داریوں کے دوران ہو چکا ہے۔ اس تناظر میں مجھے مشرق یا اسلامی دنیا میں اداروں کی کمی محسوس ہوئی۔ مغرب کا کھوکھلا معاشرہ صرف اداروں کی وجہ سے کامیاب ہے جبکہ آج کے مسلمان طاقتور فکری روح کے حامل ہونے کے باوجود ادارے نہ ہونے کی بنا پر غیر موثر ہیں۔ اس سلسلے میں مسلمانوں میں اگر کسی کی خدمات نا قابل فراموش ہیں تو وہ عرب ہیں جنہوں نے جدید دور میں سب سے پہلے تحقیقی اداروں کی بنیاد ڈالی ہے۔ میں اس سلسلے میں عرب اساتذہ کا شکر گزار ہوں جو اپنے وسائل کا صحیح استعمال کر کے مغرب اور مشرق میں بیٹھ کر بے پناہ خدمات انجام دے رہے ہیں اور مسلمان نوجوانوں کو آنے والے فکری معرکوں کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ میں نے شمالی افریقہ اور شرق الاوسط میں مسلمان نوجوانوں کا شعور سے آراستہ وہ جوش اور ولولہ بھی دیکھا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ مسلمانوں کی یہ نئی نسل اب کسی بھی استعماری ہتھکنڈے کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میری یہ کتاب "مدینہ سے وائٹ ہاؤس تک" انہی سرفروشوں کے اسلامی ولولوں اور فکری شعور کی آئینہ دار ہے جو آنے والے وقت میں مشرقی انقلاب کی چاپ واضح طور پر سن سکتے ہیں۔

محمد انیس الرحمٰن

anisjournalist@hotmail.com

حرف چند

والتیئر کا قول ہے۔ "آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہئے کہ جب سے دنیا بنی ہے ئی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی۔" کتاب اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کے تینوں زمانوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔ اگر صرف زبان ہی اظہار کا سب ے بڑا ذریعہ ہوتی تو آسمانی کتب کی ضرورت پیش نہ آتی۔ کتابوں نے ماضی کو سامنے رکھ کر نہ صرف حال کی اصلاح اور رہنمائی کرنی ہوتی ہے بلکہ ماضی پر حکمرانی بھی کرنا ہوتی ہے۔ محمد انیس الرحمٰن نے پرنٹ میڈیا کے ذریعے بہت کم عرصے میں قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کیا، اب وہ لتابوں کے ذریعے مستقبل پر حکمرانی کرنے جا رہے ہیں۔ ہر تحریر پر کتاب اور اظہار کا ہر ذریعہ الوں پر اثر نہیں کرتا۔ اس کا انحصار اظہار کرنے والے کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا وب کہا ہے۔

افکار و حوادث کی تفسیر نہیں ہوتی — ہر شے جو قلم لکھے تحریر نہیں ہوتی
یہ شرط ہے لہجے سے اک درد ٹپکتا ہو — ہر شخص کی باتوں میں تاثیر نہیں ہوتی

محمد انیس الرحمٰن کون ہے؟ اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے میں یہ اعتراف کرنے یں کوئی عذر محسوس نہیں کرتا کہ نہ صرف اس کی باتوں میں بلا کی تاثیر ہے، اس کا لہجہ فکر اور درد ے بھرا ہوتا ہے اور اس کے قلم سے میں نے اسلام اور مشن کی خاطر آنسو ٹپکتے دیکھے ہیں...... محمد انیس الرحمٰن نے اپنے والد محمد امین الرحمٰن کے ادارے "اخبار العرب" کی کوکھ سے جنم لیا۔ اخبار العرب پڑھنے والے عرب دنیا کے قارئین محمد انیس الرحمٰن کی تحریریں پڑھ کر یہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی باریش بزرگ ہوں گے لیکن جب وہ انہیں ملتے تو یہ دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو جاتے کہ یہ تو

سکول اور کالج کا ایک نوجوان ہے، ممکن ہے وہ یہ یقین نہ کرتے کہ اخبار العرب میں شائع ہونے والی عربی تحریریں اس نوجوان کی ہیں لیکن جب وہ اس سے مختلف موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کرتے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ اس نوجوان کے اندر کوئی ساٹھ سالہ بزرگ سکالر چھپا ہوا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی، ان کے اندر اپنے والد کی تربیت اور مشن سے لگاؤ کم عمری میں ہی حلول کر گیا تھا۔ محمد انیس الرحمٰن کا یہ کمال عربوں پر اثر کر گیا، پھر وہ پاکستان کے شہر لاہور میں بیٹھے ہوئے اس نوجوان کو اس وقت عرب دنیا میں لے گئے جب اس کے ابھی گلی محلے میں کرکٹ کھیلنے کے دن تھے۔ محمد انیس الرحمٰن نے جیسے ہی عرب سرزمین پر قدم رکھا، اس کی تخلیقی صلاحیت کو مزید جلا ملی۔ انہیں عرب کے ان نامور اداروں اور نامور شخصیات اور اسلامی سکالروں سے ملنے کا موقع ملا، جہاں جانے کے لئے اور جن سے ملنے کے لئے دیگر دنیا کے کئی علماء اور سکالر صرف خواب ہی دیکھ سکتے تھے۔ محمد انیس الرحمٰن نے بھی ان مواقع کی قدر کی۔ ان کی اس لگن کو دیکھتے ہوئے، ان کی علمی پیاس بجھانے کے لئے ان کے لئے دنیا کے راستے کھول دیئے گئے، پھر نہ صرف وہ عرب دنیا کے قریہ قریہ میں گھومے بلکہ سنٹرل ایشیاء سے یورپ اور پھر افریقہ تک کا سفر کیا۔ محمد انیس الرحمٰن کے یہ سفر صرف سیاحت کی خاطر نہیں تھے بلکہ مشاہدے سے بھرپور ہیں، انہوں نے دنیا کی ان نامور لائبریریوں میں کئی کئی ماہ تک شب و روز عرق ریزی کی، جن کتب خانوں کے باہر لوگ صرف تصویر بنوانا بھی اعزاز سمجھتے ہیں۔ محمد انیس الرحمٰن کے دیارِ غیر کے سفر، علم اور مشاہدوں کی تفصیل بڑی طویل ہے، یہاں ان کا مختصر ذکر کرنا اس لئے مقصود تھا تاکہ اس نئی کتاب "مدینہ سے وائٹ ہاؤس تک" کے خالق کے بارے میں ایک مختصر خاکہ قارئین کے سامنے آ جائے۔

محمد انیس الرحمٰن کی یہ دوسری کتاب ہے۔ یہ موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے جس پر اس انداز میں پہلے کبھی کام نہیں ہوا۔ یہ صرف ایک کتاب نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کی خدمت ہے، مغرب کی سازشوں سے باخبر رکھنے کی ایک کاوش ہے اور ایک نظریاتی (Contribution) ہے جس پر فاضل مصنف کو جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ محمد انیس الرحمٰن ادارہ نوائے وقت کے نیوز میگزین ہفت روزہ ندائے ملت سے وابستہ ہیں۔ اخباری دنیا میں امریکہ اور مغرب کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ شائع ہوتا رہا ہے لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ مغربی میڈیا سے ہی لیا جاتا رہا ہے۔ محمد انیس الرحمٰن چونکہ عربی زبان و بیان پر عبور

رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اسلامک ورلڈ میں اپنے ذرائع پیدا کئے۔ میں یہ کہنے میں بخل سے کام نہیں لوں گا کہ "میڈیا وار" کے اس دور میں جب مغرب کی میڈیا پر اجارہ داری ہے، محمد انیس الرحمٰن واحد صحافی ہے جس نے نہ صرف عالم اسلام کے خلاف کام کرنے والی بدنام زمانہ انٹیلی جنس ایجنسیوں سی آئی اے، موساد، را، کے جی بی اور درجنوں دیگر ایجنسیوں کے کئی راز افشا کئے ہیں، ان کے گھناؤنے کرداروں سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ عالم اسلام کی ان نامور شخصیات سے بھی روشناس کرایا ہے جنہوں نے پس پردہ رہ کر مغرب کی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے۔ محمد انیس الرحمٰن کی یہ کتاب مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، اگرچہ اس میں عمر المختار سے لے کر ملا عمر تک، افغانستان سے لے کر چیچنیا اور فلسطین تک کی اسلامی تحریکوں، مشرق و مغرب کے درمیان زیر زمین جنگوں اور کئی خفیہ دستاویزات پر مشتمل مختلف موضوعات شامل ہیں لیکن انکا ربط ایسا ہے کہ یہ ایک مکمل موضوع کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے بلاشبہ محمد انیس الرحمٰن نے بڑی جرأت مندی سے مغرب کی سازشوں کا مقابلہ کیا ہے۔ میں اکثر اپنے دوستوں میں محمد انیس الرحمٰن کو پاکستان کا "الجزیرہ" کہتا ہوں جس نے سخت ترین حالات میں بھی مغربی میڈیا کی اجارہ داری ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

کتاب کے پبلشر آفتاب ہاشمی بلاشبہ تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے محمد انیس الرحمٰن جیسے نایاب لکھاری کو تلاش نکالا ہے اور یہ کتاب قارئین تک پہنچا کر محمد انیس الرحمٰن کے مشن کو آگے بڑھانے کے نیک کام میں ایک حصہ ڈالا ہے۔ یقیناً یہ کتاب ٹھہرے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا کرے گی اور پھر مستقبل قریب میں محمد انیس الرحمٰن کی گونج ہر طرف سنائی دے گی۔ اپنے دوست اور بھائی محمد انیس الرحمٰن کو اس کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے ہمیں مغرب کی غلامی سے نجات دلانے کی فکر عطا کر دی ہے۔ جس فکر کے بارے میں معروف شاعر احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

انوار حسین ہاشمی
نوائے وقت لاہور

القاعدہ بمقابلہ امریکہ

القاعدہ کا نام اسلامی تحریکوں میں نیا ضرور ہے مگر اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ دوسری اسلامی تحریکوں کی۔ القاعدہ کے لغوی معنی بنیاد اور بیس کیمپ کے ہیں ،اصطلاحی معنی ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں بہت سی جماعتیں یا تحریکیں اکٹھی ہو جائیں۔ القاعدہ کے بارے میں امریکی ایف بی آئی کا دعویٰ ہے کہ یہ **1990**ء کے بعد قائم کی گئی تھی اور اس کے بانی اسامہ بن لادن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس بات سے امریکی بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کا قیام **1980**ء کے اوائل میں عمل میں لایا گیا تھا اور اس کے موسس اول ڈاکٹر عبداللہ عزام شہید ہیں ،اسامہ کے دوست اور جہادی استاد، فلسطینی نژاد مجاہد عبداللہ عزام نے اس ادارے کا نام ''مکتب الخدمت'' رکھا تھا جو پشاور میں اولین رفاہی فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کا کام افغانستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی مدد کرنا ،مجاہدین کے رشتے داروں کی مہاجر کیمپوں میں آبادکاری کا انتظام کرنا ،سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد کے دوران اپاہج اور زخمی ہونے والے مجاہدین کی امداد کے لئے فنڈز اکٹھا کرنا اور عرب سے آئے ہوئے مجاہدین کو افغانستان کے اندر تک ان کی منزل تک پہنچانا تھا۔ مکتب الخدمت نے القاعدہ تک کا فاصلہ زمانی لحاظ سے بہت مختصر ہے مگر اس کا پس منظر بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہونے والی اسلامی تحریکوں کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ یہ اسی پر [illegible] استعمار [illegible] کے ناشر [illegible]

KURF کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

www.facebook.com/kurfku.blogspot.com

الدین افغانی'' تھے جس کی کتابت میں سیاہی کی جگہ ''اخوان المسلمون'' کا خون استعمال [illegible] البنا اور سید قطب شہید'' نے شہادت کا راستہ اختیار کیا ،سید مودودیؒ نے بے خوف ہو کر پھانسی کا پھندا تھام لیا ،شاہ فیصل شہید'' نے شہادت کا تاج سر پر سجایا، لاکھوں مجاہدین نے گمنامی کی موت قبول کر کے اللہ کے نزدیک نام پیدا کیا۔ یہ اسی تحریک کا زاویۃ الراس ہے جس کی تشریح کے لئے حضرت علامہ اقبالؒ، علامہ رشید رضا اور ایران کے مفکر اعظم علامہ ڈاکٹر علی شریعتی نے زندگیاں وقف کئے رکھیں۔

القاعدہ ایک ایسی تحریک یا فوج کا نام ہے جس کے سپاہی تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس کا دشمن تو ایک ہے مگر جنگ کے میدان تبدیل ہوتے رہتے ہیں اگر آج اسامہ یا ان کے قریبی رفقا کار کو شہید کر دیا جائے تو بھی شاید اس کے تنظیمی ڈھانچے میں کوئی فرق نہ پڑ سکے کیونکہ اس کے قائم کرنے والوں نے آئندہ تین نسلوں تک کی قیادت پہلے سے تیار کر رکھی ہے جو مختلف علاقوں میں اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوگی۔ **1991**ء کے بعد جب امریکہ واحد سپر طاقت کے زعم باطل میں مبتلا ہو کر اسلامی دنیا کے متعلق اپنے اصل مقاصد کے ساتھ سامنے آیا اور مجاہدین کے انہی کاندھوں کو توڑنے کے درپے ہو گیا جن پر چڑھ کر اس نے گورباچوف سے سوویت یونین کے خاتمے کے پروانے پر دستخط کرائے تھے تو جنگی اسٹریٹیجی یکسر تبدیل ہو گئی مجاہد رہنماؤں کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ سوویت یونین کی شکل میں وہ آگ کا ایک دریا تو پار کر آئے ہیں مگر اس کے پار آگ کا ایک نیا سمندر امریکہ اور یورپ کی شکل میں نمودار ہو گیا ہے جس کے ایجنڈے میں اسلامی ممالک کی اقتصادیات سے لے کر چھوٹی چھوٹی سیاسی جزئیات تک ہیں۔ اب وہ مسلمان حکومتوں کے ہاتھوں ہی اسلامی تحریکوں کا گلا کاٹنے پر اتر آیا تھا۔ یوں ان تحریکوں نے ایک پلیٹ فارم (القاعدہ) کا انتخاب کیا اور زیر زمین جہاد شروع ہوا۔ یقینی بات تھی کہ دشمن نے اسے نفرت انگیز نام سے موسوم کرنا تھا اپنی قوم کے سامنے اس جنگ کو لڑنے کے لئے آخر اسے بھی کوئی اخلاقی جواز درکار تھا سو پہلے ''اسلامی بنیاد پرستی'' پھر ''دہشت گردی'' کے ناموں کا [illegible]

القاعدہ کیا ہے؟ اس کا طرز جنگ کس نوعیت کا ہے؟ اس کے اصل کارناموں کی تفصیل

کیا ہے؟امریکہ اوراس کے حواریوں نے اس میں کس حد تک رنگ آمیزی کی ہے؟ دنیا کے کس کس حصے سے اور کن کن تحریکوں سے لوگ اس میں شامل ہوئے؟اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے ہمیں مختصراًاس کے تاریخی پس منظر کی جانب لوٹنا ہے جواس کے قیام کا اصل موجب ہے۔

بیسویں صدی کا آغاز اسلامی تحریکوں کو ایک نئے موڑ پر لا رہا تھا اسلامی دنیا کا بڑا حصہ استعماریت کے خلاف جنگ آزادی لڑنے کی بدولت آزاد ہو رہا تھا جس کے ساتھ ساتھ ان تحریکوں میں نئے اہداف بھی متعین ہو رہے تھے۔جہاں اسلامی ممالک آزاد ہو چکے تھے وہاں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی استعمار جاتے جاتے حکومتی نظام ایسے عناصر کے سپرد کر گیا تھا جو نام کے تو مسلمان تھے مگران کی سیاسی فکر مغربی فکر سے ہم آہنگ تھی۔

عالم عرب کا بڑا حصہ آزادی حاصل کرنے کے باوجود نام نہاد ترقی پسند استعماری ترکے جو مقامی حکومتوں کی شکل میں سامنے آیا تھا کے نرغے میں آچکا تھا،فلسطین پر یہودیوں کو مسلط کرنے کی وجہ سے تمام عالم عرب کی اسلامی تحریکوں میں بے چینی پھیل چکی تھی اس کا سب سے زیادہ اثر مصر کی اسلامی تحریک ''اخوان المسلمون'' نے لیا تھا کیوں کہ جغرافیائی طور پر مصر صحرائے سینا کے راستے فلسطین سے منسلک تھا۔اخوان المسلمون نے **1948**ء میں ہی مقبوضہ فلسطین میں جہاد کی خاطر مجاہدین داخل کر دیئے تھے جنہیں تمام عالم عرب کی اسلامی تحریکوں اور بعض عرب حکومتوں کی حمایت حاصل تھی مگر بین الاقوامی سازشوں اور داخلی خیانتوں کی وجہ سے اس کے جو نتائج سامنے آئے وہ تاریخ کا حصہ ہیں،صدر ناصر کی عرب ازم کی فکر نے اس تحریک کو مصر میں زبردست نقصان سے دوچار کیا،حالانکہ مصر میں شاہ فاروق کے خلاف انقلاب لانے میں ناصر نے اخوان المسلمون کے کاندھے استعمال کئے تھے مگر اب اس نے اس تحریک پر ظلم کے ناقابل یقین پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے۔ان پر سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی ممانعت تھی۔یہ سلسلہ صدر سادات اوراب کسی حد تک حسنی مبارک کے دور میں بھی جاری ہے۔مقامی حکومتوں کی اسی روش سے تنگ آکر اس کے بہت سے قائدین نے نام بدل کر جماعتیں منظم کیں اور مقاصد کے حصول کے لئے جہاد کا راستہ اختیار کیا ان ہی جماعتوں میں ''الجماعة الاسلامیة'' اور ''اسلامی جہاد'' نامی تحریکیں شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ہی فلسطین میں لڑنے والی اسلامی تحریکیں اپنے اوائل دور سے ہی ایک

پلیٹ فارم کی تلاش میں تھیں انہیں یہ سہولت ''تنظیم آزادی فلسطین'' پی ایل او کی شکل میں میسر آئی مگر **1978**ء کے بعد ان تنظیموں نے یورپ میں اپنا اچھا خاصا نیٹ ورک قائم کر لیا تھا،یہی وجہ ہے کہ **1993**ء میں ہونے والے اوسلو معاہدے کے بعد جب ان اسلامی تحریکوں نے پی ایل او سے باقاعدہ علیحدگی اختیار کی تو انہیں کسی قسم کی تنظیمی پریشانی سے واسطہ نہیں پڑا۔ایک اندازے کے مطابق پی ایل او کی سترہ تنظیموں میں نو اسلامی تحریکیں شامل تھیں۔اس کے علاوہ اخوان المسلمون کی کئی شاخیں شام،اردن،اور سوڈان میں بھی کام کر رہی تھیں۔الجزائر کا اسلامی فرنٹ فرانس سے میدان جہاد میں طویل پنجہ آزمائی کر چکا تھا مگر آزادی کے بعد اسلامی تحریکوں کا جغرافیائی انداز میں گلا دبایا جا رہا تھا ایسے ہی دور میں اللہ تعالی نے مجاہدین کے لئے ایک نئے جہادی میدان کا انتخاب کیا۔یہ افغانستان تھا۔

16اپریل **1978**ء کو نور محمد ترہ کئی نے سردار داؤد کے خلاف سرخ انقلاب کی منصوبہ بندی مکمل کی،یہ وہی دور تھا جب ایران میں علامہ خمینی کی قیادت میں انقلابی اسلامی تحریک تیزی کے ساتھ مضبوط ہو رہی تھی۔**26**اور **27**اپریل کی درمیان شب کو افغان فوج کے انقلابی دستوں نے کابل میں صدارتی محل کو گھیر کر اقتدار پر اپنا قبضہ جما لیا تھا افغانستان سرخ انقلاب کی لپیٹ میں آچکا تھا،نور محمد ترہ کئی افغانستان کے صدر بن چکے تھے لیکن اس انقلاب کے ٹھیک دس روز بعد ہی اسلامی تحریک نے سر اٹھایا اور انتہائی کم عرصے میں افغانستان کے طول وعرض میں پھیل گئی۔جہاد کا غلغلہ تمام عالم میں پھیل گیا جس پر افغانوں اور پاکستانیوں کے بعد لبیک کہنے والے عرب تھے۔یہ وہ دور تھا جب تمام عالم عرب مسئلہ فلسطین میں الجھا ہوا تھا۔اسامہ بن لادن جدہ میں اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ کاروباری مشاغل میں مصروف رہا اس کے ساتھ ساتھ اس کی دیگر فلاحی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔یورپ میں بن لادن کمپنی کے دفاتر فلسطینیوں کی فنڈنگ میں مصروف تھے الفتح اور دیگر فلسطینی اسلامی تحریکیں بن لادن کے علاوہ خلیجی ممالک کی متمول اسلامی تنظیموں اور شخصیات کی مدد سے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھیں مگر ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ جلد ہی ان کی جدوجہد کا رخ کہیں اور منتقل ہونے والا ہے۔اسی جدوجہد کے دور میں اسلامی یونیورسٹی میں ایک فلسطینی نژاد نوجوان طالب علم عبداللہ عزام بھی اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھا،عبداللہ عزام [illegible]

میں عرب مجاہدین کا امیر ہونے کا شرف حاصل ہوا، اسامہ کو افغانستان لانے میں کلیدی کردار ادا کیا، ہزاروں عرب مجاہدین کو جنگی تربیت دے کر انہیں سوویت یونین جیسی ہولناک جنگی طاقت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا کر دیا۔ مگر اس وقت تک عبداللہ عزام کی جدوجہد کا سب سے بڑا مرکز آزادی فلسطین تھا جس کے لئے اس نے اور اس کی طرح ہزاروں فلسطینی نوجوانوں نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں یہ تمام نوجوان اپنے اپنے محاذوں پر جدوجہد میں مشغول تھے۔ عبداللہ عزام اس وقت تک اسامہ سے اس کی کمپنی کے حوالے سے واقف تھا شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں اس کی تعلیم کا دورانیہ بھی تقریباً وہی ہے جب اسامہ یہاں زیر تعلیم تھا ذرائع کے مطابق **1980**ء کے آخر میں عرب مجاہدین کا سب سے پہلا قافلہ افغانستان جانے کے لئے پشاور میں وارد ہوا تھا یہ تقریباً **40** کے قریب افراد پر مشتمل قافلہ تھا جن میں خلیج کے ساتھ ساتھ شمالی افریقہ کے عرب ممالک کے نوجوان بھی شامل تھے۔ عبداللہ عزام نے پشاور پہنچ کر سب سے پہلے ان عرب مجاہدین کو منظم انداز میں جہاد کی ترغیب دی اور پشاور میں ان کے اولین مراکز قائم کئے جہاں مہاجرین کی آبادکاری ہوئی، مجاہدین کے لئے شفاخانے، جنگ میں معذور ہونے والے مجاہدین اور دیگر افغان عوام کی مدد کے لئے ادارے قائم کئے گئے۔ اسی دور میں اسلامی دنیا کے متمول حصوں سے مجاہدین کی اعانت اور مہاجرین کی بحالی کے لئے مالی امداد آنا شروع ہوگئی۔ فلسطینی اس سلسلے میں بن لادن خاندان کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بن لادن کا مسئلہ فلسطین سے کوئی تعلق نہیں اور وہ اس مسئلے کو ہائی جیک کرنا چاہتا ہے تو یہ ان کی لاعلمی ہے۔ بن لادن خاندان کی فلسطین کے لئے اعانت محمد بن عوض بن لادن کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس پس منظر کے حوالے سے عبداللہ عزام نے اسامہ سے رابطہ کیا اور اس سے افغانیوں کی امداد کے لئے درخواست کی۔ عبداللہ عزام کو علم تھا کہ بن لادن خاندان نہ صرف خود اس مسئلے میں امداد کرے گا بلکہ خلیج کی دیگر متمول شخصیات کو بھی اس کام پر آمادہ کر لے گا ذرائع کے مطابق اسامہ نے اس کام کے لئے **1981**ء کے اوائل میں افغانستان کا دورہ کیا اور عبداللہ عزام سے مجاہدین کی امداد کے معاملات پر تبادلہ خیال کیا عبداللہ عزام اس کام کو منظم انداز میں کرنے کے لئے ''مکتب الخدمت'' نامی ادارہ تشکیل دے رہے تھے جس کے پلیٹ فارم کو دیگر اسلامی و عرب رفاہی تنظیمیں استعمال کر کے مجاہدین کی مدد کر سکتی

تھیں اور فی الواقع ایسا ہوا بھی، یہ وسائل اس قدر وافر ہو گئے کہ ایک مرتبہ **1983**ء میں مکتب الخدمت نے امریکی امداد کو ٹھکرا دیا تھا اس بات کا اعتراف سی آئی اے کے ایک سابق آفیسر نے بھی کیا کہ مکتب الخدمت نے کبھی بھی امریکی امداد قبول نہیں کی بلکہ ان کا سارا انحصار عالم عرب سے آنے والی مالی امداد پر تھا۔ تھوڑے عرصے بعد ایسا وقت آیا جب عرب مجاہدین کا سب سے بڑا پلیٹ فارم یہی ادارہ بن گیا اس ادارے کے قائم کرنے والے ان مجاہدین کے کمانڈر بن گئے۔ عبداللہ عزام خود عملی طور پر جہاد میں شریک ہو چکے تھے۔ انہیں افغانستان میں لڑنے والے عرب مجاہدین کا امیر کہا جاتا تھا اسامہ ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہو چکے تھے ان مجاہدین کے بڑے مراکز جلال آباد، قندھار، خوست، پکتیا اور لوگر میں تھے۔ جب تک افغانستان سے روسی فوجیں واپس گئیں اس وقت تک یہ پلیٹ فارم عرب اور دیگر غیر افغان مجاہدین کی سرگرمیوں کا طاقتور مرکز بن چکا تھا ان میں سب سے زیادہ تعداد فلسطینیوں اور مصریوں کی تھی اس کے بعد شامی، اردنی، الجزائری، ترک، انڈونیشی، فلپائنی، خلیجی اور سعودی مجاہدین کی تھی۔ مجاہدین کی امداد کے لئے یورپ اور امریکہ کے متمول مسلمان ادارے اور شخصیات بھی امداد بھیج رہی تھیں اس سلسلے میں مکتب الخدمت نے بروکلین امریکہ میں بھی ایک دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے نگران اعلیٰ مصر کے شیخ عمر عبدالرحمٰن تھے یہ مرکز جو اسلامی مرکز کی طرز پر قائم کیا گیا تھا ریگن انتظامیہ کی منظوری سے فنڈز اکٹھا کرتا تھا۔ اسی طرح کے کئی ادارے یورپ میں بھی کام کر رہے تھے۔ مگر سوویت یونین کے افغانستان سے شکست کھانے کے بعد ان اداروں پر بھی کڑی نگاہ رکھی جانے لگی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس پلیٹ فارم پر دنیا کی متعدد اسلامی تحریکوں کے افراد افغانستان میں جہاد کے لئے آ گئے تھے ان میں مصر کی اخوان المسلمون، اسلامی جہاد، الجماعۃ الاسلامیہ، فلسطین کی حماس، الجہاد، الجزائر کا اسلامک فرنٹ وغیرہ شامل تھے۔ یہاں ان اسلامی تحریکوں کو کھل کر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بہت سی تحریکوں پر باقاعدہ سرگرمیاں جاری رکھنے پر پابندی لگی ہوئی تھی ایسی صورت میں ان جماعتوں کے بعض رہنماؤں نے مکتب الخدمت کو ہی اپنا پلیٹ فارم قرار دے دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض عرب مجاہدین کو افغانستان سے واپس جاتے ہی حراست میں لے لیا گیا اور ان پر انتہاء پسندی کے الزامات عائد کئے جانے لگے۔ یہ تحریکیں افغانستان کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں بھی اسلامی نظام نافذ کرانے کا مطالبہ

علم و دانش

کررہی تھیں۔امریکہ نے افغانستان میں اس وقت بھی وسیع البنیاد حکومت قائم کرنے کا فتنہ کھڑا کیا تھا جس پر سب سے زیادہ شہید صدر جنرل ضیاء الحق نے امریکی عزائم کی مزاحمت کی یہ بات کھلا راز ہے کہ اس وقت امریکہ کو سب سے زیادہ ضیاء الحق شہید ہی اپنے راستے کی رکاوٹ نظر آئے اور پھر انہیں ہٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔۔۔ضیاء الحق کی شہادت سے وقتی طور پر افغانستان میں کام کرنے والی اسلامی تحریکوں کی کمر ٹوٹ گئی مگر جلد ہی انہوں نے دوبارہ اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کردیا جس پر امریکہ کا رخ افغانستان کی عرب اسلامی تحریکوں کی جانب ہوا۔امریکہ اور اس کے حواریوں کو علم تھا کہ مکتب الخدمت اور اس پلیٹ فارم پر کام کرنے والی اسلامی تحریکیں کبھی افغانستان میں امریکہ نواز حکومت تشکیل نہیں ہونے دیں گی۔عبداللہ عزام اس صورتحال کو بھانپ چکے تھے انہوں نے افغانستان کی مجاہد قیادت میں خاصا رسوخ حاصل کرلیا تھا امریکہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ عبداللہ عزام کی موجودگی میں افغانستان کی دیگر افغان قیادت کو قابو کرنا آسان نہیں ہوگا اس لئے ایک سازش کے تحت 1989ء میں عبداللہ عزام کو اس وقت کار بم دھماکے میں شہید کردیا گیا جب وہ پشاور میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد کی طرف آرہے تھے،اس سازش میں ان کے دو کمسن بیٹے بھی شہید ہوگئے عرب مجاہدین کی ایک بڑی تعداد کو وقت کی بڑی جنگی قوت بنانے میں عبداللہ عزام کا کلیدی کردار تھا مگر ان کی شہادت کے بعد اسلامی تحریکوں کو ضیاء الحق شہید کے بعد دوسرا بڑا دھچکہ لگا۔

بعض ذرائع کے مطابق عبداللہ عزام کی شہادت کی کڑیاں برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود سے جاملتی ہیں۔۔۔جن پر امریکہ نے شروع سے خصوصی عنایات کررکھی تھیں۔مگر امریکی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے افغانستان کو سیاسی طور پر منتشر کرنے کی اہم ضرورت تھی اور اس کا واحد راستہ خانہ جنگی تھا۔اسامہ نے اس پر آشوب دور میں جو اہم کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے کسی بھی فریق کا ساتھ نہ دیا بلکہ وہ خاموشی کے ساتھ مسئلے کے حل کے لئے کام کرتے رہے مگر ان کی اس معاملے میں ایک نہ چلی آخر کار انہوں نے افغانستان کو خیر باد کہا اور واپس سعودی عرب آگئے اپنی کاروباری سرگرمیاں جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کا دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں سے رابطہ بھی برقرار تھا۔وہ افغان جنگ میں سوویت یونین کی شکست کے بعد اسلامی دنیا میں بدلی ہوئی صورتحال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے امریکی ان سے اور وہ

امریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے اسلامی تحریکوں کے لیڈران سے رابطوں میں تھے یہ صورتحال ابھی جاری تھی کہ امریکہ نے افغان جنگ کے بعد اپنے کھیل کا دوسرا حصہ شروع کیا یہ خلیج میں عراق کے ذریعے کویت پر قبضہ کرنا تھا۔سی آئی اے کو اندازہ تھا کہ افغان جہاد کے دوران خلیج سے بے بہا مالی امداد مجاہدین کو دی گئی ہے اور اس کا سلسلہ ابھی تک کسی نہ کسی صورت جاری ہے۔افغان جنگ نے سوویت یونین کی شکست سے مجاہدین کے حوصلے بڑھادیے تھے وہ کسی طور بھی امریکی حاکمیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے امریکہ نے عراق کے کویت پر قبضے سے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے ایک طرف اس نے خلیج میں کام کرنے والی رفاہی تنظیموں کی مجاہد تنظیموں کے لئے قائم کردہ پائپ لائن کو منقطع کرنا تھا تو دوسری جانب تیل سے مالا مال اس علاقے کو عملاً اپنی گرفت میں لینا تھا۔عراق کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کویت پر حملہ آور کرادیا گیا، جان بوجھ کر مغربی میڈیا میں صدام حسین کی تصویر کچھ سے کچھ بنادی گئی اسے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ یوں اسلامی تنظیموں نے اسامہ کو ایک پلیٹ فارم بنانے کا مشورہ دیا اسی دور میں مصر کی تنظیم ''اسلامی جہاد'' کے رہنما ایمن الظواہری کا نام پہلی مرتبہ مغربی میڈیا میں سامنے آیا۔

اسلامی تحریکوں کا خیال تھا کہ مقامی حکومتوں کی اجازت سے اگر عراق کو کویت سے نکالا جائے تو وہ یہ کام آسانی سے سرانجام دے سکتی ہیں مگر اس سے پہلے کہ کوئی لائحہ عمل اختیار کیا جاتا امریکہ نے جلد بازی میں اپنی فوجیں خلیج میں اتار دیں اب کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا ایک عالمی غنڈہ علی الاعلان غنڈہ گردی پر اتر آیا تھا امریکہ کویت کو عراق سے آزاد کرانے کے بعد خود استعمار کی شکل میں وہاں بیٹھ گیا صدام حسین کو بغداد میں باقی رکھنا علاقے میں اس کی موجودگی کا جواز تھا۔۔۔ایک طرف اسرائیل مسلسل فلسطینیوں پر ظلم ڈھا رہا تھا تو دوسری جانب عالمی استعمار امریکہ علاقے میں قدم جما چکا تھا، یہی وہ لمحہ تھا جب اسلامی تحریکوں کے بعض رہنماؤں نے سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں سے بالاتر ہوکر امریکی دہشت گردی کے آگے بند باندھنے کا ارادہ کیا۔یوں مکتب الخدمت سے شروع ہونے والا سلسلہ ''القاعدہ'' کی شکل اختیار کرگیا جس کے روح رواں اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری تھے۔اس سلسلے میں اسامہ نے کئی ممالک کے دورے کئے ذرائع کے مطابق 1992ء میں

(فلپائن) کا دورہ کیا یہاں ان کا استقبال ایک سعودی سرمایہ کار کے طور پر کیا گیا تھا مگر یہاں انہیں کاروبار سے زیادہ آزادی کی طویل ترین جنگ لڑنے والے مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔سی آئی اے کا دعوی ہے کہ اس دوران ان کا رابطہ فلپائنی حریت پسندوں سے بھی ہوا اور انہوں نے القاعدہ کے امور پر ان سے بات چیت کی۔فلپائنی مسلمان جنہیں مورو مسلمان کہا جاتا ہے جدید دور کی طویل ترین جنگ لڑ رہے ہیں جب تک فلپائن میں باقاعدہ امریکی فوجی اڈے موجود تھے اس وقت تک امریکی فوج ان حریت پسندوں کے خلاف فلپائنی فوج کے ہمراہ مصروف عمل رہی مگر انہیں مکمل طور پر دبایا نہیں جاسکا تھا امریکی فوج کے جاتے ہی ان مجاہدین کے حوصلے مزید بلند ہو گئے اور انہوں نے کھل کر فلپائنی حکومت کی زیادتیوں کے خلاف کارروائیاں شروع کردیں جس پر ان کو "بیرونی" امداد لینے کا مجرم قرار دیا گیا۔امریکی میڈیا اور سی آئی اے کھل کر اسامہ کے خلاف ہو چکے تھے انہیں علم تھا کہ اسامہ اور ان کے رفقاء کار اب مصلحتوں سے آزاد ہو کر امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر چکے ہیں۔

ذرائع کے مطابق اسامہ نے اپنی شہریت کی منسوخی کی خبر ویمبلے (لندن) میں سنی جس کے فوراً بعد انہوں نے سوڈان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔یہاں ان کا استقبال ڈاکٹر حسن الترابی اور سوڈانی حکومت کے بڑے عہدیداروں نے کیا حسن الترابی کے ساتھ اسامہ کے روابط افغان جہاد کے دوران ہی استوار ہو چکے تھے کیونکہ عرب مجاہدین کے ساتھ سوڈان کی اسلامی تحریک سے تعلق رکھنے والے بے شمار مجاہد افغانستان آئے اور مکتب الخدمت کے پلیٹ فارم سے انہوں نے افغانستان کے اندر سوویت یونین کے خلاف طویل جنگ لڑی تھی اور اب سوڈان میں اسلامی فکر کی حامل حکومت قائم ہو چکی تھی، اسی دوران امریکہ نے سازش کے ذریعے سوڈان اور ایتھوپیا کے جنوب مشرق میں واقع اسلامی ملک صومالیہ کو غیر مستحکم کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔

صومالیہ میں امریکہ اور القاعدہ آمنے سامنے

جب سے سوڈان میں اسلامی فکر کی حامل حکومت آئی امریکہ اور برطانیہ نے اسے غیر مستحکم کرنے کے لئے سازشوں کا جال بچھانا شروع کردیا تھا اس کے لئے سب سے پہلے جنوبی سوڈان کے عیسائی قبائل کو برطانیہ نے خفیہ طور پر اسلحہ سپلائی کرنا شروع کیا اور اس طرح سوڈان

اور باغی عیسائی قبائل کے درمیان خونریز جنگ کا آغاز ہوا۔ ذرائع کے مطابق سی آئی اے اور برطانوی ایم آئی 6 نے جنوبی سوڈان میں باقاعدہ ٹریننگ کیمپ قائم کئے تھے تاکہ اسلامی ملک سوڈان کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیاں کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے مگر ایسا اس لئے ممکن نہ ہوسکا کیونکہ جنوبی سوڈان کے قریب پھر اسلامی ملک صومالیہ کی سرحدیں تھیں۔ سوڈان واپس آنے والے مجاہدین نے صومالیہ کی مدد سے جنوبی سوڈان کے عیسائی قبائل کی کئی کوششیں ناکام بنادیں۔اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے سوڈان کی بجائے سب سے پہلے صومالیہ کا حساب چکانے کا فیصلہ کیا کیونکہ برطانیہ کی جانب سے مہیا کردہ رپورٹوں میں اس بات کا صاف اظہار کیا گیا تھا کہ صومالیہ کی طاقتور حمایت کی وجہ سے خرطوم میں اسلامی تحریک کو حکومت سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔اس رپورٹ کے ساتھ ہی امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے صومالیہ پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ سوڈان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لے۔اس کے ساتھ ساتھ صومالیہ کی اپوزیشن نے حکومت کے خلاف اچانک تحریک شروع کردی جو اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ سوڈان کو تباہ کرنے پر تل گئے تھے۔تب اسامہ اور ان کے ساتھی ایمن الظواہری نے القاعدہ کے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے جنرل فرح عدید سے رابطہ کیا اور انہیں ہر طرح کی امداد کا یقین دلایا۔اپوزیشن کی شورش سے صومالیہ میں انتشار کی حالت پیدا ہوئی اور امریکہ کو امن کے نام پر مداخلت کا موقع مل گیا مگر یہ اس کا انتہائی عاقبت نااندیشانہ فیصلہ تھا جنرل فرح عدید کی فوجوں نے القاعدہ کے مجاہدین کے ساتھ مل کر ایسی گوریلا جنگ کا آغاز کیا جس نے امریکیوں کو چکرا کر رکھ دیا اس جنگ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ جنرل عدید کا کوئی بڑا کمانڈر امریکیوں کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ذرائع کے مطابق اس جنگ میں جنرل عدید اور القاعدہ کے ارکان نے قطعاً الیکٹرانک مواصلاتی آلات استعمال نہیں کئے تاکہ انہیں اسکین نہ کیا جاسکے رابطے کے لئے افریقہ کا قدیم سلسلہ مواصلات استعمال کیا گیا یہ جانوروں کی بولیاں اور ناریل کے خالی خول سے نکالی جانے والی آوازیں تھیں۔ان "ذرائع مواصلات" نے امریکیوں کی تمام جدید ٹیکنالوجی کو عاجز اور ناکارہ بنا کر رکھ دیا تھا۔امریکیوں کو آخری وقت تک معلوم نہیں ہوسکا کہ ان پر حملہ کہاں سے کیا جاتا ہے اس جنگ میں تین سو کے قریب امریکی فوجی جہنم واصل ہوئے بہت سے فوجیوں کی لاشیں مقدیشو کی سڑکوں پر گھسیٹی گئیں

مناظر زیادہ دیر تک اپنے عوام کو نہیں دکھا سکا۔ جیسے ہی لاشیں امریکہ پہنچنا شروع ہوئیں امریکہ پر فوج واپس بلانے کے لئے داخلی دباؤ بڑھ گیا اور ذلت کے ساتھ اسے صومالیہ چھوڑنا پڑا اس کے پیچھے بہت سے امریکی گن شپ ہیلی کاپٹروں کا ملبہ رہ گیا تھا۔۔۔ امریکہ کے خلاف یہ القاعدہ کی بہترین جنگی حکمت عملی تھی جو جنرل فرح عدید کے فوجیوں کی مدد سے پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی تھی۔ امریکیوں کو القاعدہ کے بازوؤں کا اندازہ ہو چکا تھا۔

اسامہ کے یار غار

امریکی صحافی یوسف بودانسکی کے مطابق ''اسامہ کے ٹھکانے کا اندازہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے ریت میں سوئی تلاش کرنا، وہ طالبان کی سخت حفاظت میں ہے جو قبائلی روایت کے مطابق اپنی جان سے زیادہ اپنے مہمان کی حفاظت کرتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اسامہ اور اس کے ساتھی جلال آباد کے قریب غاروں میں مقیم ہوں جو ہر طرح کے جدید آلات سے لیس ہیں''۔ واشنگٹن پوسٹ کا دعوی ہے کہ اسامہ کا غار کسی گھر سے کم نہیں یہ پہاڑ میں تین کمروں پر مشتمل ہے ایک کمرہ الیکٹرانک آلات سے لیس ہے جس میں کمپیوٹر، فیکس، سیٹلائٹ فون سے متعلق اشیا ہیں، دوسرے کمرے میں محافظ دستہ اور ان کا جدید اسلحے کا ذخیرہ ہے جبکہ تیسرا کمرہ کتابوں اور اوراق سے بھرا ہوا ہے جہاں اسامہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اسامہ کے غار کے قریب ہی ان کے تین رفقاء کار کی غاریں بھی تھیں جن میں ایمن الظواہری، مصطفیٰ حمزہ اور احمد اسلامبولی شامل ہیں''۔ واشنگٹن پوسٹ کی یہ رپورٹ صرف جلال آباد تک محدود ہے جبکہ ذرائع کے مطابق ایسے سینکڑوں غار افغانستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں القاعدہ کے دیگر مجاہدین رہنما مختلف وقتوں میں رہائش اختیار کرتے ہیں ایمر جنسی کی حالت میں اسامہ کبھی ایک جگہ مستقل قیام نہیں کرتے۔

ایمن الظواہری

اسامہ کے معتمد خاص ایمن الظواہری کا تعلق پہلے مصر کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے ساتھ تھا مگر امریکی اور اسرائیلی دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے ''الجہاد الاسلامی'' نامی مجاہد تنظیم کی بنیاد ڈالی تھی شروع میں اس جماعت نے مصر میں اپنا وجود منوایا

مگر اس کی بنیادی وجہ جہاد افغانستان تھی اور اسی جہاد سے حوصلہ پا کر مصر جیسے امریکہ نواز ملک میں اسے قائم کیا گیا تھا۔ جس پر ایمن الظواہری کی گرفتاری کے لئے مصر کے طول و عرض میں چھاپے مارے جانے لگے مگر ایمن الظواہری جو پیشے کے لحاظ سے مصر کے اعلی ترین فزیشن ڈاکٹر شمار ہوتے تھے فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ آ گئے یہاں آ کر انہوں نے مجاہدین کی امداد کے لئے یورپ اور امریکہ کا سیکٹر سنبھال لیا تھا۔ صومالیہ میں امریکی فوجی موجودگی کے دوران ایمن الظواہری، اسامہ بن لادن اور جنرل محمد فرح عدید کے درمیان رابطے کا بڑا ذریعہ تھے انہی رابطوں نے امریکی فوج کو جانی نقصانات سے دوچار کیا اور اسے بدحواسی میں صومالیہ چھوڑنا پڑا تھا۔ ایمن الظواہری کے قریبی تعلقات سوڈان کی اسلامی شخصیت ڈاکٹر حسن الترابی سے بھی رہے۔ 1995ء میں ایمن الظواہری نے مصر میں اسلامی انقلاب کے لئے ایک کوشش بھی کی مگر داخلی اختلافات کی وجہ سے یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی ذرائع کے مطابق ایمن الظواہری اور مصر کی اسلامی عسکری شخصیت محمد مکاوی میں حکمت عملی کے معاملے میں اختلافات پیدا ہو گئے، محمد مکاوی اسے صرف مصری تنظیموں تک محدود رکھنا چاہتے تھے جبکہ ایمن الظواہری کے نزدیک غیر مصری اسلامی تحریکوں کا تعاون اس کے لئے ضروری تھا۔ سی آئی اے کا دعوی ہے کہ ایمن الظواہری نے جون 1995ء میں ''افریقن کانفرنس'' کے دوران ادیس ابابا میں حسنی مبارک کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں مصری سفارتکار اور قائم مقام سفیر علاء الدین نظمی کو قتل کرایا۔ سی آئی اے کے مطابق ایمن الظواہری کو ایران سے بھی مدد ملتی تھی جس نے انور سادات کے قاتل خالد اسلامبولی کے نام سے تہران کی ایک شارع منسوب کر رکھی ہے۔

ایمن الظواہری نے بلقان میں ہونے والی جنگ میں بھی اہم کردار ادا کیا بوسنیا میں جس وقت سربوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا تو دیگر عرب مجاہدین کے ساتھ ساتھ القاعدہ سے تعلق رکھنے والے عرب مجاہدین بھی بوسنیا میں داخل ہوئے، بوسنیا میں داخل کرنے کے لئے یورپ میں القاعدہ کے نیٹ ورک سے مدد حاصل کی گئی جو زیادہ تر مشرقی یورپ میں رہائش پذیر فلسطینی مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ عمر عبدالرحمٰن کی عمر قید کے بعد جو امریکہ کے مسلمانوں کے نزدیک روحانی رہنما بن چکے تھے ایمن الظواہری یورپ میں

نشین مقرر ہو گئے۔

مصطفیٰ حمزہ:

مصطفیٰ حمزہ کا شمار بھی اسامہ بن لادن کے مشیروں میں ہوتا ہے ان کا تعلق مصر کی "الجماعۃ الاسلامیہ" سے ہے ان کا سب سے پہلا مرکز خرطوم میں تھا جہاں یہ مسلمان مجاہدین کی جہادی تربیت کرتے تھے، سی آئی اے اور ایف بی آئی کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے وہ نوجوان بھی تیار کئے جو مصری صدر حسنی مبارک کے قتل کی کوشش میں ملوث تھے اور ان کے پاس سوڈان کا پاسپورٹ ہے جو کسی اور نام سے حاصل کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے افغان جہاد کے دوران الجزائری مسلمانوں کی اچھی بھلی تعداد جہاد کے لئے افغانستان روانہ کی۔ فرانسیسی حکام کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے 1995ء میں پیرس کی میٹرو ٹرین میں بم رکھوایا۔ مصری صدر پر قاتلانہ حملے میں ناکامی کے بعد انہیں سوڈان سے افغانستان منتقل ہونا پڑا، ایف بی آئی کے مطابق سوڈان کے رہنما ڈاکٹر حسن الترابی نے انہیں کہا کہ سوڈان پر بین الاقوامی دباؤ زیادہ ہے اس لئے وہ افغانستان منتقل ہو جائیں جہاں جہادی سرگرمیاں جاری رکھنے کی زیادہ گنجائش ہے۔

احمد اسلامبولی:

احمد اسلامبولی خالد اسلامبولی کے بھائی ہیں جنہوں نے فوجی پریڈ کے دوران 1981ء میں صدر سادات کو قتل کر دیا تھا ان کا شمار اولین عرب مجاہدین میں ہوتا ہے جنہوں نے افغان جہاد کے لئے افغانستان آنے کا قصد کیا تھا۔ اسلامبولی کا پہلا مرکز افغان جہاد کے دوران پشاور میں قائم کیا گیا۔ یہ مرکز افغان جہاد کے لئے آنے والے عرب مجاہدین کو تربیت دیتا تھا ذرائع کے مطابق اس وقت بھی ان کا یہ مرکز بعض اسلامی ممالک کے ساتھ ساتھ یورپی ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا جہاں سوئٹزرلینڈ میں ایمن الظواہری نے ان کے شعبے کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔ بعد میں صومالیہ میں امریکی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلامبولی نے عرب مجاہدین کو خصوصی تربیت دی۔ صومالیہ کی حزب الاسلامی کے ساتھ اسلامبولی نے باقاعدہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ افغانستان میں ان کے کیمپوں کو صومالیہ منتقل کیا جائے اس کے جواب میں وہ صومالیہ کے

مجاہدین کو تربیت دیں گے۔

القاعدہ اور یمن:

یمن ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں زبان کے سواء باقی تمام عوامل افغانستان سے خاصے مماثلت رکھتے ہیں جن لوگوں کو یمن دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے انہیں اچھی طرح علم ہے کہ جغرافیائی اور تمدنی لحاظ سے اسے افغانستان کا جڑواں ملک کہا جاسکتا ہے۔ ذرائع کے مطابق القاعدہ سے تعلق رکھنے والے مجاہدین نے 1994ء میں یمن میں تربیت کے لئے اپنے کچھ کیمپ قائم کئے تھے۔ عدن اور زنجبار کے درمیانی علاقے میں جو عدن سے 170 کلومیٹر فاصلے پر ہے "بال المراقشہ" میں کیمپوں کے آثار ملے ہیں یہ علاقہ انتہائی بنجر اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا ہے یہاں کوئی درخت بھی نہیں اگتا لوگوں کی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ وہ یہاں پانی کے لئے کنواں بھی نہیں کھود سکتے۔ یہ وادی آتش فشاں پہاڑوں کے لاوا اگلنے سے سیاہ ہو چکی ہے اور اس وادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ علاقے میں امریکہ کو سب سے زیادہ خوفزدہ اس وادی نے کیا کیونکہ یہاں القاعدہ کے ٹریننگ کیمپ رہے ہیں۔ انقلاب سے پہلے اس علاقے میں جس سلطان کی حکمرانی تھی اس کا بیٹا محمد سالم بھی اسامہ کا دوست کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں کیمونزم کے خلاف الشیخ طارق الفضلی نے جہاد کے لئے یہاں کیمپ قائم کئے تھے۔

بعض ذرائع کے مطابق جن کی معلومات کا انحصار ایف بی آئی پر ہے یمن کی "جماعۃ الجہاد" نے 1998ء میں اپنا نام تبدیل کر کے "جیش عدن" رکھ لیا تھا جو اسامہ کی خواہش پر کیا گیا تھا تاکہ افغانستان کے بعد یمن کے پہاڑوں کو جدوجہد کا حصہ بنایا جائے۔ یہ جماعت علاقے میں امریکی مفادات کے خلاف جنگ کے لئے تیار کی گئی تاکہ یہاں سے دباؤ ڈال کر علاقے میں موجود امریکی فوج کو نکلنے پر مجبور کیا جائے۔ 1998ء میں اس جماعت کے بعض رہنماؤں جن میں زین العابدین بن علی ابوبکر المحضار شامل تھے نے اعلان کیا تھا کہ ان کی جماعت میں پچاس ہزار سے زیادہ لڑاکا مجاہدین ہیں جن کے پاس ایسا اسلحہ ہے جو یمنی فوج کے استعمال میں ہوتا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یمن کے صدر علی عبداللہ صالح "جیش عدن" کے خلاف نہیں ہیں مگر ان کی حکومت میں شامل بعض امریکہ نواز افراد اس کی جاسوسی کر کے امریکہ کو خبریں ارسال کرتے ہیں۔

یمن میں جزیرہ سقوطرہ، عدن شہر اور حدیدہ شہر میں امریکی فوجی اڈے قائم ہیں۔ جہاں سے امریکہ یمنی عوام پر استعمار کی شکل میں مسلط ہے۔ جدید دور کی اس لعنت کو نکالنے کے لئے یمنی عوام میں تیزی کے ساتھ ردعمل پیدا ہوا اور لوگ جوق در جوق امریکہ مخالف عسکری تنظیموں میں شامل ہوگئے۔ القاعدہ کا اس میں بہت تھوڑا حصہ ہے جبکہ زیادہ تعداد مقامی اسلامی جماعتوں میں شامل ہے مگر امریکہ اسے پورے کا پورا القاعدہ کے ذمہ ڈالتا ہے۔

احمد شاہ مسعود کا قتل اور ربانی

اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد شاہ مسعود القاعدہ اور طالبان کی ہٹ لسٹ پر تھا مگر اس کے قتل میں ان دونوں میں سے کوئی بھی ملوث نہیں پایا گیا۔ احمد شاہ مسعود کے قتل کے فوراً بعد برہان الدین ربانی اور شمالی اتحاد کی جانب سے بیانات داغے گئے کہ اس کے پیچھے آئی ایس آئی اور القاعدہ کا ہاتھ ہے مگر ذرائع کے مطابق اس قتل میں خود شمالی اتحاد کے عناصر جن میں سرفہرست برہان الدین ربانی ہیں ملوث تھے۔ عالمی رائے عامہ کو سنانے کے لئے ایک کہانی گھڑی گئی کہ دو عرب صحافیوں نے اپنے کیمرے میں بم نصب کر رکھا تھا مگر ایسا نہیں ہے۔ یورپی شہریت کے حامل دونوں عرب صحافیوں کو ویزے یورپ میں قائم ربانی کے سفارتخانے نے جاری کئے اور تین ہفتے تک یہ صحافی ربانی کے مہمان رہے بعد میں انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے تخار پہنچایا گیا جس کا مطلب ہے کہ وہ دھماکہ خیز مواد یورپ سے ساتھ نہیں لائے تھے اس لئے یہ بات ثابت ہے کہ کیمرے میں دھماکہ خیز مواد نہیں تھا۔ جس وقت پہلے صحافی نے احمد شاہ مسعود سے ہاتھ ملایا اسی وقت اس پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں صحافی بھی مارا گیا مگر شمالی اتحاد والوں نے دوسرا صحافی جو بچ گیا تھا پکڑ کر قتل کر دیا تاکہ عسکری لحاظ سے بغاوت نہ ہو سکے۔ ذرائع کے مطابق ربانی کو یہ ٹاسک امریکہ کی جانب سے دیا گیا تھا کیونکہ احمد شاہ مسعود کی موجودگی میں ظاہر شاہ کو افغانستان نہیں لایا جاسکتا تھا۔

القاعدہ اور انٹرنیٹ:

القاعدہ کے انٹرنیٹ کے ذریعے طریقہ مواصلات کے بارے میں بھی امریکی اور یورپی ذرائع میں اختلافات ہیں۔ ایف بی آئی کے مطابق القاعدہ کی میل یا ٹیلی فون کال پندرہ سے پچیس واسطوں کے بعد منزل تک پہنچائی جاتی ہے جس میں زبان تو عام استعمال ہوتی ہے مگر اس

کے معنی پہلے سے ہی مرتب کر لئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امریکی NSA آج تک ان پیغامات کا پتا نہیں چلا سکی ہے۔ یورپین ذرائع کا اصرار ہے کہ القاعدہ بڑے آپریشن کے لئے کبھی الیکٹرانک آلات استعمال نہیں کرتی بلکہ ان کا آدمی خود سفر کر کے بالمشافہ پیغام پہنچاتا ہے۔

القاعدہ کا مالیاتی نظام:

القاعدہ کا مالیاتی نظام امریکہ کے لئے سب سے زیادہ دردسری کا باعث بنا خود امریکی اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اس نیٹ ورک کو الیکٹرانک اور کمپیوٹرائزڈ بنکاری نے خاصا تحفظ مہیا کیا ہے۔ اس کی سرمایہ کاری دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں میں مختلف ناموں سے ہے اگر آج اسامہ کے القاعدہ کے اثاثوں کا پتا چلا کر صرف یورپ میں انہیں منجمد کیا جائے تو تقریباً یورپ کی 25 فیصد مالیاتی کمپنیاں دیوالیہ ہو جائیں گی۔

اس وقت یہ کہا جا رہا ہے کہ القاعدہ دہشت گردی کر رہی ہے مگر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جنگی کلچر بدل چکا ہے۔ کیا امریکہ جنگ کے پرانے قواعد کے مطابق جنگ کرتا ہے؟ ایک ایسا دشمن جس کی جنگی قوت بے پناہ ہو، مقامی حکومتیں اس کے خلاف زبان کھولنے سے قاصر ہوں اس کی خاطر افکار کے نام بدل دئے جائیں اس کی دہشت گردی کو انصاف اور اس کے خلاف ردعمل کو دہشت گردی کہا جانے لگے تو یقیناً جنگی اصول خود بخود بدل جاتے ہیں، القاعدہ نے انہی بدلتے ہوئے حالات میں جنگی حکمت عملی کو تبدیل کیا امریکہ جیسے تنومند دہشت گرد کو بھگا کر تھکا کر ہی زیر کیا جاسکتا ہے۔

القاعدہ کے سپاہی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی ''متحرک'' ہے۔ ذرائع کے مطابق 1999ء میں ہی افغانستان کے علاوہ اس کے متبادل ہیڈ کوارٹر منتخب کر لئے گئے تھے۔ افغانستان پر امریکی جارحیت کے ساتھ ساتھ طالبان کی حمایت جس انداز میں دیگر ممالک میں بڑھی تھی اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اب امریکہ کو میدان جنگ سے بھاگنے کا موقع بھی شاید نہ مل سکے۔ یہ دو جوہری فرق افریقہ اور وسطی ایشیا میں ہیں افریقہ میں حملہ آور کو مارنے کے ساتھ ساتھ بھاگنے کا بھی موقع دیا جاتا ہے مگر وسطی ایشیا میں حملہ آور کو فاتح بن کر اندر آنے دیا جاتا ہے اس کے بعد وہ اپنے سالم وجود کے ساتھ یہاں سے نکل نہیں سکتا۔۔۔

القاعدہ اور افغانستان کی غاریں

1857ء کی جنگ آزادی غداروں کی وجہ سے ناکام ہو چکی تھی ،اس جنگ آزادی میں جسے انگریز نے غدر کا نام دیا تھا مسلمان علماء نے منبر رسول ﷺ کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے استعمار کے خلاف اعلان جہاد کیا تھا، 1865ء میں اس جنگ آزادی کے اسباب کی تحقیق کے لئے جس انگریز کمیشن کو مقرر کیا گیا اس کی رپورٹ کے مطابق ''اس جنگ میں انگریزوں کے خلاف جس فکر نے سب سے زیادہ کام کیا وہ مسلمانوں کا نظریہ جہاد تھا اگر یہ فکر ان میں سے سلب کر لی جائے تو باقی کا اسلام برطانوی استعماریت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' 1869ء تک برطانیہ میں خاموشی کے ساتھ جہاد کے موضوع پر کام کیا گیا اور اسی سال ایک وفد ملکہ وکٹوریہ کی خصوصی اجازت سے برصغیر روانہ کیا گیا تاکہ جہادی فکر کے سرچشمے کو بند کرنے کے طریقے تلاش کئے جاسکیں ،اس انگریز وفد نے ایک سال تک برصغیر کے طول وعرض کا طوفانی دورہ کیا اور واپس آکر 1870ء میں دو رپورٹیں ملکہ کو پیش کیں جن کے مطابق:

''مسلمانوں کے مطابق نظریہ جہاد قرآن کریم میں نازل ہوا ہے اور یہ ہماری تحقیق میں بھی ثابت ہو چکا ہے یعنی مسلمانوں کے نزدیک اس حکم کا اطلاق ''اوپر'' سے نازل ہوا ہے (وحی کے ذریعے) اس لئے ہمیں اس کی منسوخی کے لئے ایسی شخصیت کا انتظام کرنا پڑے گا جو اس کی منسوخی کا حکم بھی ''اوپر'' سے لائے۔۔۔اس سے کم پر مسلمان راضی نہیں ہو سکتے ،مسلمانوں کے

نزدیک نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے مگر ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس سلسلے کو عارضی انبیاؤں پر دوبارہ شروع کرنا پڑے گا۔گذشتہ نصف صدی کے دوران انگریزی دور میں مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط کی وجہ سے جہالت کا تناسب زیادہ ہو گیا ہے برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت اس وجہ سے اپنے دینی زعماء کی اندھی تقلید کرتی ہے اگر ان میں سے کوئی شخص ہمارے ساتھ مل جائے اور نبوت کے دعوے کے لئے تیار ہو جائے تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد بے علمی کی وجہ سے ہمارے ساتھ آجائے گی مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھا جارہا ہے ایسے شخص کو انگریز حکومت کی جانب سے مکمل تحفظ مہیا کرنا ہوگا اور تمام ہند میں ہمارا تسلط تقریباً مکمل ہو چکا ہے ہمیں ایسے شخص کی فورا تلاش شروع کر دینی چاہئے''۔(ماهي القاديانية، دار القلم ،الکویت ،ص۔9، 1969م۔موقف الامة الاسلامية من القاديانية ،ص۔114،نقلا من الاعجمی اسرائیل۔ص19)۔

اس کے بعد قرعہ فال مرزا غلام احمد قادیانی کے نام نکلا جس کا باپ غلام مرتضی جنگ آزادی کے دوران مسلمانوں کے خلاف گورا فوج کو گھوڑے اور رضا کار مہیا کرتا رہا۔اسی کے بیٹے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی منکر تعلیم کے ذریعے تدریجاً انگریز کے بنیادی مقصد کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔1880ء میں اس نے اسلام کے حق میں تقریریں شروع کیں، 1888ء میں وہ مجدد عصر کے ''منصب'' پر فائز ہو گیا، 1891ء میں اس نے مسیح اور مہدی کے مقام پر ''ترقی'' کر لی، 1900ء میں وہ نبی ناقص بن گیا، 1901ء میں وہ نبی کامل اور خاتم النبیین کا روپ دھار لیتا ہے، 1904ء میں وہ اعلان کرتا ہے کہ اس کا منصب معبود کے برابر ہے (نعوذ باللہ)۔(ڈاکٹر محمد الہی: الفکر الاسلامی الحدیث ،ص 47-46)۔اسی سال انگریز کا یہ کاشتہ اعلان کرتا ہے کہ وحی کے ذریعے جہاد کا جو حکم قرآن کریم میں آیا تھا وہ اس پر کی جانے والی وحی کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا ہے۔اب اسلام کے دو شعبے ہیں اللہ کی اطاعت اور حکومت وقت کی اطاعت جو زمین پر امن قائم کرے اور ہمیں ظالموں سے بچائے یہ حکومت ہے حکومت برطانیہ۔۔۔!(ماهي القاديانية ص۔69)۔

یہی وہ سبق ہے جو آج ہمیں امریکہ کی اطاعت کے لئے پڑھایا جارہا ہے، مغرب کے نزدیک 1857ء کا ''غدر'' اور آج کی ''دہشت گردی'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں

جانشین برطانوی وزیر اعظم یہی کہتا رہا کہ اس کی اور امریکہ کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ ''دہشت گردی'' کے خلاف ہے یعنی وہ ایسے اسلام کے خلاف نہیں ہیں جس میں جہاد نہیں ہے بلکہ وہ ایسے اسلام کے خلاف ہیں جس میں جہاد (دہشت گردی) ہے، اس وقت ایک مرزا غلام احمد قادیانی تھا اس وقت اس کے بہت سے پیروکار حکومت اور حکومت سے باہر یہ فرائض انجام دے رہے ہیں، کچھ ''علماء'' طالبان کی صرف اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ ''دیوبندی'' مسلک سے تعلق رکھتے ہیں یعنی امریکی اور برطانوی عیسائیت اور اسرائیلی یہودیت کا افغانستان میں غلبہ تو انہیں منظور ہے مگر طالبان کا دیوبندی مسلک نہیں! یہ ناعاقبت اندیش لکیر کے فقیر ''علماء نما'' اس حقیقت سے شاید واقف نہیں کہ افغانستان میں جو کفر کے خلاف سینہ سپر ہو چکے ہیں وہ صرف دیوبندی نہیں ہیں بلکہ ان میں نقشبندی، سہروردی اور چشتی سلسلوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھی ہیں ان میں اہلحدیث بھی ہیں، ''افغان العرب'' جو عالم عرب سے جہاد کے لئے افغانستان آئے ان میں اہلحدیث، اہل سنت والجماعت اور سلفی سب شامل ہیں جو مسلکوں اور عقیدوں سے بالاتر ہو کر صرف اسلام کے جھنڈے تلے عالم کفر سے برسرپیکار ہوئے۔

افغانستان میں ہونے والی جنگ کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہمیں امریکی محکمہ دفاع کے مقابلے پر مجاہدین کی اقامت گاہیں یعنی غار نظر آئیں گے، جنگی حکمت عملی کے لئے افغانستان میں غاروں کا استعمال نیا نہیں ہے، انہی غاروں نے برطانیہ کو افغانستان میں ذلیل و رسوا کیا تھا' یہی وہ غار تھے جس سے سوویت یونین سر ٹکرا کر پاش پاش ہوا اور اب پھر یہی غار ہیں جن کے اندھیروں میں امریکہ کامیابی کی کرن تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ امریکی دعوؤں کے مطابق القاعدہ کے خفیہ ٹھکانے انہی غاروں میں ہیں یہ دعوے کوئی بڑا انکشاف نہیں ہیں اگر ایسا ہے بھی تو یہ افغانستان کی طبعی صورتحال کے عین مطابق ہے مگر ایک پہاڑی ملک میں جہاں لاکھوں غار موجود ہیں انہیں امریکہ کہاں کہاں تلاش کرے گا، کیا آسمان پر جہازوں کے ذریعے؟ یا زمینی کمانڈوز کے ذریعے جن کی بڑی تعداد طالبان کے ہاتھوں ہلاک ہوئی اور بڑی تعداد میں قیدی بھی بنی ان غاروں کے پراسرار مکین پتھریلی زمین پر بیٹھ کر امریکی، اسرائیلی اور یورپی ممالک کے محکمۂ دفاع کے مقابلے پر پالیسیاں مرتب کرتے ہیں، انہی کے جذبہ شہادت اور جہاد کو دیکھتے ہوئے استعمار پھر سے جہاد کی تعریف بدلنے پر تلا ہوا ہے، ان پراسرار مکینوں میں

اسامہ کے علاوہ القاعدہ کے ایسے سرکردہ لیڈر بھی ہیں جن کے بارے میں خود اسلامی ممالک میں زیادہ معلومات نہیں ہیں ان میں سے چند کا تعارف کے قارئین کی دلچسپی اور استفادے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

ایمن الظواہری

ان کا پورا نام ایمن محمد ربیع الظواہری ہے۔ مصر میں 1951ء میں قاہرہ شہر کے ایک دولت مند اور مشہور خاندان میں پیدا ہوئے، دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں میں انہیں ایمن الظواہری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے القاعدہ میں انہیں اسامہ کے بعد نمبر دو کے طور پر رہنما تصور کیا گیا، ایمن الظواہری کے دادا الشیخ الظواہری جامعہ الازہر کے شیخ بھی رہے ہیں، 1952ء سے قبل انہوں نے مصر میں انقلاب کے خلاف موقف اختیار کرنے میں خاصی شہرت حاصل کی تھی الظواہری خاندان طب کے شعبے میں بھی خاصی شہرت رکھتا ہے، ایمن الظواہری کے ایک چچا ڈاکٹر محمد الظواہری جلد کے امراض میں ماہر تصور کئے جاتے ہیں اس شعبے میں مہارت کی وجہ سے انہیں مصری صدر حسنی مبارک کی طرف سے صدارتی ایوارڈ ''وسام الجمہوریۃ'' بھی مل چکا ہے۔

ایمن الظواہری کے نانا عبدالرحمٰن عزام عرب لیگ کے سب سے پہلے سیکریٹری جنرل تھے، ایمن الظواہری کے ماموں محفوظ عزام کا شمار مصر کے مشہور وکلاء میں ہوتا ہے انہوں نے مصری اخبار ''الشعب'' کا دفاع کرتے ہوئے مصر کے نائب وزیر اعظم اور وزیر زراعت ڈاکٹر یوسف والی کے خلاف مشہور مقدمہ لڑا تھا۔ مصر میں اسلامی تحریکوں کی جانب سے مقدمات کا سامنا کرنے والے وکیل منتصر الزیات کے مطابق ایمن الظواہری نے 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کو مسلمانوں کے تشخص کے خلاف سخت نقصان تصور کیا تھا اس وقت ایسا ردعمل تقریبا ہر مصری مسلمان نوجوان کے دل میں امڈ رہا تھا، ایمن الظواہری اس وقت ثانوی تعلیم کے مرحلے میں تھے کہ انہوں نے اس وقت مصر میں قائم ہونے والی جماعت جہاد اسلامی کے ارکان سے قریبی روابط استوار کر لئے یہ جماعت اخوان المسلمون پر ڈھائے جانے والے مظالم اور ان پر لگنے والی پابندیوں کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھی، 1968ء میں جہاد الاسلامی کے اہم ارکان اور امیر جماعت کے نمائندے یحییٰ ہاشم، اور اسماعیل طنطاوی ان کے قریبی ساتھی تھے ان

تینوں کی مثلث کو مصر میں اسلامی جہاد کی ابتداء کہا جاتا ہے اس کے بعد ان میں ڈاکٹر امین الدیری، انجینیر محمد عبدالرحیم الشرقاوی اور نبیل البرعی بھی ان میں شامل ہو گئے، مصری حکومت طویل عرصے تک ان پر الزامات عائد کرتی رہی کہ یہ حکومت کے خلاف خفیہ کارروائیوں میں مصروف ہیں اسی قسم کی الزام تراشیوں کے دوران **1972**ء میں یحییٰ ہاشم کو ''پولیس مقابلے'' میں قتل کروا دیا گیا۔ یحییٰ ہاشم کی شہادت کے بعد ایمن الظواہری نے اسلامی جہاد کے دیگر رہنماؤں کی طرح بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میڈیکل کالج میں تعلیم بھی حاصل کرتے رہے، اس دوران ان کی ملاقات مصری آرمڈ ڈویژن کے آفیسر عصام القمری سے ہوئی، اسلامی ذہن رکھنے والے اس مصری فوجی افسر نے جلد ہی ایمن الظواہری سے دوستی کرلی، ان کی مدد سے مصری فوج میں ایسے اسلامی ذہنوں کی تلاش شروع کی گئی جو مصر کو ثقافتی اور فکری لحاظ سے مغرب کی گود میں جانے سے روک سکیں اور امریکہ نواز عناصر سے مصری حکومت کو پاک کیا جاسکے۔

مصری حکومت نے جو ایمن الظواہری کے بارے میں تحقیقات کی ہیں ظاہری بات ہے اس میں سیاسی اختلافات کی وجہ سے بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہوگا مثلاً ایک جگہ کہا گیا کہ ''میڈیکل کالج میں ایمن الظواہری عام طالب علم نہیں تھا بلکہ ہمیشہ خفیہ سرگرمیاں جاری رکھنے کی حس اس میں جگہ بناتی رہی''۔ **1980**ء میں ہی ایمن الظواہری نے مصری فوج میں سولہ افسران سے روابط استوار کرلئے تھے، ان میں سالم رحال نامی فلسطینی نژاد اردنی باشندے نے بھی شمولیت اختیار کرلی، سالم رحال مصر میں پی ایل او کے لئے کام کرتے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کرنا تھا بعد میں اسلامی جہاد میں ایسے افراد بھی شامل ہوگئے جو پہلے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم تھے ان میں محمد عبدالسلام فرج کا گروپ بھی شامل تھا جنہوں نے ''الفریضۃ الغائبۃ'' (گمشدہ فرض) نامی کتاب تالیف کی تھی کمال السعید حبیب، کرم الزھدی کے گروپ بھی اس میں شامل تھے اس طرح اسلامی جہاد کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

صدر سادات کے قتل کے بعد **1984**ء میں بہت سی دیگر اسلامی جماعتوں کے ساتھ ساتھ اسلامی جہاد کے ارکان کو بھی گرفتار کرنے کے لئے کوششیں شروع ہوگئیں اس سلسلے میں

سب سے پہلے خالد عبدالسمیع کو گرفتار کیا گیا، جس کے بعد مصری حکومت نے دعویٰ کیا کہ ایمن الظواہری کا بھی اس قتل میں ہاتھ ہے حالانکہ یہ الزام حقیقت پر مبنی نہیں تھا کیونکہ ایمن الظواہری اس وقت تک عملی طور پر اتنے فعال نہیں تھے مگر انہیں خاصی تلاش کے بعد گرفتار کرلیا گیا جہاں انہیں قاہرہ کے ایک قلعے میں چھ ماہ کی مدت کے لئے قید رکھا گیا، ان کی قید کے دوران موساد نے مصر میں کئی تخریبی کارروائیاں کیں تاکہ اس کا سارا الزام اسلامی جہاد اور اس جیسی دوسری تنظیموں پر آسکے اور ان کارروائیوں کو ایمن الظواہری کی گرفتاری کا ردعمل بنایا جاسکے۔ اسی دوران مصری خفیہ ادارے نے مصری فوج میں سولہ ایسے افسران کا سراغ لگایا جن کے اسلامی جہاد سے قریبی روابط تھے ان افسران کا فوجی عدالت میں کورٹ مارشل کیا گیا مگر سر توڑ کوشش کے باوجود ان فوجی افسران اور اسلامی جہاد کے درمیان کسی قسم کے رابطے اور دہشت گردی کے واقعات کا ثبوت نہ مل سکا اور انہیں رہا کرنا پڑا جن میں عصام القمری سرفہرست تھے جیل سے رہا ہونے کے بعد ایمن الظواہری نے اپنی میڈیکل کی پریکٹس دوبارہ شروع کردی **1985**ء میں انہوں نے جدہ میں ابن النفیس میڈیکل سینٹر میں کام بھی کیا۔ **1986**ء میں وہ افغانستان آگئے اور اسامہ بن لادن سے ملاقات کی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا چلا گیا اسامہ اس وقت سوویت یونین کے خلاف شدید ترین عسکری معرکوں میں مصروف عمل تھے، ایمن الظواہری اس وقت جہاد کے ساتھ ساتھ جماعت الجہاد کے بکھرے ہوئے عناصر کو جمع کرنے میں مصروف تھے۔ افغانستان کی جہادی اور آزاد فضاء نے ان جنم جنم کے باغیوں کو جن کے اجداد بھی مغربی استعمار کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہے تھے نئی بہت سے روشناس کرادیا جہاد کی برکتیں اور مجاہدین کا جلال ان کے سامنے اس طرح بکھرا پڑا تھا جس طرح کسی عطار کی دکان میں عطر بکھرا ہو اور آس پاس کا تمام علاقہ اس کی مہک محسوس کررہا ہو۔ اسی دور میں ایمن الظواہری اور اسامہ بن لادن پشاور اور افغانستان کے اندر اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔

مختصر الزیات کے مطابق اسامہ بن لادن پر ایمن الظواہری کی شخصیت کا خاصا اثر پڑا وہ ابھی تک جہاد کو صرف سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کی جنگ تصور کرتا تھا عملی طور پر امریکہ کی مکاریاں اس کے سامنے نہیں آئی تھیں جبکہ ایمن الظواہری

مشاہدہ بہت پہلے کر چکا تھا، مصر اسرائیل کے خلاف دو جنگیں لڑ چکا تھا مصری مسئلہ فلسطین میں اسرائیل کے ساتھ ساتھ امریکہ کی دغابازیوں سے اچھی طرح واقف تھے ایمن الظواہری اور ان کے دیگر ساتھیوں کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ افغانستان میں امریکہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے بعد کس طرح یہاں کی اسلامی تحریکوں سے سلوک کرے گا۔ ذرائع کے مطابق ایمن الظواہری کی وجہ سے اسامہ بن لادن کے نظریہ جہاد نے عالمگیریت اختیار کی، اس کے بعد ان کے معاونین کو القاعدہ کے زعماء میں تبدیل کر دیا گیا ان کے اہم ترین نام اس طرح ہیں:

۔ابو عبیدہ البنشیری (علی الرشیدی) یہ مصری پولیس کے سربراہ تھے، سادات کے قتل کے بعد دینی رجحانات رکھنے پر انہیں ان کے منصب سے معزول کر دیا گیا تھا۔ یہ 1996ء میں بحیرہ وکٹوریا میں ایک حادثے کے دوران غرق ہو کر شہید ہو گئے تھے۔

۔محمد عاطف (ابو حفص) ان کا اصل نام صبحی ابو ستہ ہے۔

۔طارق انور سید

۔احمد حسن ابو الخیر

۔نصر فہمی وغیرہ

القاعدہ کی تنظیم نو سے پہلے ایمن الظواہری کا نظریہ تھا کہ دور کے دشمن سے نمٹنے کے لئے پہلے قریبی دشمن سے جنگ کی جائے یعنی مقبوضہ القدس کی آزادی کی تحریک کی ابتداء قاہرہ سے کی جائے مگر وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ دیکھا گیا کہ امریکہ اور اسرائیل کو نکیل ڈالے بغیر دنیا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تو ان کی فکر میں تبدیلی واقع ہونا شروع ہوئی۔ فروری 1998ء میں انہوں نے اسامہ بن لادن کے ساتھ اشتراک عمل کا معاہدہ کر لیا جس کے تحت اب ان کا مشترکہ دشمن امریکہ اور اسرائیل ہے یوں صلیبی اور یہودیوں سے جنگ کے لئے ''الجبھة الاسلامیة العالمیة'' کے نام سے ایک پلیٹ فارم تشکیل دیا گیا، افغانستان میں فلسطینی مجاہد عبداللہ عزام کا مکتب الخدمت پہلے ہی خدمات انجام دے رہا تھا جس کی وجہ سے دیگر عرب ممالک سے بے شمار مجاہدین بھی افغانستان میں داخل ہو چکے تھے، انہی مجاہدین اور مختلف جماعتوں کا مجموعہ بعد میں القاعدہ کی شکل اختیار کر گیا۔

ابو حفص:

محمد عاطف۔ انہیں ابو حفص کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ان کا اصل نام صبحی عبدالعزیز مد الجوہری ابو ستہ ہے ان کی عمر 2000ء میں 55 سال تھی اس طرح محمد عاطف اس وقت عمر ے لحاظ سے اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری دونوں سے بڑے تھے۔ مصر میں ان کا اسلامی ریکوں کے درمیان خاصا کام ہے مگر کسی طرح بھی ان کا نام اس دوران ابھر کر سامنے نہیں آ ، مگر اچانک ان کا نام 1988ء میں سامنے آتا ہے جب البانیا میں روپوش اسلامی تحریکوں ے بہت سے افراد واپس مصر آئے ان پر آتے ہی مصری عدالتوں میں مقدمات قائم کر دئے محمد عاطف پر ان کی غیر موجودگی میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور یکطرفہ طور پر انہیں سات سال قید لات سنائی گئی تھی اس تنازعے میں ابو حفص کو ملزم نمبر 99 کہا جاتا تھا۔ اس وقت ان کا نام ہلامی ذہن رکھنے والے سیاستدان کے طور پر سامنے آیا جو اس وقت سیکولر فکر کے حامل افراد ے لئے ایک دہشت بن چکا تھا۔ اس دور میں 107 ملزموں میں سے 60 مصر سے باہر تھے۔

دیگر مقدمات میں ابو حفص کے ساتھ ساتھ ایمن الظواہری، افغانستان میں ان کے ساتھ موجود ان کے بھائی محمد الظواہری، نصر فہیمی، ثروت صلاح، طارق انور، عبدالعزیز الجمل، عبداللہ رجب، علی ابو السعود اور عادل عبدالقدس وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بہت وں کو دس سال قید کی سزا بھی سنائی گئی۔ ذرائع کے مطابق ابو حفص اور جماعت الجہاد کے دیگر افراد نے اسی کی دہائی کے پہلے نصف اول میں مصر سے افغانستان کی جانب ہجرت کی اور سویت یونین کے خلاف باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا اس کے بعد وہ وہاں سے سوڈان اور پھر یمن منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد القاعدہ کی تنظیم نو کے دوران وہ واپس افغانستان آ گئے تاکہ اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کے ساتھ مل کر القاعدہ کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کا آغاز کیا جا سکے۔ مگر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں موجود اسلامی تحریکوں کا تجزیہ کرنے والے مغربی اور اسلامی ممالک کے ماہرین کے پاس ابو حفص سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔۔۔!

سلمان بوغیث:

کویتی نژاد سلیمان بوغیث القاعدہ کے انٹیلی جنس ونگ کے سربراہ ہیں۔ ذرائع کے مطابق سلمان بوغیث **1966**ء میں کویت میں پیدا ہوئے ان کا تعلق کویت کے تعلیم یافتہ اور دینی گھرانے سے ہے ان کے والد وزارت اوقاف میں ایک بڑے منصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے کی جامع مسجد کے خطیب اور امام بھی تھے۔ انہیں اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ کویتی ٹیلی ویژن پر سب سے پہلے انہوں نے اذان دی تھی۔

سلیمان بوغیث نے ابتدائی تعلیم کویت کے علاقے الرمیثیہ کے ''مدرسہ فلسطین'' میں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ ''مدرسہ الارقم'' میں منتقل ہوگئے جو کویت سٹی میں السالمیہ کے علاقے میں واقع ہے یہاں سے امتیازی نمبروں میں کامیاب ہونے کے بعد انہوں نے **1988**ء میں کویت کی یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں گریجویشن کیا اور اسی سال سالمیہ کے علاقے میں ''مدرسہ المعسوی'' میں مدرس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ان کے علاوہ ان کے تین بھائی محمد، عمر اور یحیی اور دو بہنیں ہیں۔

نوجوانی کی ابتداء میں سلیمان بوغیث دینی رجحانات رکھنے کے ساتھ ساتھ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی تصور کیا جاتا تھا۔ اپنے وقت میں اسے فٹ بال کا عاشق کہا جاتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے گھر سے سو میٹر کے فاصلے پر واقع مدرسے میں مدرس مقرر ہو چکے تھے جبکہ اپنے علاقے کی مسجد میں انہوں نے خطیب اور امام کے فرائض بھی سنبھال لئے تھے۔

کویت پر عراقی قبضے کے دوران انہوں نے کویت کو نہیں چھوڑا بلکہ عراق کی سرکاری لادینی جماعت ''بعث پارٹی'' کے خلاف وہ اپنے خطبوں کے دوران سخت تنقید کرتے رہے جس کی بنا پر عراقیوں نے ان کا نام مطلوب افراد کی لسٹ میں شامل کر دیا، اپنے والد کے منع کرنے کے باوجود وہ عراق کی بعث پارٹی کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے اور کویت کو آزاد کرانے کی مسلح جدوجہد کی تحریک میں شامل ہوگئے۔

کویت کی آزادی کے بعد انہوں نے اخوان المسلمون کے تحت کام کرنے والی ایک رفاہی تنظیم میں خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے الرمیثیہ کی مسجد میں خطابت کا جادو جگانا شروع کر دیا اب وہ کویت میں غیر ملکی فوجوں کے قیام کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور کویت میں مکمل طور پر اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد پر زور دیتے تھے ان کے ساتھ ان کے دو اور ساتھی عادل الزامل اور جابر الجلاھمہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے کویت میں ہونے والے **1992**ء اور **1996**ء کے عام انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ **1998**ء میں انہیں خطاب کرنے سے روک دیا گیا کیونکہ وہ مغربی جمہوریت اور حکومت کی سیاسی پالیسیوں پر کھل کر تنقید کرتے تھے، ان کے نزدیک مغربی جمہوریت کفار کا نظام ہے اسے اسلامی ممالک میں نہیں نافذ ہونا چاہئے۔ **2000**ء میں کویت کی شارع الصفاۃ پر انتفاضہ فلسطین کی حمایت میں زبردست مظاہرہ ہوا جس میں انہوں نے شرکت کی۔ ذرائع کے مطابق ان تمام سرگرمیوں کے دوران انہوں نے بوسنیا، شیشان اور افغانستان میں جہاد کیا۔ اسی سال وہ جون میں بیس دیگر افراد کے ساتھ افغانستان پہنچ گئے تاکہ اسامہ بن لادن کے جھنڈے تلے کویت میں غیر ملکی فوج کے خلاف جدوجہد کی جاسکے یہاں ان کے بیوی بچے بھی ساتھ تھے مگر ان کا قیام پاکستان میں تھا جب انہوں نے قندھار میں مستقل قیام کر لیا تو ان کی بیوی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا واپس کویت چلے گئے۔ مگر جب الجزیرہ چینل کے ذریعے ان کی تصویر القاعدہ کے ترجمان کے طور پر سامنے آئی تو کویت کی کابینہ نے حکومت کو ان کی کویتی شہریت منسوخ کرنے کی تجویز پیش کر دی اور یوں القاعدہ کا نام ان کے منہ سے نکلتے ہی ان کی کویتی شہریت ختم کر دی گئی مگر ان کے خاندان کے افراد پر اس حکم کا اطلاق نہیں کیا گیا۔

روسی جنرل اسامہ کا گارڈ کیسے بنا:

القاعدہ کے ساتھ ساتھ اسامہ بن لادن کی خصوصی فورس کا بھی دنیا میں خاصا چرچا ہے، اس فورس میں دس ہزار کے قریب کمانڈوز ہیں جن میں سات ہزار عرب ہیں جن کا تعلق مختلف عرب ممالک سے ہے ان کی بڑی تعداد سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑ چکی ہے اس کے بعد اس فورس نے روس نواز نجیب حکومت کے خلاف زبردست جنگ لڑی۔ طالبان کے منظر عام پر آنے کے بعد اس فورس کو جدید انداز میں منظم کیا گیا بعد میں اسامہ کی یہ خصوصی فورس طالبان کے ساتھ مل کر طالبان مخالف قوتوں کے خلاف بھی مصروف جنگ رہی۔ اب اسے افغانستان میں القاعدہ کی فوج کہا جاتا ہے۔

مغرب اور مغرب نواز عناصر کا پراپیگنڈا ہے کہ القاعدہ کی یہ فورس افغانستان میں ریاست کے اندر ریاست کا مقام رکھتی ہے اس کے ارکان پر افغانستان کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مگر یہ سراسر افترا ہے افغانستان میں القاعدہ کے نیٹ ورک میں ستر افراد کلیدی عہدیدار تصور کئے جاتے ہیں، طالبان کی چند کلیدی شخصیات کے علاوہ کسی کو اسامہ بن لادن کے ٹھکانے کا علم نہیں ہوتا یہ ستر شخصیات ایک دائرے کی طرح اسامہ کے گرد موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ ایمن الظواہری اس تنظیم میں اسامہ کے نمبر دو کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، ملا ولید القاعدہ کے کمانڈو دستے کے کمانڈر ہیں ان کا تعلق قندھار سے بتایا جاتا ہے اس کے علاوہ سب سے حیران کن بات ایک روسی جنرل ہے جو مسلمان ہونے کے بعد القاعدہ میں خصوصی خدمات انجام دیتا رہا ہے، مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام (ابوالفتح) رکھا گیا، سوویت یونین کا یہ جنرل افغانستان میں سوویت قبضے کے دوران بامیان کا کمانڈر تھا جہاں ہزارا قبیلے کے افراد کثرت سے رہائش پذیر تھے اس جنرل کو حزب اسلامی کے قائد گلبدین حکمتیار نے گھمسان کے معرکے میں شکست سے دوچار کیا تھا اور بامیان پر قبضہ کرلیا تھا اس وقت یہ روسی جنرل اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ قازقستان کی جانب پسپا ہوگیا جو اس وقت سوویت ریاست تھی، یہاں اس کی ملاقات داغستان کی ایک دینی شخصیت سے ہوئی، اس کے ساتھ ملاقاتوں میں اسلام موضوع رہا، افغان مجاہدین کے ساتھ جنگ کے دوران وہ اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان چکا تھا اس لئے اس کا تجسس بڑھتا چلا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا اور قازقستان کے دارالحکومت الماتا کی ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینا شروع کردے، اسلام کے بارے میں اس کا علم بڑھتا رہا، سوویت فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے وہ جنگی علوم کا ماہر تصور ہوتا تھا اس لئے اسلام میں جہاد کی روح نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا پہلی مرتبہ اسے علم ہوا کہ جنگ کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے اس کی بھی کوئی ثقافت ہوتی ہے اور یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اس وحشیانہ فعل کو اعلیٰ مقاصد عطا کرکے عبادت سے ہمکنار کردیا تھا۔ ابوالفتح ابھی الماتا کی مسجد میں دینی تعلیم کا سلسلہ شروع کئے ہوئے تھا کہ شیشان کی جنگ شروع ہوگئی، اس نے اپنے ساتھ مسلمان نوجوانوں کا ایک دستہ تیار کیا اور داغستانی دوست کے ساتھ اللہ کے راستے میں ایسی جنگ کے لئے چل پڑا جس کی تربیت اس نے سوویت یونین کی ''لادینی'' ملٹری اکیڈمیوں میں حاصل کی تھی۔ یہاں آکر اس نے اپنے تمام سابقہ تجربات روسی

فوجوں کے خلاف آزمائے۔ روسی ہونے کی وجہ سے وہ روسیوں کے طریقہ جنگ سے اچھی طرح واقف تھا بلکہ جنرل ہونے کی وجہ سے وہ خود روسی فوجوں کو لڑاتا رہا تھا اب اس کا یہ تجربہ مجاہدین اسلام کے کام آرہا تھا، اسی دوران شیشان کے مجاہدین کے لئے افغانستان کے پہاڑوں سے کمک آن پہنچی یہ عرب مجاہدین کا خصوصی دستہ تھا جسے اسامہ بن لادن نے شیشان مسلمانوں کی مدد کے لئے روانہ کیا تھا اس کے بعد روسیوں کا جو حشر ہوا وہ تمام دنیا کے علم میں ہے۔ اس جنگ کے دوران ابوالفتح کی ملاقات عرب مجاہدین سے ہوئی اور ان کے درمیان تیزی کے ساتھ قربت بڑھتی چلی گئی۔ شیشان میں جنگ ختم ہونے کے بعد ابوالفتح ان عرب مجاہدین کے ساتھ افغانستان آگئے اور یہاں ان کا اسامہ بن لادن سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا، ان کی جنگی مہارت دیکھتے ہوئے انہیں القاعدہ کا اسٹریٹیجک قائد مقرر کردیا گیا اور القاعدہ انٹیلی جنس کے انچارج بوغیث کے ساتھ ان کا شعبہ ضم کردیا گیا۔ ان کا تعلق طالبان انٹیلی جنس ''وزارت المخابرات'' سے بھی تھا جس کے سربراہ ملا تاج میر تھے۔ اسامہ بن لادن کی سیکورٹی کی وجہ سے صرف چند افراد کو ان کے ٹھکانے کا علم ہوتا تھا ان میں افغانستان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد، انٹیلی جنس سربراہ ملا تاج میر، کمانڈر طالبان کمانڈوز ملا علاء عاد، وزیر خارجہ وکیل احمد متوکل شامل ہیں۔ ابوالفتح (روسی جنرل) خاص موقعے پر اسامہ کے گارڈز کی کمان سنبھالنے کے ذمہ دار ہیں۔

اس وقت افغانستان کی صورتحال یہ ہے کہ افغان مجاہدین امریکہ اور اس کے کرائے کے فوجیوں شمالی اتحاد کو افغانستان کے اندر لانے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ گذشتہ جنگ کے دوران شمالی اتحاد کو جب بھی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا وہ بھاگ کر تاجکستان میں داخل ہوجاتے تھے طالبان ان کے تعاقب میں سرحد پار نہیں کرسکتے تھے کیونکہ اس سے بڑی جنگ چھڑنے کا خطرہ تھا اور مقابل تاجک فوجیں بھی آسکتی تھیں اس لئے جنگ کا دائرہ پھیلانے سے گریز کیا گیا مگر مزار شریف اور اس کے مضافات کے علاقے شمالی اتحاد کے حوالے کرکے انہیں افغانستان کے اندر گہرائی میں آنے کی دعوت دی گئی ہے یقینی بات ہے کہ امریکیوں نے مزار شریف پر اپنے اڈے بنانے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کے انتظار میں افغان مجاہدین ایک ماہ سے زائد عرصے تک بمباری برداشت کررہے تھے۔ روس اور چین بھی اس قسم کی دبی دبی خواہش رکھتے ہیں کہ امریکی کمانڈوز جلد از جلد افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھیں۔۔۔ مگر امریکہ ابھی تک کسی مکار لومڑی

کی طرح اس حربے سے بچ رہا تھا۔ ذرائع کے مطابق شمالی اتحاد کی پیش قدمیوں میں بھارتی جنرلوں کا بڑا ہاتھ ہے، بھارتی جنرل امریکی فوجی مشیروں کے ساتھ اس وقت تاشقند میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، بھارت کو اس بات کی جلدی تھی کہ شمالی اتحاد جلد از جلد کابل پہنچ جائے مگر امریکی اس کے حق میں نہیں تھے ان کے خیال میں اگر کوئی گروپ کابل پر قابض ہوگیا تو معاملات ایک مرتبہ پھر امریکہ کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اسے امریکہ، بھارت اور برہان الدین ربانی کی چپقلش کہا جاسکتا ہے امریکیوں کو علم تھا کہ شمالی اتحاد کے کابل پر قابض ہوجانے کے بعد برہان الدین ربانی روس اور بھارت کی حمایت سے اپنی حکومت کا اعلان کرانے کی کوشش کرے گا، بھارت کو امریکہ سے اس بات کا شکوہ تھا کہ وہ عملی طور پر اپنے فوجی افغانستان میں نہیں لڑا رہا جبکہ شمالی اتحاد اور بھارتیوں کو قربانی کا بکرا بنانے پر تلا ہوا ہے یہی وہ شکوہ تھا جو واجپائی کی زبان پر امریکہ یاترا کے دوران آیا اور انہوں نے اپنے ایک بیان میں اس کا اظہار کیا کہ ''کیا امریکیوں کی جانیں بھارتیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔۔۔''

ذرائع کے مطابق وسطی ایشیا میں قائم موساد کے نیٹ ورک نے امریکی سی آئی اے اور پینٹا گان کو اس بات سے مطلع کیا تھا کہ شدید قسم کی روایتی جنگ میں بھی القاعدہ اور طالبان ملیشیا پر قابو پانا مشکل ہوگا اگر کسی مرحلے میں شمالی اتحاد ناکام ہوگیا تو اس بات کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ امریکہ خود براہ راست فوجی مداخلت کرے جس کے نتائج اچھے نہیں نکل سکتے۔ انہی رپورٹوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے امریکی وزیر دفاع رامسفیلڈ نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ افغانستان میں چھوٹے ایٹم بم استعمال کئے جاسکتے ہیں اسی بیان کا جواب دیتے ہوئے اسامہ بن لادن نے امریکہ کو خبردار کیا تھا کہ ایٹمی حملے کا جواب بھی ایٹمی ہتھیار سے دیا جائے گا۔

ذرائع کے مطابق جوں جوں افغانستان میں صورتحال امریکہ کے ہاتھ سے نکلتی محسوس ہوئی اسی طرح بھارت اور امریکہ کے درمیان اختلافات کی خلیج بھی بڑھنے لگی، بھارت اپنے مقاصد کے لئے علاقے میں امریکی کاؤ بوائے ازم استعمال کرنا چاہتا تھا مگر امریکی کاؤ بوائے کا گھوڑا افغان سرحد سے ورے ہی بدک چکا تھا تمام تر انحصار فضائی قوت پر کیا گیا۔

ΩΩΩ

القاعدہ اور خفیہ ہاتھ

افغانستان میں ایک جنگ میدان میں لڑی جارہی تھی مگر اصل اور اہم معرکہ میڈیا اور ...وں کی آنکھ سے دور خفیہ ایجنسیوں کے درمیان لڑا جارہا تھا، اسامہ بن لادن اور ان کے ...کار کی تلاش کے لئے اس خفیہ جنگ میں جہاں عالمی ایجنسیوں کی معاونت کے فرائض ...لی اور علاقائی میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد سرانجام دے رہے تھے وہاں دنیا کی جدید ...ٹیکنالوجی اور انسانی وسائل بھی وافر مقدار میں استعمال کئے گئے، پہلی مرتبہ امریکی فوج کے ...کروڑوں ڈالر نقدی کی شکل میں افغانستان بھیجے گئے تاکہ ہنگامی صورتحال میں موقع پر ...ت دے کر مطلوبہ افراد کے متعلق معلومات حاصل کی جاسکیں، مگر افغانستان کے پہاڑوں اور ...وں نے اسامہ اور ملا عمر کو اگلنے سے انکار کردیا۔ اس جنگ نے جہاں جہادی تنظیموں کے ...ے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کرکے طشت از بام کیا ہے وہاں ذرائع کے مطابق ایک فائدہ یہ ...ی ہوا ہے کہ دنیا بھر کا جہادی نیٹ ورک ان کمزوریوں کے ازالے اور اپنی اصلاح کے لئے ...ی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

پیرس کے ذرائع کے مطابق فرانسیسی ادارہ برائے قومی سلامتی کے ارکان کے مطابق ...یلہ اور برطانیہ کے خفیہ اداروں نے اسامہ بن لادن کی تلاش کے لئے تین طریقے استعمال ...جس میں اسامہ اور ان کے رفقاء کار کی ٹیلی فونک گفتگو کے ذریعے ان کے خفیہ مقامات کا پتا

چلانا بھی شامل تھا ان میں اسامہ کے وہ رفقاء کار بھی شامل ہیں جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں بحری، بری اور فضائی وسائل میں نصب سننے کے جاسوسی آلات ہمہ وقت اس مشن پر معمور ہیں۔

اسامہ کی تلاش کا دوسرا طریقہ ان قوتوں نے رات دن کی فضائی نگرانی کی شکل میں اختیار کیا اس مقصد کے لئے جدید ترین راڈار طیارے **JointstarseEC** کا استعمال کیا گیا۔ تیسرا طریقہ **DC130** بمبار طیاروں کا استعمال تھا ان طیاروں میں ایسے حساس کیمرے نصب تھے جو پہاڑوں کے اوپر گشت کے دوران ہلکی سی حرارت محسوس کر کے غاروں میں چھپے افراد کی نشاندہی کر سکتے تھے۔

تیسرا طریقہ بین الاقوامی اور علاقائی سطح پر ایسے لوگوں کا بڑی تعداد میں بھرتی کرنا تھا جو ڈالروں کے عوض اسامہ بن لادن، ملا محمد عمر اور ان کے ساتھیوں کے خفیہ ٹھکانوں کی نشاندہی کر سکیں۔

پیرس کے ذرائع کے مطابق اسامہ سے متعلق خفیہ معلومات سی آئی اے کو فروخت کرنے والوں میں سے ایک کا تعلق مصری اسلامی تحریک ''الجماعۃ الاسلامیۃ'' سے ہے اس کا نام مصلحتاً ظاہر نہیں کیا گیا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا جماعت کی قیادت میں نمبر چوتھے درجے پر آتا تھا یعنی ایمن الظواہری، ابوحفص اور رفاعی احمد طہ کے بعد اس کا نمبر آتا تھا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن لادن سے اختلافات کی وجہ سے **11** ستمبر کے واقعات کے بعد اس نے افغانستان کے ایک پڑوسی ملک سے امریکیوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا تاکہ انہیں القاعدہ کے ارکان اور ان کی نقل وحرکت اور القاعدہ کے عالمی نیٹ ورک کے بارے میں مطلع کر سکے، جب سی آئی اے کے ارکان نے اس سے براہ راست ملاقات کی تو اس نے حیرت انگیز انکشافات کئے، اسی نے امریکیوں کو باور کرایا کہ اسامہ بن لادن امریکی کارروائیوں کے خلاف جراثیمی ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ پیرس کے ذرائع کے مطابق یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا جس میں اسامہ کے بارے میں امریکیوں کو مخبری کی گئی ہو بلکہ اس سے پہلے مارچ **2000**ء میں امریکی سی آئی اے نے مصری اسلامی تحریک کے ایک بڑے رکن محمد الظواہری المعروف مھندس (ایمن الظواہری کے بھائی) کو مصر سے افغانستان جاتے ہوئے عرب امارات میں ٹرانزٹ کے

دوران اپنی تحویل میں لے لیا تھا، سی آئی اے حکام نے محمد الظواہری پر بے پناہ تشدد کیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے امریکیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا تو اسے مصری حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا، محمد الظواہری سے افغانستان میں القاعدہ اور اس کے قائدین کے ذرائع مواصلات اور جدید ٹکنیک کے بارے میں امریکیوں نے مفید معلومات حاصل کیں خاص طور پر ان قائدین کے زیر استعمال سیٹلائٹ ٹیلی فونوں کے بارے میں تاکہ القاعدہ کی افغانستان میں نقل وحرکت کے بارے میں جاسوسی آسانی کے ساتھ کی جاسکے۔ فرانسیسی ذرائع کے مطابق معلومات حاصل کرنے کے بعد محمد الظواہری کو حیرت انگیز طور پر رہا کر دیا گیا۔۔۔! جو امریکیوں کا ایک طریقہ واردات ہے اس سلسلے میں شاید پردہ کئی سال بعد اٹھ سکے۔۔۔

فرانسیسی ادارہ برائے قومی امن کے ایک ذمہ دار آفیسر کے مطابق افغانستان کی جنگ شروع ہونے سے چند ہفتے قبل امریکیوں کو سب سے زیادہ کامیابی طالبان کے اندر اس نیٹ ورک کے ذریعے حاصل ہوسکی جو آئی ایس آئی کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل کے دور میں قائم کیا گیا تھا، جنگ کی ابتداء ہی میں اس نیٹ ورک نے امریکیوں کو انتہائی مفید معاونت مہیا کی، فرانسیسیوں کے مطابق اس نیٹ ورک کے ذریعے طالبان صفوں میں بہت سے لوگ داخل کئے گئے تھے جن میں ایک تاجمین جاوا **(Tajmin Jawa)** ملا محمد عمر کے بہت قریب تصور کیا جاتا تھا اسی کے ذریعے طالبان قیادت کو ایسے مواصلاتی ذرائع مہیا کئے گئے تھے جن میں لگے خفیہ آلات کی مدد سے امریکی طالبان فورس کی نقل وحرکت اور جنگی منصوبوں کو آسانی کے ساتھ اپنے مشاہدے میں رکھ سکتے تھے۔

اس سارے تناظر میں سب سے زیادہ تباہی تین سیٹلائٹ فونوں نے مچائی، یہ ٹیلی فون **11** ستمبر کے واقعات سے پہلے دیگر آلات کے ساتھ ساتھ ''مہیا کردہ'' تھے جس نے بعد کے واقعات میں ایجنسیوں کی جنگ میں انتہائی اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا، ان ہی کی مدد سے جنگ کے شروع میں امریکیوں نے بعض حساس ٹھکانوں پر بمباری کی تھی، ایسے ہی آلات کے ذریعے مغربی ایجنسیاں اسامہ اور القاعدہ کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ طالبان میں اسامہ کے دوستوں کی جاسوسی کرتی رہیں، ان تین سیٹلائٹ ٹیلی فونوں نے امریکی اور دیگر مغربی ایجنسیوں کو اسامہ اور ملا محمد عمر کے بہت نزدیک پہنچا دیا تھا۔

ان ٹیلی فونوں میں سے ایک سیٹ القاعدہ کے ملٹری چیف ابو حفص کے استعمال میں تھا جس کا نمبر 9281837655 تھا یہ ٹیلی فون ابو حفص کی شہادت سے ایک ماہ قبل القاعدہ تنظیم کے ایک فرد کے ذریعے لندن سے خریدا گیا تھا اس ٹیلی فون کی جانچ پڑتال افغانستان میں القاعدہ کے الیکٹرانک کے ماہرین نے کی تھی اس لئے ابو حفص اسے اطمینان سے استعمال کررہے تھے مگر برطانوی ایجنسی نے القاعدہ میں موجود اپنے ایجنٹ کے ذریعے اس فون کی خریداری سے پہلے ہی اس میں سننے کے آلات نصب کردیئے تھے۔اس اطمینان کے لئے کہ اس میں کوئی خفیہ آلہ نہ نصب ہو اس فون کے ذریعے آزمائشی طور پر کئی ممالک میں کالیں کی گئی تھیں سیٹلائٹ فون پر بات کرنے کے فوراً بعد ابو حفص اپنی جگہ تبدیل کرلیتے تھے اسی دوران 11 ستمبر کے واقعے کے چند روز بعد برطانوی ایجنسی نے ابو حفص اور دبئی میں موجود ایک غیر معروف شخص کے درمیان گفتگو بھی سنی جس کی بنیاد پر برطانویوں نے دعوی کیا تھا کہ امریکہ میں ہونے والے دھماکوں کے پیچھے اصل ماسٹر مائنڈ ابو حفص تھے۔اسی ٹیلی فون کی مدد سے برطانوی ایجنسی نے جنگ کے دوران ابو حفص کے ٹھکانے کا پتا چلا کر امریکیوں کو مطلع کیا تھا جنہوں نے علاقے میں شدید بمباری کر کے ابو حفص کو شہید کرنے کا دعوی کیا۔

ذرائع کے مطابق دوسرا ٹیلی فون ملا محمد عمر کے استعمال میں تھا جس کا نمبر 9251225350 تھا۔اس ٹیلی فون کا استعمال ملا محمد عمر 15 نومبر تک کرتے رہے اس پر سے آخری کال اسامہ بن لادن کو کی گئی تھی ،جس کے ذریعے امریکیوں کو علم ہوا کہ ملا محمد عمر اس وقت کابل میں ہیں اور اسامہ بن لادن قندھار کے قریب کسی خفیہ مقام پر ہیں۔یہ شمالی اتحاد کے کابل میں داخلے سے پہلے کی بات ہے ،امریکیوں کے مطابق اس آخری گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملا عمر اور اسامہ میں جنگی حکمت عملی کے معاملے میں اختلاف ہے مگر جلد ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ رابطہ اچانک منقطع ہوگیا جس سے امریکیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا ،اسی لمحے ملا عمر نے کابل کو خالی کر کے جنوبی افغانستان میں اپنی قوت مجتمع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا جائے مگر اس فیصلے سے اسامہ لاعلم تھے۔جیسے ہی امریکیوں کو اس بات کا علم ہوا کہ اسامہ اور طالبان قیادت کے درمیان مواصلات کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے انہوں نے شمالی اتحاد کو کابل کی جانب پیش قدمی کا اشارہ دے دیا یوں امریکی بمباری کے سائے

تلے سوائے قندھار کے شمالی اتحاد تمام افغانستان پر چھاتا چلا گیا مگر اس تمام عرصے میں امریکی دلوں کی طرح ہمیشہ شمالی اتحاد کی پچھلی لائنوں میں رہے۔

ان سیٹلائٹ ٹیلی فونوں میں تیسرا فون اسامہ بن لادن کے استعمال میں تھا جس کا نمبر 9281837825 تھا ذرائع کے مطابق یہ ٹیلی فون بھی جنگ سے ایک ماہ قبل لندن سے ''الشیخ محمد الناہید'' کے فرضی نام سے خریدا گیا تھا ،اسامہ کی عادت کے مطابق یہ فون بھی صرف ایک مرتبہ ہی استعمال کیا گیا تھا اس بات کا علم امریکیوں کو بھی تھا کہ اسامہ کے پاس ایک وقت میں ئی فون ہوتے ہیں جنہیں ایک مرتبہ استعمال کرنے کے بعد تلف کردیا جاتا ہے اس لئے مغربی ایجنسیوں کو اس بات کا علم تھا کہ ایک مرتبہ اسامہ نے اس فون کو بھی استعمال کرنا ہے اس لئے اسامہ کے ایک ساتھی کے ذریعے یہ سیٹلائٹ فون اس تک پہنچا دیا گیا اس کے بعد سے امریکیوں نے اسامہ کی ایک ایک لمحے کی جاسوسی شروع کردی مبادا اسامہ کس وقت اس فون کو استعمال کرلیں۔جیسے ہی اسامہ نے اس فون کو استعمال کیا امریکیوں کو معلوم ہوگیا کہ اسامہ مغربی قندھار کی جانب ایک قبیلے میں اسی کلومیٹر مربع کے علاقے میں موجود ہیں۔

فرانسیسیوں کے مطابق 20 اکتوبر کو امریکی کمانڈوز نے قندھار میں ایک گوریلا کارروائی کے دوران طالبان کے ایک اہم مرکز پر قبضہ کر کے وہاں سے اہم دستاویزات اپنے قبضے میں لے لی تھیں جن سے طالبان کے آئندہ جنگی منصوبوں اور اسامہ کے دو ٹھکانوں کا علم امریکیوں کو ہوا۔ان میں سے ایک مرکز وسطی افغانستان میں اورزغان میں تھا جبکہ دوسرے مرکز کا علم نہیں ہو سکا مگر اس کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ یہ پاکستانی سرحد کے قریب ایک قبائلی علاقے میں بین الاقوامی امدادی تنظیم سے متصل تھا جس کی فرضی تیس ایمبولنسوں میں مواصلات کی نگرانی کا جدید ترین نظام نصب کیا گیا تھا اسی کے ذریعے اس جگہ کی مکمل نشاندہی حاصل کی گئی اور یہاں خوفناک بمباری کی گئی ،ذرائع کے مطابق امریکی مقامی ایجنٹوں کی مدد سے اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر کے قریب پہنچ چکے تھے کہ اچانک ایک نہ نظر آنے والے ''ہاتھ'' نے انہیں اچک لیا اس کے بعد سے امریکیوں کو اسامہ اور ملا محمد عمر کے ٹھکانوں کا علم نہ ہوسکا اور وہ اندھوں کی طرح صرف شہری آبادی کو شک کی بنیاد پر نشانہ بناتے رہے۔

افغانستان کی جنگ میں امریکی دہشت گردی کے جلو میں شمالی اتحاد نے جہاں تمام ملک

دار التحقیق برائے علم و دانش KURF

میں ظلم وستم کا بازار گرم کیا ان میں قندوز کا چھ روزہ محاصرہ بھی تھا جس کا ڈراپ سین قلعہ جنگی میں قیدیوں کے بے رحمانہ قتل عام پر ہوا اس محاصرے کے دوران غیر افغانی مجاہدین پر کیا گذری اس سلسلے میں لندن کے ذرائع نے اسامہ بن لادن کے ایک قریبی عرب ساتھی ''ابوصعب'' سے رابطہ کیا جو خود اس وقت قندوز میں محاصرے میں تھا اور یہاں سے دیگر مجاہدین کے ساتھ جنگ کرتا ہوا آخر کار قندھار اور قندھار خالی کردینے کے بعد محفوظ مقام پر پہنچ چکا تھا۔ ابوصعب نے انکشاف کیا کہ قندوز کے معرکے میں محاصرے کے دوران شدید جنگ لڑی گئی جس کی قیادت اسامہ بن لادن نے ''محمد داداللہ'' کے نام سے کی مگر اس بات کی ہوا آخری وقت تک امریکیوں اور شمالی اتحاد والوں کو نہ لگ سکی جنگ کے آخری مرحلے میں مجاہدین کے پاس اسلحہ انتہائی قلیل تعداد میں رہ گیا تھا اس کے علاوہ زخمی مجاہدین کی تعداد خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی جب مجاہدین تک یہ خبر پہنچی کہ طالبان فورس ایک مرکز کی جانب سمٹ رہی ہے تا کہ طویل گوریلا جنگ کی جاسکے تو علاقے میں موجود مجاہدین کی دیگر قیادت کے مشورے سے قندوز خالی کرنے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ یہاں سے نکل کر طالبان فورس تک پہنچا جا سکے ہم معاہدے کے تحت قندوز خالی کر کے شمالی اتحاد کے درمیان سے باحفاظت نکل گئے اور شمالی اتحاد کو اس بات کی خبر تک نہ ہوسکی کہ قندوز خالی کرنے والے مجاہدین کی سب سے آگے والی گاڑی کے بعد جو گاڑی تھی اسامہ اس میں سوار ہیں اسامہ اس وقت ہمارے ساتھ تھے جب امریکہ اور اس کے حواری انہیں پہاڑوں اور وادیوں میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ محمد داداللہ کے نام سے اسامہ بن لادن وائرلیس سسٹم سے قندوز میں دیگر مجاہدین کو جنگ کے دوران ہدایات دیتے تھے ان کا اس وقت مرکز قندوز کا ہوائی اڈا تھا جو ایک کھلی جگہ ہے اور یہیں آسمان تلے اسامہ جہادی کارروائیوں کی نگرانی کررہے تھے۔ ابوصعب کے مطابق ''قندوز میں اس وقت زیادہ تر غیر افغانی مجاہدین تھے جن کا تعلق القاعدہ سے تھا جبکہ طالبان فورس کی تعداد انتہائی قلیل تھی جس کے ذمے مزار شریف کا دفاع تھا مگر جس وقت مزار شریف خالی کرنے کا حکم آیا تو ہم لوگ سمجھ گئے کہ اب القاعدہ اور طالبان فورس جنوب کی جانب سمٹ کر جنگ کی حکمت عملی اپنا رہی ہے اس لئے ہم شہر کی کئی سمتوں سے باحفاظت نکلے اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس وقت یہاں سے نکلنا شروع کردیا تھا جب ابھی شمالی اتحاد قندوز کا محاصرہ بھی پوری طرح نہیں کر پایا تھا مگر ایک مشکل

ہمارے ساتھ یہ تھی کہ ہم میں بیمار اور زخمی مجاہدین کی تعداد بھی تھی اس لئے ہم نے اپنے آپ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک وہ جو لڑنے کے قابل تھے اور دوسرا حصہ وہ جو زیر علاج تھا یہ لوگ زیادہ تر یہیں قلعہ بند ہوکر لڑنا چاہتے تھے۔ پہلے حصے میں **600** مجاہدین تھے جن میں **210** پاکستانی، **90** ازبکی **13** عرب اور باقی افغان تھے''۔

اسامہ بن لادن کے قریبی ساتھی ابوصعب کے مطابق ''عالمی میڈیا کی جانب سے جان بوجھ کر پراپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ اسامہ بن لادن اور طالبان قیادت اپنے فوجیوں کو موت تک لڑنے کا حکم دے رہے ہیں حالانکہ ان کی جانب سے ہمیں کبھی ایسی ہدایات جاری نہیں کی گئیں ہم نے جو کچھ کیا ان حالات میں اس سے بہتر راستہ کوئی نہ تھا۔ پیچھے رہ جانے والے مجاہدین کا خیال تھا کہ قلعہ بند ہوکر آسانی کے ساتھ جنگ جاری رکھ سکیں گے اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ محاصرہ توڑ کر باقی طالبان فورس سے آن ملیں گے مگر ڈالروں نے بزدل امریکیوں کا کام آسان کردیا تھا ہر جگہ سے لالچ میں مجاہدین کی مخبریاں کی جارہی تھیں مگر مجاہدین پھر بھی ایک جگہ سے محاصرہ توڑ کر خان آباد تک پہنچ چکے تھے یہاں انہوں نے شمالی اتحاد کو دو دنوں تک جنگ میں الجھائے رکھا مگر ان دو دنوں کی شدید جنگ میں ان کا اسلحہ تیزی کے ساتھ ختم ہوگیا جس پر انہوں نے آپس میں ہنگامی اجلاس بلا کر خودکش حملوں کا فیصلہ کیا مگر اس میں بھی چند ہی مجاہدین کامیاب ہوسکے، باقیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے کیونکہ ان میں گولیاں ہی ختم ہوچکی تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد انہیں قلعہ جنگی میں منتقل کرنے کا کام شروع کردیا گیا مگر بعض مجاہدین نے اپنے لباس میں گرنیڈ چھپا لئے تھے جن کی مدد سے انہوں نے شمالی اتحاد کے پانچ رہنما ہلاک کردیئے اور خود بھی شہید ہوگئے اس بات کا اعتراف عبدالرشید دوستم نے بھی کیا تھا''۔ ابوصعب کے مطابق ''قلعہ جنگی میں جہاں مجاہدین کا جانی نقصان ہوا وہاں شمالی اتحاد اور امریکیوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا تھا، شمالی اتحاد نے امریکی طیاروں کو حملے کا اشارہ دیا جس کے بعد وہاں بلاتمیز بمباری کی گئی اس بمباری میں شمالی اتحاد کے تیس فوجی مارے گئے۔ قلعہ جنگی میں قید کئے گئے تقریباً تمام مجاہدین یا تو سخت زخمی تھے یا بیمار تھے جب ان کے ہاتھ پشت پر باندھے جارہے تھے تو اسی وقت ان کے درمیان دوبارہ جنگ شروع ہوگئی۔ ان نہتے مجاہدین نے **140** امریکی اور برطانوی کمانڈوز ہلاک کردیئے تھے''۔

تعداد بتاتے ہوئے ابوصعب نے انکشاف کیا کہ ’’قندوز میں مجاہدین کی تعداد کے بارے میں پراپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ یہاں ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے جبکہ ہم نے قندوز سے نکلتے وقت جب مجاہدین کے دو حصے کئے تھے تو پہلے نکلنے والے مجاہدین جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی صرف **1460** تھے جن میں **400** صرف غیر افغان مجاہدین تھے ان میں بڑی تعداد پاکستانی مجاہدین کی تھی جبکہ باقی عرب، ازبک اور دیگر مجاہدین تھے یہ تعداد خیریت سے قندوز سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی کیونکہ شمالی اتحاد قندوز کا پوری طرح محاصرہ نہیں کرسکا تھا انہوں نے صرف شاہراہوں کو اپنے قبضے میں لیا تھا اس لئے ہم بہت سے خفیہ مگر غیر عادی راستوں سے واقف تھے قندوز سے نکلتے وقت سوائے چند جھڑپوں کے اور بارودی سرنگوں کے پھٹنے کے اکا دکا واقعات کے جن میں ہمارے چھ ساتھی شہید ہوئے ہمیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں رہا، ہم تین دن تک سفر میں رہے جس کے بعد ہم قندھار پہنچ گئے‘‘۔ ابوصعب کے مطابق جب مجاہدین مزار شریف کے بعد قندوز میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد **2600** تھی جن میں سے امریکی بمباری سے **86** مجاہدین شہید ہوئے یہاں سے **2240** مجاہدین خیریت سے نکلنے میں کامیاب ہوچکے تھے ان میں **713** عرب، پاکستانی اور ازبک مجاہدین تھے جبکہ باقی افغان تھے۔ ابوصعب نے قلعہ جنگی میں عرب مجاہدین کے بارے میں بتایا کہ ’’یہاں جن قیدی مجاہدین کو عرب ظاہر کیا گیا تھا اصل میں وہ پاکستانی مجاہدین تھے جو سخت زخمی تھے، شمالی اتحاد کہتا رہا کہ یہاں **800** کے قریب مجاہدین تھے جنہیں قید کرکے شہید کردیا گیا۔ اگر تھے تو کہاں گئے یا تو ان قیدیوں کو دکھایا جائے یا اگر وہ شہید ہوگئے ہیں تو ان کی لاشیں دکھائی جائیں۔ یہ غلط اعداد وشمار ہیں۔ عرب قیدی مجاہدین کی اصل تعداد یہاں صرف **7** تھی جبکہ پاکستانی اور دیگر مجاہدین قیدیوں کی تعداد **14** تھی‘‘۔

سپن بولدک کے بارے میں ابوصعب نے بتایا کہ ’’یہاں کے قبائل میں امریکہ نے اپنے ’’دوستوں‘‘ کی مدد سے کروڑں ڈالر اور جدید اسلحہ تقسیم کیا تھا تاکہ انہیں طالبان کے خلاف استعمال کیا جاسکے، آسمان پر سے امریکی طیارے آگ برساتے تھے کیونکہ بزدل امریکی کبھی مجاہدین کا سامنا زمین پر نہیں کرسکتے تھے اس کام کے لئے انہوں نے رشوت کا سہارا لیا اور مقامی جرائم پیشہ گروپوں کو جدید ہتھیاروں سے لیس کرکے انہیں طیاروں کا کور دے کر یہاں

طالبان کے خلاف جنگی صورتحال پیدا کی‘‘۔

اسامہ کے ساتھی ابوصعب کے ان انکشافات کے بعد ثابت ہوگیا کہ اسامہ ان علاقوں میں سرے سے تھے ہی نہیں جہاں امریکی انہیں ڈھونڈ رہے تھے بعد میں ان کی جہاں بھی نشاندہی ہوئی وہ ان کے موبائل فونوں کی وساطت سے تھی مگر وہ یہ ذریعہ استعمال کرنے کے فوراً بعد علاقہ چھوڑ دیتے تھے فرانسیسی ذرائع کے مطابق امریکہ کے مواصلاتی ذرائع ہمہ وقت اسامہ کی کالوں کے انتظار میں چوکس کردیئے گئے تھے، اس وقت دنیا میں سیٹلائٹ فونوں کی سب سے زیادہ سروس امریکی کمپنیاں مہیا کرتی ہیں جن میں دو بڑی کمپنیاں ایریڈیم اور انمارسٹ ہیں ان کو شروع میں ہدایت تھی کہ وہ افغانستان جیسے ممالک میں سروس مہیا نہ کریں لیکن چونکہ اس قسم کی سروس کے لئے مواصلاتی سیارے استعمال ہوتے ہیں زمینی اسٹیشنوں کا نمبر بعد میں آتا ہے اس لئے اس قسم کے فون دنیا میں کہیں بھی استعمال ہوسکتے ہیں انہی سہولیات کو دیکھتے ہوئے جہادی تنظیموں کے ارکان آپس میں رابطے کے لئے انہیں استعمال کرتے ہیں، افغانستان میں بھی القاعدہ تنظیم نے انہیں آپس کے رابطوں کے لئے استعمال کیا جس کے بعد مغربی ایجنسیاں ان ذرائع کو القاعدہ کی جاسوسی کے لئے استعمال کرنے لگیں اور انہیں اس سلسلے میں اہم معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں۔ انہی ذرائع پر بھروسا کرتے ہوئے امریکیوں نے اپنے میزائلوں میں خاص قسم کے آلات نصب کئے جو سیٹلائٹ فون کی لہروں کے ساتھ ساتھ اصل فون کو نشانہ بناتے تھے لازمی بات ہے کہ اس طرح مطلوبہ شخص بھی ہلاک ہوجاتا۔ پیرس کے ذرائع کے مطابق امریکیوں نے ان خاص میزائلوں کو اپنے مفادات کے خلاف استعمال ہونے والے ذرائع کو تباہ کرنے کے لئے تخلیق کیا ہے اس میزائل کا نام **AGM-80 HARM** ہے اس قسم کے میزائل سب سے پہلے روس نے بنائے تھے جو سیٹلائٹ فونوں کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے اپنے ہدف تک پہنچتے تھے شیشان کے مجاہد رہنما جوہر دودلیف کو اسی تکنیک سے شہید کیا گیا تھا امریکیوں نے ان کے فون کے ذریعے ان کے ٹھکانے کی نشاندہی کی تھی جبکہ روسیوں نے امریکیوں کی مدد سے میزائل داغ کر اپنا مقصد پورا کیا تھا ان مواصلاتی ذرائع سے نکلنے والی مواصلاتی لہریں ایک ریلوے لائن کی مانند میزائل کو اس آخری مطلوبہ منزل تک پہنچا دیتی ہیں جہاں سے اسے استعمال کیا جارہا ہوتا ہے۔

لندن کے ذرائع کے مطابق امریکہ کی خصوصی خفیہ فورس ''ڈیلٹا فورس'' اور سی آئی اے کے ارکان اس وقت مقامی افغان لباس میں اسامہ اور ان کے رفقا کار کو تلاش کرتے رہے۔ قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص محمد خان آفریدی کے مطابق امریکہ نے جنوبی افغانستان میں جو کامیابی حاصل کی وہ جنوبی افغانستان کے پشتون قبائل کے چند اہم افراد کو ڈالروں کی بنیاد پر اسامہ اور القاعدہ کے دیگر افراد کی جاسوسی کے لئے تیار کرنا تھا مگر پشتون افراد کی بڑی تعداد بھاری ڈالروں کی رشوت کے باوجود اسامہ بن لادن اور ان کے ساتھیوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔۔۔ ذرائع کے مطابق اسامہ کی نشاندہی کے لئے رکھے گئے **25** ملین ڈالر کے انعام کی رقم نے بہت سے پشتون قبائلی سرداروں کو ایمان فروشی پر مجبور کر دیا مگر ان کے آبائی علاقوں میں عوام کے نزدیک ان کی وہ عزت نہیں رہی جو پہلے تھی ان میں حضرت علی نامی قبائلی لیڈر نے سب سے زیادہ گھناؤنا کردار ادا کیا یہ شخص پہلے شمالی اتحاد میں نائب وزیر دفاع تھا اس کی کوشش تھی کہ امریکیوں سے زیادہ سے زیادہ ڈالر حاصل کئے جا سکیں۔ ذرائع کے مطابق ان عناصر نے طالبان سے تعلق رکھنے والے کئی افراد کو جاسوسی کے لئے تیار کیا تھا مگر ان افراد نے امریکہ نواز پشتون قبائل اور امریکی ذرائع کو ہمیشہ ایسی جگہ کی نشاندہی کی جہاں اسامہ اور کے ساتھیوں کا وجود بھی محال تھا۔

امریکی سکیورٹی ادارے کے ایک اہلکار رچرڈ باؤچر کے مطابق **11** ستمبر کے واقعات کے بعد سے اب تک مختلف ذرائع سے اسامہ کے خلاف **22** ہزار شہادتیں حاصل کی گئی ہیں اور انہی بنیادوں پر اسامہ کی تلاش جاری ہے اس لئے صرف افغانستان میں **700** ایسے مقامات ہیں جہاں اسامہ کی نشاندہی کی گئی مگر اس سلسلے میں امریکی اور ان کے حواری بری طرح ناکام رہے ہیں، بعض افغان ذرائع ان کے پاکستان منتقل ہونے کا دعویٰ کرتے رہے مگر حکومت پاکستان اس کی بھرپور انداز میں تردید کر چکی ہے۔ افغانستان سے پاکستان میں داخل ہونے کے **200** راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے بذریعہ کار یا بڑی گاڑی کے ذریعے سرحد عبور کی جا سکتی ہے جبکہ ہزاروں راستے ایسے ہیں جہاں پیدل اور گھوڑے کے ذریعے سرحد عبور کی جا سکتی ہے انہی احتمالات کو سامنے رکھ کر پاکستان مخالف عناصر ان خبروں کو ہوا دے رہے ہیں۔ لندن کے ذرائع کے مطابق اسامہ کی تلاش میں اب تک تمام ذرائع کے ناکام ہونے کے بعد امریکی ایک

ال نیا جاسوس طیارہ ''گلوبل ہاک'' افغانستان لے آئے اس سے پہلے یہ طیارہ کسی مہم میں استعمال نہیں کیا گیا تھا اس میں لگے حساس آلات زمین اور فضاء میں زبردست نگرانی کا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں برطانیہ سے شائع ہونے والے ایک سیاسی عربی ہفت روزہ کے اسلام آباد میں مقیم نمائندے بکر عطیانی کے مطابق اس طیارے کو پاکستانی خفیہ ایجنسی کی مدد سے کام میں لایا جا رہا تھا جو پشتون قبائل کے ساتھ ساتھ طالبان صفوں تک رسائی رکھتی ہے، رپورٹ کے مطابق اس وقت تک اسلام آباد پوری طرح واشنگٹن کی افغانستان میں معاونت کرتا رہا۔ اس کے علاوہ خلیج میں امریکی فوجوں کے سربراہ ٹامی فرانکس کو اسلام آباد طلب کر کے ان سے اسامہ کی تلاش میں مدد حاصل کی گئی کیونکہ پاکستان نے امریکہ کی افغانستان میں جنگ کے حوالے سے اپنی سرحدوں سے باہر کسی بھی عسکری کارروائی سے معذوری ظاہر کر دی تھی، ذرائع کے مطابق سی آئی اے کے بعض سابق اہلکار افسران نے امریکی حکومت کو خبردار کیا ہے کہ اسامہ کی تلاش میں پاکستانی آئی ایس آئی پر مکمل طور پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ اس ایجنسی میں طالبان اور اسامہ کے بہت سے ہمدرد پائے جاتے ہیں۔۔۔ لندن کے ذرائع کے مطابق امریکہ کے پاس جدید ترین ٹیکنالوجی اور ڈالر ہیں جبکہ اسامہ کے پاس جغرافیے کا علم اور بے پناہ ٹھکانے اور ہمدرد ہیں اگر اس بات کو ہی تسلیم کر لیا جائے کہ اسامہ جنوبی افغانستان کے پہاڑوں میں ہیں تو انہیں تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنا۔

اسامہ اور طالبان قیادت کی تلاش اور القاعدہ کے عرب جنگجوؤں کے بارے میں اب تک دنیا میں ہر طرح کی رائے دی گئی ہے مگر اس سلسلے میں روسیوں کی رائے سے صرف نظر کرنا اس لئے ممکن نہیں کہ ان کا ان مجاہدین سے براہ راست واسطہ پڑا تھا۔ سوویت پیدل فوج کے سابق کرنل میکسم کوربو کو افغانستان میں سوویت جارحیت کے بالکل شروع میں مجاہدین کے ساتھ لڑنے کا موقع ملا ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سوویت فوج کے ان افسران میں شامل تھے جنہوں نے طویل عرصے تک افغانستان کی خوفناک جنگ لڑی تھی۔ کرنل میکسم کوربو کے مطابق انہیں **30** مارچ **1979**ء میں افغانستان کے صوبے پاکتیا میں سب سے پہلے بھیجا گیا تھا یہ علاقہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر واقع ہے کوربو کے مطابق ''یہاں پہنچ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں تاجکستان یا ازبکستان میں آ گیا

پہاڑوں کو دیکھ کر ایسا ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کئی افغانی سوویت یونین کے حق میں ہمارے ساتھ کام کرتے تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ عام افغانی جتنے جنگجو ہیں اتنے ہی انسان دوست بھی ہیں۔ یہاں افغانیوں کی بہادری کی داد نہ دینا انصاف کے مطابق نہ ہوگا بلاشبہ یہ لوگ پہاڑوں کے بیٹے ہیں ان کی قوت میں اس وقت اور اضافہ ہوگیا جب عرب اور دیگر قومیتوں کے مسلمان ان کی مدد کے لئے میدان جنگ میں کود پڑے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر بعض افغان گروپوں کو خرید کر دیگر افغانیوں کے خلاف نہ استعمال کیا جائے تو زمینی جنگ میں کتنی ہی جدید ٹیکنالوجی کیوں نہ ہو افغانوں کو زیر نہیں کیا جاسکتا''۔

کرنل میکسم کوربو کے مطابق ''یہ بات دنیا کو بہت کم معلوم ہے کہ جب عرب جنگجو افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کرنے آئے تو انہیں پہاڑی جنگ کا زیادہ تجربہ نہیں تھا ان کی بڑی تعداد اس وقت وادی پنجشیر اور پاکستانی سرحد کے قریب کے علاقوں میں تھی شروع شروع میں ان کا کردار جنگ میں محدود تھا مگر جب ان کو پہاڑی گوریلا جنگ کی خاص تربیت مل گئی تو ان سے جنگ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگیا یہ اس طریقہ جنگ میں اتنے ماہر ہوگئے کہ افغانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، مشرقی ترکستان سے کچھ مسلمان جہاد کے نظریئے سے افغانستان آئے تھے مگر عربوں کو تربیت دینے والے چینی مسلمان نہیں تھے بلکہ باقاعدہ چینی گوریلا فوج کے ماہر تھے۔ آج ان عرب جنگجوؤں کا سب سے زیادہ ریکارڈ افغانستان سے باہر چینیوں کے پاس ہے مگر اس تک رسائی ناممکنات میں سے ہے''۔

ΩΩΩ

القاعدہ کے نئے نیٹ ورک

حالات اور واقعات اپنے وقوعہ کے دوران اتنے اہم اور نتائج آشنا نہیں ہوتے جتنا بعد ے حالات اس پر صحیح روشنی ڈالتے ہیں یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں جب سوویت یونین نے جارحیت کے ذریعے قبضہ کیا تو اسے اپنے وقت کی سب سے بڑی ابتلا قرار دیا جاتا تھا سالوں پر یہ ایک طویل گوریلا جنگ کے بعد سوویت یونین کو نہ صرف افغانستان سے پسپا ہونا پڑا بلکہ زار وں کے زمانے کے مقبوضات یعنی وسطی ایشیا سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ دنیا کے ساتھ ساتھ لمان بھی اسے دینی اور لادینی قوتوں کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ تصور کرتے تھے مگر دراصل یہ وریلا جہاد اس اصل معرکے کی تمہید تھا جس کا سامنا آگے چل کر مسلمانوں کو کرنا تھا مگر اس مرکے کے دوران مسلمانوں کو جو فوائد حاصل ہوئے اس سے انکار ممکن نہیں۔ دوسو سال سے پھائی ہوئی استعماریت کے خوف کی گھٹن افغانستان کے پندرہ سالہ جہاد میں تحلیل ہوگئی، جہادی وتوں کا ایک نیا تصور تنظیمی سطح پر پہلی مرتبہ کھل کر سامنے آیا، دنیا کے مختلف حصوں میں آباد لمان مجاہدین نے افغانستان کی ''جہادی نیٹ پریکٹس'' میں خوب ہاتھ سیدھے کئے، افغان ہاد ایک ایسا تربیتی معرکہ تھا جس میں حریف ایک بڑی سپر طاقت تھی جو بے وسائل مسلمانوں و استعماریت کے طویل دور کے بعد ''آداب خود آگاہی'' سے متعارف کرا گئی، سوویت یونین ا جاتے جاتے مسلمانوں پر یہ آخری احسان ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس اصل معرکے کی ابتدا

ہوناتھی جو نہ جغرافیائی سرحدوں کا پابند تھا اور نہ معاشرتی اور معاشی مفادات کا۔اس معرکے کا ایک مورچہ مقبوضہ فلسطین ہے تو دوسرا افغانستان، شیشان ،فلپائن اور مقبوضہ کشمیر ہیں۔ یہ معرکہ آجکل جوبن پر ہے۔

افغانستان میں حالیہ امریکی فوجی کارروائیوں میں ناکامی کے بعد پینٹا گان نے امریکی زمینی کمانڈوز کو مخصوص علاقوں میں محدود کرنا شروع کیا۔جبکہ کارروائیوں کے لئے صرف فضائی قوت پر انحصار کیا جانے لگا ان کی دیکھا دیکھی برطانیہ بھی ایسے اقدامات کی جانب تیزی سے بڑھتا رہا جبکہ فرانس نے بین الاقوامی فوج میں شامل اپنے دستوں کو کسی بھی امریکی کارروائی میں حصہ لینے سے روک رکھا تاکہ آئندہ طالبان اور القاعدہ کے حملوں سے ان دستوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔اس حیران کن خبر نے امریکیوں کو تو حیران کر رکھا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں طالبان کے حامی مسلمانوں کی اکثریت بھی اس اچانک تبدیلی پر حیران ہوئی، ایسا کیوں ہوا؟ امریکی دعوے کیا ہوئے؟ کیا بے وسائل مجاہدین کو واقعی ختم کر دیا گیا تھا؟ تو پھر موجودہ کارروائیوں میں یہ مجاہدین کیا آسمان سے ٹپک پڑے تھے۔۔۔!

ان سوالوں کا جواب خلاء تک میں حکومت قائم کرنے کا دعوی کرنے والے امریکیوں کے پاس بھی نہیں ہے۔ذرائع کے مطابق طالبان اور القاعدہ کے ہاتھوں کاری زخم کھانے کے بعد امریکہ اب افغانستان میں بین الاقوامی فوج کے نام پر دوسروں کی فوجوں کو پھنسا کر خود وہاں سے نکلنے کا باعزت راستہ تلاش کر رہا ہے۔ایک عرب ذرائع کے مطابق امریکیوں کو اب سمجھ آنا شروع ہوگئی ہے کہ 1979ء میں اس نے روس کو افغانستان میں پھنسوایا تھا اب روس نے افغانستان میں ''دہشت گردی'' کے خاتمے کے لئے ہلہ شیری دے کر امریکہ کو پھنسوا کر اس سے اپنا پرانا حساب برابر کیا۔افغانستان کے کفر کش میدان تک لانے میں امریکہ کو وسطی ایشیا کے ساتھ ساتھ جارجیا میں بھی ہر طرح کی عسکری سہولتیں مہیا کی گئیں یوں امریکیوں کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا ''دہشت گردی'' کے خلاف اس جنگ میں جن علاقائی طاقتوں نے امریکہ کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملایا تھا انہوں نے اسے سہولتیں تو فراہم کر دیں مگر عملی طور جنگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا امریکہ اس زعم کے ساتھ افغانستان میں کود پڑا کہ قلیل وقت میں وہ یہاں مطلوبہ نتائج حاصل کر لے گا مگر اب اسے سارے خواب چکنا چور ہوتے محسوس ہو رہے

ہیں۔۔۔ذرائع کے مطابق بڑی تعداد میں امریکی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ بڑی تعداد میں ان امریکیوں کی لاشیں کب تک افغانستان میں محفوظ رکھی جائیں گی آخر ایک نہ ایک دن تو انہیں جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر اترنا ہے۔!

ذرائع کے مطابق فروری 2002ء کے تیسرے ہفتے میں ہی طالبان قوت نے مختلف علاقوں میں منظم ہونا شروع کر دیا تھا اس مرتبہ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل تھے جو یا تو خود یا ان کے خاندان شمالی اتحاد کی بربریت کا نشانہ بنے یوں فطرت نے طالبان کی پسپائی کے ساتھ ہی ان کی آئندہ پیش قدمی کے اسباب پیدا کر دئے تھے۔اس سارے تناظر میں آئندہ امریکہ اور اس کے حواریوں کے لئے جو سب سے زیادہ خطرناک شکل سامنے آنے والی ہے وہ القاعدہ کی نئی انتظامیہ اور نیٹ ورک ہے جو ابھی تک نظروں سے اوجھل ہے۔۔۔

افغانستان پر امریکی جارحیت سے قبل اسامہ بن لادن کے علاوہ القاعدہ کی دوسری قیادت تیزی کے ساتھ دنیا کے سامنے آئی جو بہت سے ایسے عوامل کا سبب بنی جو نہیں بنا چاہئے تھی۔امریکی بمباری میں القاعدہ کے انٹیلی جنس چیف کی شہادت کے بعد یکدم تنظیم کے سلیپنگ (خوابیدہ) نیٹ ورک کو فعال بنایا گیا جس کا دائرہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔اس بات کا انکشاف پہلے ہی ہو چکا تھا کہ القاعدہ نے مستقبل میں اپنی دوسری اور تیسری قیادت پہلے ہی تشکیل دے دی تھی مگر اس کی تفصیلات اب تک سامنے نہیں آ سکی تھیں، اب القاعدہ کی حالیہ قیادت کے بعد جو نئی قیادت تیار کی گئی ہے اس کی کچھ تفصیلات سامنے آ سکی ہیں ،ایک ایسی حالت میں جب القاعدہ کی پہلی نسل ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اسی دوران دوسری نسل نے جنم لے لیا جس کے بارے میں جدید معلوماتی ادارے اور مغربی خفیہ ایجنسیاں لاعلمی کا شکار ہیں اس سے پہلے اسامہ اور ان کے دیگر رفقاء کار کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے میں کئی سال اور کئی ملین ڈالر صرف ہوئے تھے اور اب ایک نئی ''مصیبت'' مغرب کے سر پر دوبارہ نازل ہو چکی ہے۔جس کے بارے میں انہیں زیادہ تفصیلات بھی حاصل نہیں ہیں۔ ذرائع کے مطابق نئی قیادت میں مختلف قومیتوں کے جو لوگ ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کے صرف ناموں تک ہی رسائی مشکل سے ممکن ہو سکی ان کی شخصیت اور دیگر معاملات کو جاننا انتہائی مشکل کام ہے۔

ذرائع کے مطابق اسامہ بن لادن کے داماد 33 سالہ سعد الشریف کو نئے سیٹ اپ میں اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔اس کے علاوہ جونئی ذمہ داریوں کے بارے میں پتا چلا ہے اس کے مطابق:

۔اسامہ بن لادن (سرپرست اعلیٰ)

۔ابوزبیدہ (انچارج خارجی کارروائیاں)(گرفتاری کے بعد ان کی جگہ نامعلوم شخص کو تعینات کر دیا گیا۔)

۔سلمان ابوغیث (ترجمان)

۔سعد الشریف (انچارج مالی معاملات)

۔محمد عاطف (انچارج عسکری امور)

۔ایمن الظواہری (انچارج سیاسی امور)

۔محمد صلاح (نصر فھمی نصر)(انچارج خارجی نیٹ ورک)

۔سیف العدل (سیکورٹی انچارج)

۔ابومحمد المصری (میڈیا انچارج)

خارجی نیٹ ورک کی قیادت

۔توفیق عطاش خالد (یمن)

۔ابوجعفر الجزائری (الجزائر)

۔طاہر یولداشیف (شیشان)

۔امین الحق (انڈونیشیا)

ذرائع کے مطابق افغانستان اور وسط ایشیا میں ان سرگرمیوں پر سب سے زیادہ نظر فرانسیسیوں نے رکھی ہوئی تھی۔اسی لئے فرانس اب تک علاقے کی سیاسی صورتحال میں سب سے زیادہ محتاط رہا۔فرانس کے شعبہ قومی سلامتی کے ایک رکن کے مطابق ابھی تک امریکی اور

طانوی القاعدہ کے پہلے نیٹ ورک کے جوڑ نہیں کھول سکے ہیں پھر کیسے ممکن ہوگا کہ مختصر مدت یں وہ اس کی دوسری اور پھر تیسری قیادت سے نمٹ سکیں۔فرانسیسی خفیہ ادارے کے ایک رکن ے مطابق جس وقت امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو ہم کو پورا یقین تھا کہ اب اسامہ اور ان ے ساتھی افغانستان سے زندہ نہیں نکل سکیں گے مگر اس کے برخلاف وہ ابھی تک اپنے تمام ساتھیوں سمیت افغانستان میں ہیں حالیہ کارروائیوں میں القاعدہ کے بہت سے اہم ارکان کی ضیات کھل کر سامنے آئیں اس لئے بھی اب ایسے ارکان کو سامنے لانا تھا جن کے بارے میں مومی طور پر معلومات دنیا کے پاس کم ہوں۔فرانسیسی ذرائع کے مطابق افغانستان پر حملے کے دو فتے بعد اسامہ بن لادن نے اپنے رفقاء کار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''کفر نے یہاں م پر آگ اور گولہ بارود کی بارش شروع کردی ہے اس کی وجہ سے شاید ہمیں کچھ نقصان بھی ہو مگر ہ بات یاد رکھی جائے کہ ہماری ''دوسری'' اور ''تیسری فوج'' (نیٹ ورک) ہمارے بعد عالم کفر ے لئے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوگی اور یہی ہمارے شہیدوں کے وارث ہوں گے'' اسامہ کے ا س بیان کی روشنی میں فرانسیسیوں نے سب سے پہلے القاعدہ کے دوسرے اور تیسرے نیٹ ورک کا انکشاف کیا تھا۔یہ دوسری اور تیسری فوج کا کیا مطلب ہے؟ کہاں ہے؟ اس میں کتنے ناجو شامل ہیں؟ القاعدہ کے پہلے نیٹ ورک کے منظر سے ہٹنے کے بعد کون لوگ اس کی قیادت نبھالیں گے؟ اور ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کہاں تک وسیع ہوگا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے وابات امریکیوں اور ان کے حواریوں کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہے۔مراکش کی نیشنل لورٹی کے ایک اہم رکن نے نام نہ ظاہر کرتے ہوئے لندن کے عرب ذرائع کو بتایا کہ افغانستان میں لڑنے والے القاعدہ کے ارکان کے بارے میں اسامہ کو پورا یقین تھا کہ یہاں نگ خوفناک انداز میں لڑی جائے گی کیونکہ علاقے کے بعض مسلمان ملکوں نے امریکہ کی مدد ے مجاہدین کی پیٹھوں میں خنجر گھونپ دیا تھا جس کی وجہ سے طالبان اور القاعدہ کو خاصا دھچکا لگا مر بعض حالات نے اچانک طالبان اور القاعدہ کو سنبھلنے کا موقع میسر کردیا اسے امریکیوں کی ناکامی کہا جائے یا قدرت کی جانب سے امریکیوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد۔صورتحال اس

طرح تھی کہ 11 ستمبر سے پہلے تشکیل کی جانے والی القاعدہ کی ان دونوں فوجوں یا نیٹ ورکس کو حتمی شکل دے دی گئی یہ موجودہ حالات میں القاعدہ کی بڑی کامیابی تھی اس نیٹ ورک کو اصطلاحاً دوسری اور تیسری فوج کا نام دیا گیا۔اس طرح اسامہ اور ان کے رفقاء کار نے امریکہ اور اس کے دیگر حواریوں سے لامحدود جنگ کا سامان مہیا کر دیا یہ جنگ اب دنیا میں ہر جگہ لڑی جائے گی زمان اور مکان کی قید سے آزاد۔اب ان معرکوں میں زیادہ نقصان باقاعدہ افواج کا ہوگا''۔

مراکش سے تعلق رکھنے والے ان ذرائع کے مطابق ''دوسری فوج کے بارے میں جس کا ذکر اسامہ نے اپنی تقریر میں کیا تھا اس کا نیٹ ورک زیادہ تر امریکہ اور یورپ میں پھیلا ہوا ہے مغربی انٹیلی جنس اداروں کو اس کی موجودگی کا احساس تو ہے مگر اس تک رسائی ان کے لئے تاحال مشکل امر ہے،ان لوگوں کی شخصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنا اور خفیہ جگہوں کا پتا چلانا تاحال ممکن نہیں ہے جبکہ القاعدہ کی تیسری فوج ''نیٹ ورک'' مکمل طور پر پردہ اخفاء میں ہے اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا اس کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر ورسوخ شرق الاوسط اور وسطی ایشیا تک وسیع ہے۔''مراکشی حساس ادارے کے اس اعلیٰ رکن کے مطابق :اس خوابیدہ فوج کی تیاری اسی وقت شروع ہو چکی تھی جب 1996ء میں اسامہ نے سوڈان چھوڑا تھا اس کے علاوہ بھی القاعدہ کے کئی گروپ ایسے ہیں جن کا تعلق صرف یورپ اور امریکہ کے نوجوانوں سے ہے ایک اندازے کے مطابق اس میں اس وقت ایک ہزار کے قریب وہ نوجوان تھے جو یورپ کے نومسلم تھے ان نومسلموں کو مسلمانوں کی دردناک صورتحال سے جب آگاہی ہوئی تو وہ اپنا سب کچھ اس راستے پر لٹانے پر تیار ہو گئے ان نوجوانوں کی بڑی تعداد کو افغانستان کے کیمپوں میں تربیت دی گئی ہے اس تربیت کا دورانیہ 45 دن سے تین ماہ تک ہوتا تھا اس کے بعد یہ اتنی ہی خاموشی سے واپس چلے جاتے تھے جتنی خاموشی سے آتے تھے یورپ میں واپس آکر یہ نوجوان اپنے روزمرہ کے معمولات میں اسی طرح مگن ہو جاتے جس طرح وہ پہلے ہوا کرتے تھے ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا اسی وجہ سے انہیں ''خوابیدہ نیٹ ورک'' کا نام دیا گیا ایک اندازے کے مطابق

اس نیٹ ورک میں ایسے عرب نوجوان بھی شامل ہیں جو پہلے غیر مسلم تھے مگر بعد میں اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اس قسم کی وابستگی اختیار کی۔

القاعدہ کی تیسری فوج کے بارے میں مراکش کے اس سرکاری اہلکار نے جو انکشافات کئے وہ اس طرح ہیں کہ:افغانستان پر حالیہ حملوں سے پہلے بلکہ 11 ستمبر کے واقعات سے ذرا پہلے اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کار نے اس کی تشکیل کو آخری شکل دے دی تھی تاکہ کسی بھی نامساعد حالات میں اس فوج یا نیٹ ورک کو مغربی مفادات کے خلاف استعمال کیا جاسکے ذرائع کے مطابق جوں جوں فلسطین میں اسرائیلی کارروائیوں میں تیزی آئے گی یہ نیٹ ورک اپنا کام دکھانا شروع کر دے گا اس نیٹ ورک کو تربیت کے طور پر مقبوضہ کشمیر،شیشان اور شرق الاوسط میں مختلف مہمات کے ذریعے عملی ٹریننگ مل چکی ہے ہماری اطلاع کے مطابق اس نیٹ ورک سے وابستہ القاعدہ کے ارکان کی تعداد 15 سے 20 ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ہماری اطلاع کے مطابق پاکستانی خفیہ اداروں نے ایسی رپورٹیں مرتب کی تھیں جن کے ذریعے ان رضا کاروں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے پاکستانی انٹیلی جنس کی رپورٹیں 1996ء سے لے کر اب تک کے ریکارڈ کا احاطہ کرتی ہیں کیوں کہ اسی دوران دنیا کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے رضا کار پشاور کے راستے افغانستان کے تربیتی کیمپوں میں جاتے رہے پانچ سالوں کے دوران پشاور کے راستے افغانستان جانے والے مسلمان رضا کاروں کی تعداد 20 سے 30 ہزار بتائی جا رہی ہے،جبکہ افغانستان میں امریکی جارحیت شروع ہونے کے وقت افغانستان میں القاعدہ کے صرف 7 سے 10 ہزار ارکان موجود تھے،اس رپورٹ کے بعد جو سوال سب سے زیادہ تنگ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ باقی القاعدہ کے ارکان کہاں روپوش ہیں انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا کچھ نہیں کہا جاسکتا جبکہ یہ 25 سے 30 ہزار جنگجو اپنے اصلی ملکوں میں بھی واپس نہیں آئے ہیں۔ جہاں تک مغربی ملکوں سے تعلق رکھنے والے (خوابیدہ نیٹ ورک)القاعدہ کے ارکان کا تعلق ہے ان کے بارے میں صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی افغانستان میں موجود نہیں ہے،ان کو ابھی تک مشن نہیں سونپے گئے ہیں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب یہ سویا ہوا نیٹ ورک جگایا جائے گا اس وقت مغرب میں خاصی تباہی پھیلے گی۔''

نیٹ ورک کی نئی قیادت

مراکشی ادارے کے اہم رکن کے انکشافات کے بعد اب اس نئے نیٹ ورک کے بارے میں سوالات اٹھتے ہیں کہ اس دوسری اور تیسری فوج (نیٹ ورک) کے لئے مقامی سطحوں پر کون لوگ رہنمائی کے فرائض انجام دیں گے اور اس کا کیا طریقہ کار ہوسکتا ہے؟ ذرائع کے مطابق یہ نیٹ ورک اس وقت تک فعال نہیں کیا جائے گا جب تک افغانستان میں القاعدہ کی پہلی قیادت مکمل طور پر فعال ہے۔ اس نئی قیادت اور اس سے وابستہ شخصیات کے نام اور ملکی شناخت بھی شاید فرضی ہو۔۔۔ ذرائع کے مطابق القاعدہ کا انتظامی ڈھانچہ پانچ قطعات پر مشتمل ہے جس پر اسامہ بن لادن کے پانچ مقرب ترین ساتھی فائز ہیں یہ اسامہ کے مشیروں میں بھی شمار ہوتے ہیں، ان میں سے تین نے افغانستان میں جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد اعلانیہ طور پر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اسامہ کے ساتھ مختلف ویڈیو خطابات میں اس کے ساتھ بیٹھے دکھائے گئے۔ یہ ویڈیو عرب چینل ''الجزیرۃ'' سے جاری ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں ڈاکٹر ایمن الظواہری جو القاعدہ کے سیاسی ونگ کے سربراہ ہیں اور محمد عاطف جنہیں ابو حفص المصری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ القاعدہ کی عسکری کارروائیوں کے انچارج ہیں اور سلمان ابوغیث جو میڈیا میں القاعدہ کے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ باقی افراد اپنے حساس شعبوں کی وجہ سے کبھی منظر عام پر نہیں آئے ان میں سے ایک کا تعلق فلسطین سے ہے ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ان کا نام زین العابدین محمد حسین ہے جو کہ ابوزبیدہ کے لقب سے مشہور ہیں ان کے بارے میں دعوی کیا گیا کہ انہیں پاکستان سے گرفتار کیا گیا ہے مگر یہ بات ابھی تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ یہ ابوزبیدہ وہی ہے؟ وامریکہ کو مطلوب ہے یا نہیں۔۔۔۔ ابو زبیدہ کے بارے میں مغربی ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ خارجی سرگرمیوں کے انچارج ہیں ذرائع کے مطابق ان کے پاس مغربی ممالک میں کارروائیوں کا چارج ہے یورپ سے تعلق رکھنے والے نومسلم جب عسکری تربیت کے لئے افغانستان لائے جاتے تو انہیں ابوزبیدہ کے ذریعے ہی انتظامات کرنے پڑتے تھے امریکیوں کا تو دعوی ہے کہ نیروبی اور دارالسلام کے امریکی سفارتخانوں اور 11 ستمبر کے واقعات میں ابوزبیدہ ہی ماسٹر مائنڈ تھا۔ اس میں پانچویں شخصیت 33 سالہ سعد الشریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سعودی عرب سے تعلق رکھتے ہیں یہ

اسامہ بن لادن کے رشتے میں داماد ہیں اور القاعدہ کے مالی معاملات کے نگران رہے ہیں ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات کبھی منظر عام پر نہیں آسکیں ہیں ذرائع کے مطابق سعد الشریف القاعدہ کے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے اثاثوں کی نگرانی بھی کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کے کئی نام اور شہریتیں ہیں مثلاً مصطفیٰ محمد احمد، مصطفیٰ احمد الھوسوی اور ابومحمد وغیرہ۔

ابوزبیدہ اور سعد الشریف دونوں کو القاعدہ کی پہلی نسل میں شمار کیا جاتا ہے مگر ان کی سرگرمیات شروع سے صیغہ راز میں رہی ہیں اس لئے ان کو دوسرے اور تیسرے نیٹ ورک تک لانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، فرانسیسی انٹیلی جنس کے مطابق ابوزبیدہ ایک وقت میں 37 پاسپورٹ کا حامل رہا ہے جس میں کئی عرب، ایشیائی اور یورپی ملکوں کی شہریتیں شامل ہیں مگر آج تک اس کی شخصیت کا کوئی بھی مغربی ملک احاطہ نہیں کرسکا ہے۔ سعد الشریف کے بارے میں مغربی خفیہ ادارے بہت تھوڑا علم رکھتے ہیں ذرائع کے مطابق جب القاعدہ کے کچھ اثاثوں کی نشاندہی کرکے عالمی سطح پر اسے منجمد کرنے کے منصوبے بنائے جارہے تھے اس وقت سعد الشریف قبل از وقت ان اثاثوں کی بڑی تعداد محفوظ مقامات پر منتقل کرچکا تھا، مراکش سے تعلق رکھنے والے پیرس کے ذرائع کے مطابق سعد الشرف ایک چلتا پھرتا کمپیوٹر ہے جس میں عالمی سطح پر کاروباری دنیا کا تمام ڈیٹا محفوظ ہے۔ سعد الشریف کو معلوم ہے کہ کس طرح دنیا بھر میں سرمائے کو خفیہ بنکاری کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے تاحال مغربی انٹیلی جنس ایجنسیاں اس اقتصادی نیٹ ورک کو پکڑنے یا کم از کم اس کے راستوں کو جاننے کے بارے میں مکمل طور پر عاجز ہیں۔

حلقہ ثانی

مندرجہ بالا پانچ اعلیٰ قائدین کے تحت جو حلقہ کام کرتا ہے اسے حلقہ ثانی کہا جاتا ہے یہ حلقہ اپنے اپنے شعبے کے پہلے پانچ ارکان کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً ایمن الظواہری کے سیاسی شعبے میں سب سے پہلے جس کا نمبر آتا ہے وہ میڈیا انچارج ابومحمد المصری ہے اس کے بارے میں اسلامی ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ القاعدہ کی جانب سے جاری ہونے والے اعلامات کو دنیا بھر میں متعلقہ افراد تک بھیجنے کا ذمہ دار ہے القاعدہ کی جانب سے شائع کی جانے والی کتاب ''موسوعۃ الجہاد'' جو پانچ جلدوں میں ہے کو دنیا بھر میں ابومحمد نے ہی پھیلایا

محمد عاطفؒ کے عسکری شعبے میں نائب کے طور پر ایک اور مصری کا نام سامنے آتا ہے جسے سیف العدل کہا جاتا ہے یہ مصری فوج کا سابق آفیسر ہے جس کا حقیقی نام محمد مکاوی ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ القاعدہ کی اعلیٰ قیادت کی سکیورٹی کے انتظامات بھی کرتے ہیں ذرائع کے مطابق اب سیف العدل کو محمد عاطف کی شہادت کے بعد ان کی جگہ تعینات کیا گیا ہے۔

خارجی سرمایہ کاری ونگ

اس شعبے کے انچارج سعد الشریف ہیں نگران کے نائب کے طور پر جس کا نام آتا ہے وہ افغان العرب کے سعودی نژاد نصر فہمی نصر ہیں جن کو محمد صلاح کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا خیال ہے کہ یہ خارجی سطح پر متعلقہ افراد کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں یہ سعد الشریف اور ابو زبیدہ کے درمیان رابطے کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔ابو زبیدہ کے تحت خارجی کارروائیوں کے جو چار افراد کام کرتے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: توفیق عطاش خالد ان کا تعلق یمن سے ہے امریکیوں کے مطابق عدن کی بندرگاہ پر امریکی بحری جنگی جہاز کول کو نشانہ بنانے کا منصوبہ انہوں نے ہی ترتیب دیا تھا،ابو جعفر ان کا اصل نام عمر شعبانی ہے ان کا تعلق الجزائر سے ہے ان کے بارے میں الزام لگایا گیا کہ پشاور میں موجود ''بیت الجزائرین'' کے نام سے قائم مرکز کے ذریعے انہوں نے یورپی رضا کاروں کو افغانستان میں تربیت کے بلوایا،اس کے بعد طاہر یولداشیف ہیں جن کا تعلق شیشان سے ہے اور امین الحق انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔آخری دو افراد کا ریکارڈ شاید امریکیوں اور دیگر مغربی ممالک کے خفیہ اداروں کے پاس بھی نہ ہو جو خوابیدہ نیٹ ورک کے انچارج ہیں اور انہوں نے وسطی ایشیا میں مسلمان نوجوانوں میں جہاد کی روح پھونکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

امریکیوں کا خیال ہے کہ اگر اسامہ کو گرفتار کرلیا جائے یا کسی معرکے میں قتل کردیا جائے تو شاید القاعدہ کا شیرازہ محض امارت سنبھالنے کے جھگڑے میں ہی بکھر جائے مگر فرانسیسیوں کا کہنا ہے کہ ایسا اس لئے ناممکن ہے کیونکہ نظریات کی بنیاد پر قائم تنظیمی ڈھانچوں پر وراثت کے جھگڑے اثر انداز نہیں ہوتے۔امریکی بہت جلد خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف افغان کٹھ پتلی انتظامیہ کے انٹیلی جنس چیف جنرل نعت اللہ جلیلی آخری

وقت تک سب سے زیادہ خدشات پاکستان سے رہے۔اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان تمام کا تمام اب بھی مجاہدین کی پشت پناہی کررہا ہے آئی ایس آئی افغانستان میں مجاہدین کو راستے دکھا رہی ہے،پاکستان کی طاقتور مجاہدین نواز لابی افغانستان میں دوبارہ طالبان کو منظم کرنے میں فعال کردار ادا کررہی ہے۔افغان انٹیلی جنس چیف کے اس بیان سے قطع نظر اس وقت مجاہدین کا مسئلہ صرف افغانستان یا پاکستان تک محدود نہیں ہے باقی دنیا کے حصوں میں مجاہدین کی فعال سرگرمیوں کو کون مزید فعال کررہا ہے؟ اصل قوت ایمان کی ہے اسلامی دنیا کا عوامی طبقہ ان مجاہدین کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھا، ہے اور رہے گا۔

عمر المختار سے ملا عمر تک

افغانستان کی جنگ یا مجاہدین اسلام کی جانب سے کیا جانے والا جہاد کوئی حرف آخر نہیں تھا' یہ صورتحال اسلامی تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے۔ مجاہد اور مجاہدین لیڈر اپنے اپنے وقت اور علاقوں میں ظاہر ہوئے' اللہ کے راستے میں اپنا کردار ادا کیا اور حق ایمان ادا کر کے اپنے رب سے جا ملے۔ جس میں دنیا انہیں کامیاب یا ناکام قرار دیتی رہی مگر یہ سب آراء امکانات کی روشنی میں تھیں جن سے اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والے ماوراء ہوتے ہیں۔ نتائج کی بنیاد پر کامیابی اور ناکامی کے تخمینے لگانے والے کچھ بھی نتائج اخذ کریں معرفت کی اس گرد کو نہیں پہنچ سکتے جو ان مجاہدین اسلام کے علم یقین کی اصل الاصول ہوتی ہے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ مجاہدین یا ان کے رہنما اگر امکانات کی روشنی میں جدوجہد کا آغاز کرتے تو انہیں ہر طرف ناکامیوں ہی کا سامنا ہوتا مگر معاملہ اس سے الٹ رہا ہے۔ جو لوگ ان حقائق کو جذباتی باتوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ سراسر امکانات کے اسیر ہوتے ہیں اور امکانات کی محدود دنیا سے باہر نکل کر حالات کو پلٹ دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہی صورتحال افغانستان کے طالبان کی ہے۔ امکانات کی روشنی میں ان کے عزائم کا تجزیہ کیا جاتا تو شاید آج وہ دنیا کی بے وقوف ترین انتظامیہ کہلاتی جو ایسے دشمن کو دعوت جارحیت دے رہی تھی جو امکانات کی دنیا میں ہر طرح کی جدید ٹیکنالوجی اور مادی وسائل سے بہرہ ور

KURF

ہے۔ مگر جب اس سلسلے میں تاریخ سے رجوع کیا جائے تو ایسے بے شمار "بے وقوفوں" سے واسطہ پڑتا ہے جنہیں امکانات کی روشنی میں اس وقت ناکام قرار دینے والی دنیا چند برسوں بعد کامیاب قرار دے دیتی ہے۔ آج وہ اسلامی ہیرو صرف تاریخ نہیں بلکہ درخشاں تاریخ کا حصہ ہیں۔ حق و باطل کے ان معرکوں میں ہر دو فریق وسائل کے لحاظ سے مختلف رہے ہیں ایک طرف جدید آلات حرب اور بے پناہ مالی وسائل تو دوسری جانب امکانات کے اسیر "اپنوں" کی غداریاں اور وسائل کا قحط۔

طالبان کے جہاد کا اگر کسی تاریخی واقعے سے تقابل کیا جا سکتا ہے تو وہ گزشتہ صدی میں لیبیا کی جدوجہد آزادی ہے۔ اس جدوجہد حریت کے سالار اول عمر المختار اور طالبان کے امیر عمر مجاہد کے درمیان نہ صرف ناموں کی مماثلت نظر آئے گی بلکہ مقاصد' اہداف' طریقہ جنگ اور ان کے خلاف ہونے والی سازشیں بھی ایک ہی طرح کا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ صرف زمانے اور علاقوں میں فرق ہے باقی حکایت ایک ہی طرح کی نظر آتی ہے۔ جس طرح افغانستان کو امریکی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا اس طرح شمالی افریقہ کے ملک لیبیا کو بیسویں صدی کے اوائل میں مسولینی کی قیادت میں اٹلی کی جارحیت کا سامنا تھا جسے اس وقت جرمنی اور برطانیہ کے بعد دوسری عسکری قوت تصور کیا جاتا تھا۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان صرف بحیرہ روم حائل تھا۔

اکتوبر **1911**ء میں اٹلی نے لیبیا پر جارحیت کے ارادے سے فوج کشی کی تا کہ یہاں کے پسماندہ اور بے وسائل مسلمانوں کو اطالوی کالونی بنایا جا سکے مگر غیر متوقع طور پر لیبیا کے مسلمانوں نے غیر منظم انداز میں اٹلی کے ناجائز قبضے کے خلاف مسلح مزاحمت شروع کر دی مگر ان کے ہتھیار فرسودہ بندوقوں تک محدود تھے اس لئے اطالوی افواج کو لیبیا کے بڑے شہروں طرابلس' بن غازی' میسورۃ اور وانا پر قبضہ کرنے میں زیادہ مشکلات پیش نہ آئیں۔ اطالوی فوج اپنے وقت کے جدید ترین ہتھیاروں جنگی بحری جہازوں ٹینکوں توپوں سے لیس تھی۔ ابتدا میں اطالوی فوج اور مجاہدین اسلام کے درمیان جو بڑی جنگیں لڑی گئیں ان میں **23** اکتوبر **1911**ء کو طرابلس کے قریب المانی میں' مارچ **1912**ء میں میسورۃ کے قریب الرمیلہ اور بن غازی کے قریب الفاہت کے معرکے شامل تھے۔ باقی جنگیں پہاڑوں' صحرا اور لیبیا کے دیہی علاقوں میں ہوئیں۔ ایک بڑی جنگ اپریل **1915**ء میں

www.kurfku.blogspot.com

ہوئی جس میں مجاہدین کے ہاتھوں ہزاروں اطالوی فوجی ہلاک ہوئے جبکہ ان کا جنگی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ اس جہاد مسلسل کے باوجود اطالوی فوجیں بے پناہ جنگی وسائل کی بنیاد پر لیبیا کے بڑے حصے پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ تاہم تمام لیبیا ان کے آگے سرنگوں نہ ہو سکا کیونکہ مجاہدین اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں منتقل ہو چکے تھے جہاں سے وہ اطالوی فوجوں کے خلاف جنگی منصوبہ بندی کرتے اور جہاد کا میدان گرم رہتا۔

لیبیا کے جہاد کے دوران شروع میں جو جہادی لیڈر سامنے آئے ان میں عمر المختار، رمضان السواحلی، محمد فرحت عزاوی، الفیصل بو عم، سلمان البیرونی، اور سلیمہ النافح شامل تھے۔ مگر عمر المختار کا نام ان تمام جہادی لیڈروں میں سب سے نمایاں رہا۔ عمر المختار اور ملا عمر میں ایک نمایاں مماثلت پیشوں کے لحاظ سے بھی ہے۔ جہاد سے پہلے دونوں کا پس منظر تعلیمی ہے۔ دونوں اپنے اپنے آبائی علاقوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ عمر المختار کو اطالوی جارحیت نے تدریس کا سلسلہ ترک کر کے جہاد کی کمان کرنے پر مجبور کیا تو ملا عمر مجاہد کو داخلی انتشار نے تدریس کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور کیا۔ عمر المختار نے مجاہدین کو منظم کر کے شمال مشرق لیبیا میں اپنے آبائی علاقے ''الجبل الاخضر'' کو مرکز بنایا۔ اس طرح ملا عمر نے افغان مجاہدین کو طالبان کے پلیٹ فارم پر منظم کر کے آبائی علاقے ''قندھار'' کو جدوجہد کا مرکز بنایا۔

جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد اطالیہ نے لیبیا پر جارحانہ حملوں میں شدت پیدا کر دی تھی۔ اس لئے تمام مجاہد تنظیمیں عمر المختار کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی تھیں۔

عمر المختار کی جہادی سرگرمیوں سے جب اطالویوں کو اندازہ ہوا کہ وہ بے وسیلہ مجاہدین کے سامنے جلد ہار جائیں گے اور لیبیا ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا تو انہوں نے ظالمانہ کارروائیوں میں مشہور ایک حکومتی شخصیت بیڈولیو کو لیبیا کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس نے نہ صرف مجاہدین کے خلاف کارروائیاں تیز کر دیں بلکہ ان معصوم لیبیائی مسلمانوں کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جانے لگا جو شہروں اور دیہات میں رہتے تھے۔ ان پر مجاہدین کی اعانت کرنے کا الزام عائد کیا جاتا۔ اطالوی فاشسٹ لیڈر میسولینی کو یقین تھا کہ بیڈولیو کے سخت اقدامات لیبیائی عوام کی تحریک جہاد کو کچل دیں گے مگر یہ اس کی خام خیالی تھی کیونکہ جوں جوں اطالویوں کے مظالم بڑھتے گئے مجاہدین کی جہادی سرگرمیاں بھی اسی طرح شدید ہوتی چلی گئیں۔ اس پر میسولینی نے

KURF

www.facebook.com/kurf.ku

بیڈولیو کی جگہ دوسرا جنرل لیبیا کا گورنر بنا کر بھیجا جنرل رڈولف گراسیانی بیڈولیو سے بھی زیادہ خطرناک نکلا۔ لیبیا آنے سے پہلے گراسیانی اور میسولینی کی ایک تفصیلی ملاقات ہوئی جس میں میسولینی نے اسے نصیحت کی کہ وہ عمر المختار کو صرف اس لئے خطرناک تصور کرے کہ وہ ایک استاد بھی ہے جس کے نظریات اور افکار نے لیبیا کے عوام کو اطالویوں کے خلاف سخت مزاحمت پر اکسایا ہوا ہے۔ جنرل گراسیانی کو میسولینی کی جانب سے ہدایت تھی کہ ہر صورت میں لیبیا پر قبضہ مکمل کیا جائے۔ لیبیا آنے سے پہلے جنرل گراسیانی چھٹیاں گذارنے سوئٹزرلینڈ کے خوبصورت مقام ''مورج'' گیا جہاں اس نے لیبیا پر نئے ہولناک حملے کی منصوبہ بندی کی۔

عمر المختار کے خلاف نئی جنگ کا آغاز کرتے ہوئے اطالوی فاشسٹ لیڈر میسولینی نے آس پاس کے اسلامی ملکوں اور لیبیا کے اندر کئی عناصر کو خطرناک نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے اپنے ''ماٹو'' کا اعلان کیا جو اس طرح تھا کہ ''اگر آپ میرے ساتھ نہیں تو پھر میرے خلاف ہیں''۔ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ آس پاس کی اسلامی ریاستیں عمر المختار اور ان کے مجاہدین کو اس نئی جنگ کے دوران کسی قسم کی اعانت مہیا نہ کر سکیں۔ بالکل یہی طریقہ واردات موجودہ دور کی فاشسٹ ریاست امریکہ کے صدر بش نے طالبان کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے اختیار کیا۔ بش کا قول تھا ''یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے ساتھ''۔ عمر المختار نے جب اطالوی استعماریت کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو ان کی صفوں میں لیبیا کے مجاہدین کے علاوہ مصر، تیونس، الجزائر، مراکش اور سوڈان کے کچھ مسلمان بھی جہاد میں حصہ لینے کے لئے شامل ہو چکے تھے۔ یہی صورتحال افغان جہاد کی رہی جس کے دوران تمام عالم اسلام سے مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں نے اللہ کی رضا کی خاطر جہاد میں حصہ لیا۔ لیبیا کی جہادی تحریک کو دبانے کیلئے میسولینی نے مصر، تیونس اور مراکش کو دھمکیاں دیں تاکہ وہاں کے مسلمان لیبیا کی جہادی تحریک میں کسی قسم کی معاونت نہ کر سکیں۔ یہی منظر افغانستان میں دہرایا گیا۔ جب فاشسٹ بش نے افغانستان پر جارحیت کا اعلان کیا تو تمام دنیا بالخصوص افغانستان کے پڑوسی ملکوں کو اس نوع کی دھمکی دی گئی تاکہ طالبان اور القاعدہ کے ارکان کو کسی قسم کی مدد نہ دی جا سکے۔

جنرل گراسیانی نے جب لیبیا میں قدم رکھا تو لیبیا [illegible]

سرحدوں پر فوجی گشت شروع کروا دیا گیا۔ یہی حال افغانستان کی موجودہ جنگ کے دوران رہا جب افغانستان سے متصل ملکوں کی سرحدیں سیل کردی گئیں۔ پاکستان' تاجکستان اور ازبکستان کی سرحدوں پر ان ممالک نے امریکی خوف کی بنا پر فوجی گشت شروع کروا دیا تاکہ مجاہدین کو کسی قسم کی اعانت نہ مل سکے۔ جنرل گراسیانی نے مجاہدین کے اکثریتی علاقوں میں 300 کلومیٹر لمبی باڑ بھی نصب کرائی جو دو میٹر اونچی اور 3 میٹر چوڑی تھی۔ یہ باڑ بروایات سلمان پورٹ سے جنوب مشرقی لیبیا میں الجضبوب تک نصب کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مجاہدین کی سرکوبی کے لئے مقامی لوگوں میں ایسے عناصر تلاش کئے جانے لگے جو عمر المختار سے سیاسی اختلافات رکھتے ہوں' ان میں عمر المختار کے دوست بھی شامل تھے۔ یہی صورتحال ہمیں افغانستان میں شمالی اتحاد کی شکل میں نظر آتی ہے۔ طالبان مخالف مقامی عناصر وہی کارروائی کر رہے تھے جو عمر المختار کے مقامی مخالف اٹلی سے رقم لے کر کر رہے تھے۔

لیبیا کی جہادی تحریک کچلنے کیلئے دوسرا پلان ایسے وسیع وعریض قیدی کیمپوں کا قیام تھا جہاں لیبیا کے عوام کو محبوس رکھا جاتا تھا۔ یہ کیمپ اپنی وسعت میں کسی طور بھی بڑے قصبوں اور شہروں سے کم نہیں تھے۔ ایسا کرنے کی سب سے بڑی وجہ عام شہریوں اور مجاہدین کے درمیان رابطوں کو توڑنا تھا کیونکہ یہی عوام اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر مجاہدین کو راشن فراہم کرتے تھے۔

یہی صورتحال افغانستان میں اس وقت سامنے آئی جب افغانستان کے شہروں پر امریکہ نے ظالمانہ بمباری کر کے شہریوں کو مہاجر کیمپوں میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیا تاکہ طالبان انتظامیہ اور افغان عوام کے درمیان رابطہ منقطع کیا جا سکے اور انہیں کسی قسم کی عوامی مدد حاصل نہ ہو سکے۔

جنرل گراسیانی نے جو بڑے قیدی کیمپ (Concentration Camp) قائم کئے ان میں الاغالیہ المغرون' سکوں اور الابیار کے مقام پر قائم ہونے والے کیمپ زیادہ مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ 1929ء تک الجبل الاخضر' مرتفعات الظاہر' بنینا' عبدالحضیف میں جنوب کی جانب سے صحراء حقیف تک قیدی کیمپوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ ان میں قیدی ہر شخص یا قبائلی سردار کا کوئی بیٹا' بھائی یا کوئی اور رشتہ دار مجاہدین کی صفوں میں شامل تھا۔ اس جرم میں لیبیا کے مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر کیمپوں میں منتقل ہو جائیں ان کیمپوں میں

آئے دن مسلمانوں کو نہ صرف پھانسی کی سزائیں دی جاتیں بلکہ بدترین تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔ بھوک اور بیماریوں سے مرنے والے مسلمان اس کے علاوہ تھے۔ لیبین مورخ علی الطیب کے بقول نومبر 1930ء تک ان کیمپوں کا یہ حال تھا کہ ہر کیمپ میں اوسطاً روزانہ 17 مسلمان شدید بیماری اور بھوک سے ہلاک ہو جاتے تھے۔ یہی حال افغانستان کے کیمپوں کا تھا۔ یہاں قلعہ جنگی اور قندوز کے کیمپوں میں جو کچھ ہوا وہ محتاج بیان نہیں۔

اس دوران مجاہدین لیبیا پہاڑوں اور صحراء میں جہاد جاری رکھے ہوئے تھے مگر 1931ء تک ان کا اسلحہ اور راشن انتہائی قلیل رہ گیا باہر سے کسی قسم کی مدد ملنا محال تھا کیونکہ برطانوی اور فرانسیسی سامراجیوں کے زیراثر اسلامی ملکوں کی مقامی انتظامیہ سرحدیں سیل کرچکی تھی۔ عمر المختار کی عمر 80 سال ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ جہاد کا راستہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے بہت سے مخلص دوستوں نے انہیں اب ملک چھوڑ دینے کا مشورہ دیا مگر مجاہدین کے ایک اجتماع میں انہوں نے جدوجہد کا راستہ نہ چھوڑنے کے عزم کا اظہار کیا۔ جس پر انہیں تاریخ میں ''صحرا کا شیر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اطالوی فاشسٹ حکومت نے عمر المختار کے بہت سے ساتھیوں کو خریدنے کی کوشش کی۔ کچھ حوصلہ ہار کر کنارہ کش ہو گئے مگر بڑی تعداد نے حق کا راستہ آخری دم تک اختیار کئے رکھا۔ یہی کارروائی فاشسٹ امریکی حکومت نے افغانستان میں کی۔ امریکہ کی جانب سے ملا عمر کے ساتھیوں کو خریدنے کی کوشش کی گئی مگر ان کے بہت سے ساتھی آخری وقت تک عہد وفا نبھاتے رہے۔ انہوں نے جان ہار دی مگر زبان نہ ہاری۔

لیبیا کی جہادی تحریک کے دوران جب مجاہدین کا اسلحہ اور خوراک ختم ہونے لگی تو دست بدست جنگ کا مرحلہ آ گیا۔ جدید جنگی ٹیکنالوجی سے آراستہ اطالوی فوج نے بہت سے مجاہدین کو گرفتار کر کے اٹلی پہنچائے تاکہ ان سے تفتیش کر کے عمر المختار اور ان کے ساتھیوں کے ٹھکانوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں۔ یہی حال اب طالبان کے بہت سے لیڈروں اور سپاہیوں کا تھا جنہیں گرفتار کر کے امریکہ کیوبا کے پاس قیدی کیمپ میں پہنچا رہا تھا جو کیوبا کے ایک جزیرے میں قائم ہے۔ بہت سے قیدی امریکی بحری جہازوں میں قید تھے۔ تاکہ ان سے اہم معلومات حاصل کی جا سکیں۔ پڑوسی ملکوں میں فرار ہونے والے مجاہدین کو وہاں کی حامی انتظامیہ کے ذریعے گرفتار کیا جا رہا تھا۔ یہی وہ کام [illegible]

تھی۔

ستمبر **1931**ء کو ایک معرکے کے دوران بطلِ اسلام عمر المختار کو اطالویوں نے گرفتار کر لیا۔ جنرل گراسیانی نے عمر المختار کو ایک ملاقات میں جہاد چھوڑنے کا اعلان کرنے کیلئے مجبور کیا۔ بدلے میں قاہرہ میں ایک عالیشان گھر اور بھاری پینشن کی پیشکش کی گئی مگر عمر المختار نے حقارت سے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور اطالویوں کو جارح ثابت کر دیا جس پر جنرل گراسیانی نے اپنی میز کی دراز سے رومی شہنشاہ جولیس سیزر کے زمانے کا ایک سکہ نکال کر عمر المختار کے سامنے رکھ دیا جو لیبیا کے صحرا سے دریافت ہوا تھا۔ جنرل گراسیانی نے عمر المختار سے کہا ''لیبیا میں ہمارے تاریخی وجود کا یہ ثبوت کم ہے؟'' عمر المختار نے جواب دیا۔ ''ہم نے بہت سے استعماروں کے سکے اپنی ریت میں دفن کر دیئے ہیں''۔ جنرل گراسیانی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ عمر المختار اپنی مجاہدانہ روش سے نہ ٹلیں گے تو انہیں اٹلی کی فوجی عدالت کے سامنے مقدمے کا سامنا کرنے کیلئے پیش کر دیا گیا۔ ایسی ہی ترغیبات ملا عمر اور ان کی انتظامیہ کو دی جاتی رہی ہیں کہ وہ مجاہدانہ روش ترک کریں، اسامہ کو امریکہ کے حوالے کریں اور علاقے میں امریکی مفادات کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ انکار پر افغانستان کو بدترین جارحیت کا نشانہ بنا دیا گیا۔

عمر المختار پر جو الزامات عائد کئے گئے وہ اس طرح تھے۔

☆......**30** سال تک اٹلی کے خلاف باغیوں کی قیادت کی۔

☆......ہزاروں اطالوی فوجیوں کو جنگ کے دوران ہلاک کیا گیا۔

☆......سینکڑوں اطالوی قیدیوں کو تشدد کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا۔

☆......اٹلی کی حکومت کی جانب سے امن قائم کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنایا گیا۔

عمر المختار نے اس نام نہاد فوجی عدالت میں قیدیوں کے قتل کے الزام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا ''ہمارا دین قیدیوں سے حسن سلوک کا سبق دیتا ہے۔ ہم میدان جنگ میں خوفناک دشمن اور قیدیوں کے لئے نرم خو ہوتے ہیں''۔ مگر طاقت کے نشے میں بدمست فاشسٹ اطالوی حکومت کو یہ اخلاقی باتیں کیسے سمجھ آ سکتی تھیں۔ عمر المختار کو لیبیا کے عوام کے سامنے سرعام پھانسی دینے کا حکم سنایا گیا۔ **16** ستمبر **1931**ء کو اس بطل اسلام کو لیبیا میں سلوک شہر میں ان کے ہم وطنوں کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔ اس بات کا بھی خیال نہ رکھا

گیا کہ عمر المختار کی عمر **80** سال سے زیادہ ہے اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق اس سلسلے میں کیا تقاضے ہیں۔

یہی معاملہ ملا عمر اور طالبان کے افغانستان پر ظلم ڈھاتے ہوئے اختیار کیا گیا۔ امریکہ اور اس کی شیطانی تنظیم ''اقوام متحدہ'' نے طالبان پر ایسے الزامات عائد کئے جن کے ثبوت وہ ابھی تک پیش کرنے سے قاصر ہیں کسی ملک میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ وہ امریکہ کو اخلاقی تقاضے ملحوظ رکھنے کی جانب مائل کر سکے۔ عمر المختار کی پھانسی کے بعد بھی مجاہدین اسلام پہاڑوں اور صحراؤں میں بے سرو سامانی کی حالت میں جدوجہد کرتے رہے اور عمر المختار کی شہادت کے بیس سال بعد لیبیا آزاد ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کے ساتھ اٹلی کو بھی شکست ہوئی۔ اس دوران لیبیا کے اندر مجاہدین نے اطالوی فوجوں کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران مصر سے برطانوی فوجوں نے پیش قدمی کر کے لیبیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ کے بعد اقوام متحدہ نے لیبیا کو برطانیہ کا زیر حفاظت علاقہ قرار دے دیا اور آخر کار **24** دسمبر **1951**ء کو لیبیا کو باقاعدہ آزادی حاصل ہوئی۔

کیا ملا عمر کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد جدوجہد کا راستہ مسدود ہو جائے گا؟ کیا عمر المختار کے بعد ان کے مجاہدین کی طرح افغانستان کے مجاہدین امریکہ کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے؟ ملک اور کو فاشسٹ امریکہ وقتی طور پر طاقت کے بل بوتے پر دبا سکتا ہے مگر افکار اور جذبے کسی ٹیکنالوجی کی زد میں نہیں آتے۔

ΩΩΩ

امیر الخطاب: جزیرۃ العرب سے قفقاز تک
جہاد اور شہادت کا سفر

شیشان کے جہاد کا ایک دیو مالائی کردار امیر الخطاب کو سازش کے ذریعے زہر دیکر شہید کر دیا گیا امیر الخطاب کو شیشان میں لڑنے والے عرب مجاہدین کا امیر کہا جاتا تھا۔ شیشان میں جہاد کے دو بڑے مرحلے آئے پہلا مرحلہ شیشان کے مجاہد اعظم جوہر دودائیف کی قیادت میں لڑا گیا جس میں روسیوں کو بے پناہ جانی نقصان اٹھانا پڑا مگر امریکہ کی مدد سے روس نے اس مجاہد اعظم کے موبائل فون کو ٹریس کر کے جگہ کا پتا چلایا اور زبردست بمباری کر کے انہیں شہید کر دیا گیا۔ دوسرا مرحلے کے ہیرو شیشن مجاہد شامل بسایوف اور ان کے دینی بھائی عرب مجاہد امیر الخطاب تھے اس مرحلے میں روس کی بڑی تعداد میں فوج بھاری جنگی ساز وسامان کے ساتھ شیشان میں داخل ہوئی تھی انہیں چند گھنٹوں میں دارالحکومت گروزنی پر قبضہ کرنا تھا، تمام علاقے میں مجاہدین پھیل چکے تھے گروزنی کا دفاع امیر الخطاب اور ان کے زیر نگرانی لڑنے والے عرب مجاہدین کے پاس تھا، انہوں نے روس کی بڑی فوج کو دارالحکومت میں داخل ہونے دیا اس کے بعد روسیوں پر مجاہدین کے گوریلا حملوں کی وہ قیامت ٹوٹی تھی کہ گروزنی میں داخل ہونے والے اٹھارہ ہزار روسی فوجیوں میں سے صرف چوبیس سو فوجی جان بچا کر واپس بھاگنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ مجاہدین کی کارروائیاں ابھی جاری تھیں کہ دشمن نے سازش کے ذریعے اس مجاہد کو

میں زہر دے کر شہید کر دیا جو ہزاروں میل دور سے دنیا کے عیش و آرام ٹھکرا کر صرف اللہ کے دین کی سربلندی اور اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے قفقاز کے دیو مالائی پہاڑوں کے اس طرف اترا تھا۔

امیر الخطاب کون ہیں؟ کہاں سے آئے؟ شیشان کے میدان جہاد کا انہوں نے انتخاب کیوں کیا؟ ان سوالات کا جواب بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ امیر الخطاب کا اصل نام سامر صالح عبداللہ السویلم ہے آپ شمالی الجزیرہ کے شہر عرعر میں **26/1/1389**ھ مطابق **1965**ء میں پیدا ہوئے اپنے چھ بہن بھائیوں میں ان کا نمبر پانچواں تھا۔ امیر الخطاب کا ابتدائی تعلیمی ریکارڈ اوسط درجے کا تھا مگر اعلی تعلیمی مرحلے میں ان کا معیار اچانک بڑھ گیا انہوں نے سائنس کے شعبے میں **94** فیصد نمبر حاصل کئے اور پیٹرولیم انجینئرنگ میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اس کے بعد انہوں نے اپنا پریکٹیکل تھیسس مکمل کرنے کے لئے امریکہ کی ایک آئل کمپنی **CBC** میں کام شروع کر دیا۔ شیشان آنے کے بعد چند سال پہلے انہوں نے قریہ کرمخائی کی ایک انتہائی دین دار داغستانی خاتون سے شادی کی اس سے ان کی دو بیٹیاں سارہ، ساجدہ اور ایک بیٹا صالح پیدا ہوئے۔

امیر الخطاب کی پہلے کنیت ''بوحمزہ'' تھی جو آپ ﷺ کے چچا اور سید الشہداء حمزہؓ بن عبدالمطلب کی محبت کی وجہ سے تھی اس کے بعد ان کی کنیت ''حمزہ الخطاب'' ہوئی اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ان پر خلیفہ ثانی عمرؓ بن الخطاب کی شخصیت کا خاص اثر تھا۔ سالم (الخطاب) اوائل شباب سے ہی اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انتہائی دین دار واقع ہوئے تھے اور خاندان اور احباب میں ''اپنی نماز کا محافظ'' مشہور تھے۔

ان کے جہاد میں آنے کے پس منظر کے بارے میں ان کے خاندان کے افراد کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں دو عوامل خاصے بنیادی رہے ہیں ایک مجاہد عبداللہ عزام شہید کی شخصیت اور دوسری انگریزی فلم عمر المختار وہ اس میں مسلمانوں کو جہاد کرتے اور داد شجاعت دیتے ہوئے دیکھتے اور متاثر ہوتے، اس کے علاوہ طالب علمی کے زمانے میں مجاہدین کی خبریں اکٹھی کرنے کا شوق ہوا، دو مجاہدوں کی شہادت اسے میدان جہاد میں لے آئی ایک عبداللہ عزام شہید اور دوسرے تمیم العدنانی ان کی شہادت کی خبر جب سالم (الخطاب) تک پہنچی تو وہ امریکی آئل کمپنی

میں خدمات انجام دے رہے تھے فوراً ایک بڑا فیصلہ کیا امریکن آئل کمپنی کی اعلیٰ ڈگری جو پی ایچ ڈی کے برابر تصور ہوتی ہے صرف چھ ماہ کے فاصلے پر تھی لیکن سالم (الخطاب) یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی حقیقی منزل کی جانب لوٹ آئے یہ افغانستان کا میدان جہاد تھا یہ آسان فیصلہ نہیں تھا بلکہ خاندان کے افراد نے اسے ایسا نہ کرنے پر مجبور کیا پھر کہا گیا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلیں مگر وہ پھر نہ مانے بار بار اپنے والدین کو کہتے رہے کہ ''جہاد کی اجازت دیں'' والد نے سب سے زیادہ مزاحمت کی کیونکہ انہیں علم تھا کہ سالم (الخطاب) اپنے شعبے میں بہترین انجینئر ہے مگر ایک دن سالم نے اپنے والدین کو دیگر بہن بھائیوں کے سامنے کہا کہ ''ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے جس راستے میں کمائی کرنی ہے وہ آئل کمپنی نہیں میدان جہاد ہے اگر میرا دین جہاد کے لئے ماں باپ کی اجازت کی شرط نہ عائد کرتا تو واللہ میں کب کا اپنے مجاہد مسلمان بھائیوں کی صف میں شامل ہو چکا ہوتا'' سالم (الخطاب) کے والد کو اجازت دینا پڑی۔

اپنے علاقے میں ''مکتب الخدمت'' کی ایک شاخ سے ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سرزمین جہاد افغانستان کی جانب رخ کیا اس کے لئے وہ سب سے پہلے پاکستان آئے جہاں وہ پشاور میں کچھ دیر رہنے کے بعد رمضان **1408**ھ مطابق **1988**ء کو افغانستان میں داخل ہو گئے اس وقت ان کی عمر صرف **21** سال تھی۔مجاہدین بڑی حد تک روسیوں کی کمر توڑ چکے تھے سالم نے یہاں کئی معرکوں میں داد شجاعت دی اس کی عادت تھی کہ ہر معرکے میں جانے سے پہلے اپنے والدین کو فون کرتے ،اس دوران الخطاب کی مجاہدین کے درمیان رہ کر خوب عسکری تربیت ہو چکی تھی حج کے موسم سے تھوڑی دیر قبل وہ وطن واپس آئے اور فریضہ حج ادا کیا اور حج کے بعد **1989**ء میں وہ پھر سفر جہاد کے لئے نکلے اب وہ ایک مطمئن اور تجربے کار مجاہد بن چکے تھے اس مرتبہ ان کی دیگر دس عرب مجاہدین کے ساتھ ڈیوٹی لگائی گئ کہ وہ غزنی میں روسی فوج کی رسد کاٹ دیں انہوں نے انتہائی سخت معرکے میں روسی کا نوا۔ کاٹ کر رکھ دیا مگر اس دوران انہیں تین گولیاں لگیں ایک پیٹ اور دو سیدھے ہاتھ میں جبکہ ان کے سیدھے کاندھے پر دستی بم کا ٹکڑا لگا تھا اس سلسلے میں انہیں علاج کے لئے لاہور بھی آنا لاہور کے ہی ایک ہسپتال میں ان کے کاندھے کا علاج کیا گیا تھا۔

افغانستان میں ایک سال گذارنے کے بعد وہ رمضان سے پہلے اپنے وطن واپس آ۔

ہیں جہاں ان کا علاج مکمل کیا جاتا ہے اپنے خاندان کے ساتھ رہنے اور علاج مکمل کرانے کے بعد انہیں ان کے والدین نہ صرف حج کی اجازت دیتے ہیں بلکہ تیسری مرتبہ جہاد پر جانے کا خود کہتے ہیں۔اس مرتبہ جب سالم (الخطاب) افغانستان آتے ہیں تو ان کی مجاہد یونٹ مزید منظم کی جاچکی ہوتی ہے انہیں اس مرتبہ بھی روسی فوج کی رسد کاٹنے اور رات کو شب خون مارنے جیسے مشکل مشن سونپے جاتے ہیں یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک روسی فوج افغانستان سے نکل نہیں جاتی۔

افغانستان سے سوویت فوج کے نکل جانے کے بعد افغانستان میں بعض مجاہد گروپ جب آپس میں الجھ گئے تو الخطاب افغانستان سے نکل کر پشاور آگئے اور یہاں کافی عرصہ قیام کیا۔۔۔اسی دوران انہیں تاجکستان میں جہاد کی خبریں موصول ہوئیں تو انہوں نے اپنا دینی فرض پورا کرنے کے لئے تاجکستان جانے کا پروگرام بنایا جہادی سرگرمیوں میں یہ ان کا دوسرا میدان تھا یہاں انہوں نے مجاہدین کے ساتھ مل کر کمیونسٹوں کے خلاف زبردست جہاد کیا۔۔۔یہاں انہوں نے دو سال کا عرصہ گذارہ اس دوران انہیں شیشان کے مرد حریت اور عالم دین الشیخ فتحی الشیشانی نے شیشان آنے کی دعوت دی تاکہ یہاں مجاہدین کا بڑا تربیتی کیمپ بنا کر وسطی ایشیا میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کام کیا جائے سامر صالح السویلم (الخطاب) چند مجاہدین کے ہمراہ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو کے راستے شیشان پہنچ گئے جہاں ان کی ملاقات شیشان کے مجاہد اعظم جوہر دودائیف سے ہوئی۔۔۔اس امر کے باوجود کہ سامر (الخطاب) طویل جہادی تربیت کے بعد خود ایک بہترین گوریلا لیڈر بن چکے تھے انہوں نے جوہر دودائیف کی قیادت قبول کی اور ان کے جھنڈے تلے قفقاز کے میدانوں اور وادیوں میں اعلان جہاد کر دیا **1994** سے **1996**ء کے دوران الخطاب نے جوہر دودائیف کی قیادت میں کئی خونریز معرکے لڑے۔

سامر (الخطاب) کا روسی قیدیوں سے سلوک مثالی ہوتا تھا وہ انہیں اپنے سے زیادہ سہولت کے ساتھ رکھا کرتے تھے ان کے اس معاملے کی وجہ سے سینکڑوں روسی فوجی ان کی قید میں مسلمان ہو گئے ان مسلمان ہونے والے کئی روسی فوجیوں نے شیشان کی دوسری جنگ کے دوران الخطاب کے جھنڈے تلے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

1996ء میں روسی فوجوں کی شکست کے بعد سامر صالح السویلم (امیر الخطاب) کو شیشان کے جہاد کا ہیرو قرار دیا گیا انہیں شیشان مجاہدین کا جنرل اور تمغہ شجاعت بھی دیا گیا۔ روسی فوج کے علاقے سے نکل جانے کے بعد یہاں کی زندگی معمول پر آنا شروع ہو چکی تھی الخطاب نے یہاں ایک دعوتی مرکز بھی قائم کیا جہاں مقامی مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم کے مواقع میسر تھے اس کے علاوہ انہوں نے جہادی تربیت کے لئے مراکز کو فروغ دیا جب ان سے پوچھا جاتا کہ روسی فوج کے شکست خوردہ حالات میں نکل جانے کے بعد ان عسکری جہادی کیمپوں کی کیا ضرورت ہے؟ تو وہ جواب دیتے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو ہمیشہ تیار رہنے کا حکم دیا ہے تاکہ آنے والی جنگ کی تیاری جاری رہے۔ اگر آج روسی فوجیں شکست کھا کر علاقے سے نکل گئی ہیں تو کل دوبارہ واپس بھی ہو سکتی ہیں اور ایسا فی الواقع ہوا بھی۔۔۔

جہادی میدان میں کئی سال گذارنے کے بعد سامر (الخطاب) کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے فرائض سے فارغ ہو کر گھر واپس آجائے اس کے لئے انہوں نے ایک بہترین گھر الگ تعمیر کروایا تھا مگر الخطاب کی نظر میں ابھی بہت سا کام باقی تھا جہاد کی منزل اور اس کے ثمرات ابھی پوری طرح حاصل نہیں کئے گئے تھے۔

وہی ہوا جس کا الخطاب کو خدشہ تھا تین سال بعد روس ایک مرتبہ پھر داغستان کے راستے شیشان میں داخل ہو گیا تھا اس کی فوجوں نے راستے میں آنے والا ہر شہر اور قصبہ اجاڑ دیا تھا کئی سو مسلمان قتل کر دیئے گئے تاکہ مجاہدین کی مدد کرنے والے مسلمانوں کو نشان عبرت بنایا جاسکے، مجاہدین ایک مرتبہ پھر کمر بستہ ہوئے اور اب کی مرتبہ روسی فوج اور مجاہدین میں پہلا معرکہ داغستان میں لڑا گیا۔ شیشان میں الخطاب تیسری مرتبہ بڑی جنگ میں کود چکے تھے 1998ء میں شروع ہونے والی اس جنگ میں کئی خونریز معرکے لڑے گئے روس کی جانب سے الخطاب کے سر کا کئی ملین ڈالر کا انعام رکھا گیا روسیوں کی خفیہ ایجنسیوں کو علم ہو چکا تھا کہ الخطاب اور دوسرے مجاہد لیڈروں کا میدان جنگ میں بال بیکا نہیں کیا جاسکتا اس لئے انہوں نے سازش کے ذریعے ایسے خائن تلاش کرنا شروع کر دیئے جو ان مجاہدین کی صفوں میں رہتے ہوئے کام دکھا سکیں اور پھر آخر وہی ہوا جو تاریخ اسلام میں ہمیں کئی جگہ نظر آتا ہے یعنی مسلمان کے ذریعے ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا گیا 18 اپریل 2002ء کو ان کی فوج کا ایک سپاہی ان کے پاس ایک اور عرب کمانڈر کا خط لے کر آتا ہے مگر یہ سب ایک سازش تھی یہ خط عرب کمانڈر کی طرف سے نہیں تھا بلکہ اس ''سپاہی'' کو روسی انٹیلی جنس نے مہیا کیا تھا جس کے اندر انتہائی مہلک قسم کا زہر تھا اس خط کو کھولنے کے پانچ منٹ بعد سامر صالح السویلم (امیر الخطاب) جام شہادت نوش کر گئے۔

سامر صالح کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عموماً کہا کرتے تھے کہ انہیں بھی ایسے ہی موت آئے جیسے رسول اللہ ﷺ کو آئی تھی اللہ رب العزت نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کی آپ ﷺ بھی اسی زہر کے اثرات سے مرض الموت میں مبتلا ہوئے تھے جو یہودیوں نے خیبر کے مقام پر کھانے میں ملا کر آپ ﷺ کو دیا تھا گو کہ اس کے اثرات طویل عرصے بعد ظاہر ہوئے تھے، امیر الخطاب کی شہادت بھی زہر کے اثر سے ہوئی۔ انا لله و انا علیه راجعون۔

11 ستمبر اور اصل حقائق

امریکہ میں ہونے والے بہت سیسکینڈلوں میں متعدد بار امریکی حکومت کو انتہائی خفت کا سامنا رہا ہے۔ کوروش فرقے کی ایف بی آئی کے ہاتھوں ہلاکت، اوکلے ہاما میں دھماکے کی حقیقت، جان ایف کینیڈی کا قتل، ایران گیٹ اسکینڈل وغیرہ ان میں سے چند ہیں ان میں واٹر گیٹ اسکینڈل خاصا مشہور رہا جس میں سابق امریکی صدر نکسن کو نہ صرف عوام سے معافی مانگنا پڑی بلکہ حکومت سے مستعفی ہونے کا اعلان بھی کرنا پڑا اسی طرح سابق امریکی صدر کلنٹن کو مونیکا سیکنڈل نے دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا، اس سارے معاملے میں ایک قدر مشترک ہے کہ امریکی حکومتوں کے یہ کالے کرتوت دنیا کے سامنے لانے والے صرف محقق اور صحافی تھے ان کی ہر اسائنمنٹ کو دنیا کے سامنے لانے سے پہلے ''اسپیشل ریسرچ'' کا نام دیا گیا۔ آجکل اسی نوعیت کی ایک اور ''اسپیشل ریسرچ'' تیزی سے اپنے آخری مراحل کی جانب بڑھ رہی ہے جوں جوں امریکی تاریخ کی یہ خاص تحقیق اپنے حتمی نتائج کی جانب بڑھ رہی ہے ویسے ہی بش انتظامیہ کو اپنی گردن کے گرد پھندہ تنگ ہوتا محسوس ہوا۔ اس تمام حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے بش انتظامیہ نے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کی خاطر ایک طرف خود افغانستان میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو دوسری جانب مقبوضہ فلسطین اور مقبوضہ کشمیر میں اپنے علاقائی غنڈوں اسرائیل اور بھارت کے ذریعے مسلمانوں کو خون میں نہلا دیا، طالبان اور القاعدہ پر تو بش کا زور نہ چل سکا نہتے افغان شہری امریکی دہشت گردی کا نشانہ بن گئے، امریکہ سے باہر تو صیہونیت کی غلام امریکی انتظامیہ نے یہ ڈرامہ کر لیا تا کہ 11 ستمبر کی تمام کارروائی مسلمانوں پر ڈال کر دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کر دی جائے مگر امریکہ کے اندر کا کیا کیا جائے جہاں ''خاص محقق'' سیاسی چالبازیوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنی اپنی ''خاص تحقیق'' میں جت جاتے ہیں اور جب اس کے نتائج دنیا کے سامنے آتے ہیں تو حقائق کی بنیاد پر جرم کا سراغ کہیں اور جا نکلتا ہے۔

نئی تحقیق 11 ستمبر کے واقعات پر دنیا کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لئے ہے، امریکی حکومت کے بیانات، سی آئی اے اور ایف بی آئی کی تحقیقات اپنی جگہ ہیں مگر متذکرہ تحقیق امریکہ کے آزاد ذرائع سے کی گئی جس میں انہیں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے غیر جانبدار ''ذرائع'' کی مکمل اعانت حاصل رہی، 11 ستمبر کے واقعات میں امریکی حکومت، سی آئی اے اور ایف بی آئی ایک مدعی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں مگر ''خاص تحقیق'' میں وہ اس جرم میں خاموش فریق بن کر ابھرے ہیں۔ اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم القاعدہ پر 11 ستمبر کے واقعات کی ذمہ داری تو ڈالی گئی مگر اسے کبھی ثابت نہ کیا جا سکا، اس کے بعد اسامہ کی اور ان کے ساتھی ایمن الظواہری کے ایسے بیانات کی ویڈیو فلم بھی جاری ہوئی جس میں انہوں نے اسے فتح سے تعبیر کیا مگر یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ ان حملوں میں ان کی تنظیم کا ہاتھ ہے یا انہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی ہو۔

گذشتہ کچھ عرصہ کے دوران عرب صحافت میں 11 ستمبر کے واقعات کے پیچھے اصل ہاتھوں کی تلاش اور نشاندہی شروع ہو گئی تھی، یہ رپورٹیں امریکہ میں داخلی سطح پر ہونے والی تحقیق کی بنیاد پر تھیں جس میں امریکی حکومت اور سرکاری تحقیقی اداروں کا پول کھولا گیا تھا اور ان شواہد کی جانب واضح اشارہ کیا گیا تھا جو ان جرائم میں ماسٹر مائنڈ تھے، اس کی پہلی شہادت 2004ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی جانب سے صدارتی امیدوار لینڈن لاروش کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے 24 جولائی 2001ء میں یعنی 11 ستمبر کے واقعات سے صرف 48 دن پہلے واشنگٹن میں کی تھی جس میں انہوں نے امریکی عوام کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ میں داخلی سطح پر طاقتور عناصر تیسری عالمی جنگ شروع کروا سکتے ہیں اور یہ جنگ مغرب اور اسلام کے درمیان لڑی جائے گی، لینڈن لاروش نے اس سلسلے میں مختلف زاویوں سے اس مسئلے پر تفصیلی روشنی

ڈالی تھی جس کی حقیقت 11 ستمبر کے واقعات کے بعد کھل کر سامنے آئی اور جو لاروش کے بیانات کی تائید تھی۔

اس سلسلے میں دوسری شہادت ریتھیون RAYTHEON فضائی کمپنی کو شامل تفتیش کرنا ہے جو جو طیاروں کو دور سے کنٹرول کرنے کا ریموٹ سسٹم JPLS بناتی ہے اس کمپنی کے پریزیڈنٹ آف ڈائریکٹرز دانیال بوغام اور پریزیڈنٹ بورڈ آف پروجیکٹ انجینئرز کو ایف بی آئی نے شامل تفتیش کیا تھا کیونکہ اس بات کا پورا احتمال ایف بی آئی سامنے لائی تھی کہ اس حادثے میں یہ کمپنی ملوث ہوسکتی ہے۔

تیسری شہادت امریکی جیمس بامفورڈ کی کتاب ''BODY OF SECRET'' ہے جس میں اس نے واضح طور پر بیان کیا کہ امریکہ میں داخلی طاقتور عناصر امریکی مفادات میں اس قسم کی تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ یہ حقائق پانچ ماہ قبل طشت ازبام ہوچکے تھے۔ اس کے بعد اب جو نئے حقائق سامنے آئے اس میں سب سے پہلے مشہور فرانسیسی محقق تیری میسان کی فرانسیسی زبان میں کتاب ''بدشکل دھوکہ'' منظر عام پر آئی فرانسیسی زبان کی تھوڑی بہت شد بد رکھنے والے زبان اور بیان کے اسلوب کی روشنی میں اس کتاب میں دیے گئے خوفناک حقائق کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، فرانسیسی میڈیا نے اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے حقائق کی بنیاد پر اس کی اتنی تشہیر کی تھی کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مارکیٹ میں آنے کے دو گھنٹے بعد ہی ختم ہوگیا۔ اس کتاب میں فرانسیسی مصنف نے 11 ستمبر کے حوالے سے امریکیوں کے اس منصوبے سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''11 ستمبر کے واقعات امریکی پراپیگنڈے کی روشنی میں دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہیں، امریکی اور عالمی میڈیا میں اس قسم کی صورتحال پیدا کی گئی جس نے اصل حقائق کو نظروں سے اوجھل کردیا 11 ستمبر کے حادثہ درحقیقت امریکی فوج کا ترتیب دیا گیا منصوبہ تھا فوجی ماہرین نے صدر بش کی پالیسیوں کا دفاع کرنے کے لئے اس نوعیت کی منصوبہ بندی کی'' تیری میسان نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ ''11 ستمبر کے واقعات کے پیچھے کارفرما دماغوں کو زمین پر ہر طرح کی لاجسٹک (نقل وحمل) سہولت درکار تھی جنہوں نے زمین پر کنٹرول کے ذریعے طیاروں کو مطلوبہ اہداف تک پہنچایا، یہ تمام کارروائی امریکی خفیہ اداروں کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوئی، لیکن اسے مٹھی بھر مسلمانوں کے

کھاتے میں ڈال کر افغانستان کو خوفناک بمباری کا نشانہ بنا دیا گیا''۔ فرانسیسی مصنف تیری میسان نے اپنی کتاب میں کئی ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب تاحال امریکی دینے سے قاصر ہیں کہ امریکی صدر بش 11 ستمبر کو سارا دن کہاں غائب رہے؟ بعد میں انہیں امریکی فوجی ہیڈکوارٹر منتقل ہونے پر کیوں مجبور کیا گیا، نائب صدر ڈک چینی کو وزارت دفاع میں کیوں پناہ لینا پڑی؟ یہ ایک طرح سے فوجی انقلاب تھا جسے دنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کی تقریبا کامیاب کوشش کی گئی تھی صدر بش کا پہلے لویزیانا کے فوجی اڈے میں منتقل کیا جانا اس کے بعد نبراسکا کے اڈے میں منتقل کیا جانا درحقیقت ان عوامل پر قابو پانے کے لئے تھا جس میں صدر بش کو محدود فوجی بغاوت کی اطلاع دی گئی تھی اور انہیں ان عسکری اڈوں پر منتقل کرنے کی بڑی وجہ یہی بتائی گئی تھی کہ پینٹا گان اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے طیارے ٹکرانے والے محدود ایٹمی حملے کا حکم بھی دے سکتے ہیں اس لئے حالات پر قابو پانے اور امریکی فوج کی مشترکہ کمان کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے انہیں ان عسکری اڈوں پر لایا گیا ہے۔۔۔'' فرانسیسی مصنف کے مطابق ''امریکہ میں باہر سے آنے والے مٹھی بھر ''دہشت گرد'' امریکی سیکورٹی اور دفاعی اداروں پر کنٹرول کی اہلیت نہیں رکھ سکتے تھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حساس اداروں کا وقتی طور پر کن لوگوں نے کنٹرول سنبھالا تھا اور کن لوگوں کے ہاتھوں میں امریکہ کے خفیہ راز آچکے تھے۔۔۔؟''

فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والی اس کتاب کے تراجم تیزی کے ساتھ دوسری زبانوں میں کئے گئے، ان حقائق کے بعد اب امریکہ میں بعض امریکی محققوں کی تحقیق کی جانب رجوع کیا جاتا ہے جنہوں نے امریکہ کا 11 ستمبر کے حوالے سے اختیار کیا جانے والا سرکاری موقف الٹ کر رکھ دیا۔ ان امریکی محققین میں ایک دو نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں ''جو فیلز'' اور ''لارنس ٹی مائی''۔ ان کی ابتدائی تحقیق کی رپورٹ امریکہ کے پڑوس میں واقع ملک کینیڈا کے اسلامی ذرائع نے دیگر عرب ممالک میں ارسال کی تھی اس کے بعد ادارہ القدس اور اورینٹ پریس سے بھی ان رپورٹوں کو لوگوں کے لئے عام کیا گیا۔ 21 مارچ 2002ء کو قدس پریس کی جانب سے جو تحقیقی رپورٹ امریکی محقق کے حوالے سے شائع ہوئی اس کے مطابق:

امریکی تاریخ کی سب سے بڑی رسوا کن سازش امریکی محققین کے ذریعے طشت ازبام ہونے کو ہے، جان ایف کینیڈی کی موت کا سکینڈل، واٹرگیٹ سکینڈل، مونیکا سکینڈل، ایف بی

آئی کا کوروش اور اس کے فرقے کے افراد کو ذبح کرنے کا سکینڈل اور ایران گیٹ جیسے اسکینڈل کو بھی محققوں اور محقق رپورٹروں نے سرعام لانے کی کامیاب کوششیں کیں۔آج جو فیالز اور لارنس مائی جیسے تحقیقی افراد امریکہ بلکہ دنیا کے بڑے سیاسی سکینڈل سے پردہ اٹھانے والے ہیں جس میں 11 ستمبر 2001ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔امریکی محقق کے مطابق عربوں پر پہلے طیارے اغواء کرنا اور ان پر حملے کا الزام عائد کرنا دراصل اس سازش کا حصہ تھا جس کی منصوبہ بندی طویل عرصے سے جاری تھی، اچانک دنیا نے اغوا ہونے والے طیاروں کے مسافروں کے ناموں کی لسٹ بھی دیکھی جس میں عربی نام کا کوئی فرد سفر نہیں کر رہا تھا جن کے بارے میں دعوی کیا جا رہا تھا کہ یہ کام ان کا ہے۔لیکن یہ بات مشہور ہے کہ ''مردے بولتے نہیں'' اس لئے امریکی ایجنسیوں نے جس کا بھی نام دیا اسے سچ تسلیم کرلیا گیا۔امریکہ میں اور اب دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اڑنے والے تمام طیاروں میں ایسا نظام موجود ہوتا ہے جس کے ذریعے طیارے میں ہونے والی معمولی سے معمولی بات اور سرگوشی بھی زمین پر کنٹرول ٹاور یا متعلقہ شعبے میں آسانی سے سنی جا سکتی ہے۔اس لئے طیارے میں اغوا کے دوران ہونے والی کوئی ایسی گفتگو یا چیخ وپکار نہیں سنائی دی جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ ہائی جیکر طیارے کا کنٹرول سنبھالنے کے لئے عملے کو یا مسافروں کو ہدایات دے رہے ہیں طیارے کا صوتی نظام آخری وقت تک چاروں طیاروں میں سکون کی کیفیت بیان کر رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ طیارے کو زمین سے طاقتور ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اس طرح قابو کیا گیا کہ طیارے کے اندرونی کنٹرول سسٹم پر پائلٹ کی گرفت ختم ہوگئی وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ یہ سب کچھ کہیں انجن یا سسٹم کی خرابی کی وجہ سے تو نہیں ہوا اور اس دوران طیاروں کو مطلوبہ اہداف سے ٹکرا دیا گیا۔طیاروں کو زمین سے کنٹرول کرنے کا نظام طویل عرصے سے دنیا میں تحقیقی مراحل میں رہا آج کی جدید دنیا میں عسکری ضرورتوں کے لئے بغیر پائلٹ کے طیاروں کا رواج تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے تاکہ عسکری کارروائی میں انسانی جان کے ضیاع کے امکان کو کم سے کم کیا جاسکے زمین سے جہازوں کو کنٹرول کرنے کے لئے کسی بڑی الیکٹرانک مشین کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک طرح کا ''سوفٹ ویر'' ہوتا ہے یعنی انتہائی حساس کمپیوٹر پروگرام،اس کے بارے میں تحقیق سے جو بات سامنے آئی ہے کہ تا حال یہ سسٹم اتنا خفیہ رکھا جاتا ہے کہ بڑی بڑی طیارہ ساز

کمپنیاں اور ماہر پائلٹ بھی اس کے وجود سے بے خبر ہیں۔یہ حساس کمپیوٹر پروگرام اڑتے ہوئے دیو ہیکل جہازوں کے کنٹرول کو جام کر کے زمین پر مطلوبہ افراد کے ہاتھ میں منتقل کر دیتا ہے اس سسٹم کو بنانے میں ماہرین کی تیس سالہ کاوشوں کا بڑا دخل ہے اب واضح طور پر اس میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی گئی ہے،اس کے ذریعے بہت سے غیر فوجی کام بھی لئے جا سکتے ہیں مثلاً اگر طیارہ دوران پرواز اغوا کر لیا جائے تو اسے زمین سے کنٹرول کر کے آسانی کے ساتھ ہائی جیکروں کے قابو سے نکال کر مطلوبہ ائیر پورٹ پر اتارا جا سکتا ہے۔امریکہ میں طیارہ سازی کے ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ 11 ستمبر کے واقعات میں طیاروں کو طاقتور ریموٹ کنٹرول سے زمین پر سے اپنے قابو میں کر کے مطلوبہ اہداف سے ٹکرایا گیا تھا جس طرح بغیر پائلٹ کے جاسوس طیارے کو زمین سے کنٹرول کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں اسی طرح عسکری اور سیاسی مقاصد کے لئے حادثے میں استعمال ہونے والے طیاروں کو ان کا کاک پٹ سسٹم جام کر کے زمین سے کنٹرول کیا گیا۔

امریکی محقق جو فیالز کے مطابق ''ہمیں اس بات کا پوری طرح ادراک ہونا چاہئے کہ اس حادثے کے پیچھے عسکری، سیاسی اور مالیاتی مافیا کا ہاتھ ہے جو دنیا کو اس وقت اپنے قابو میں کئے ہوئے ہے اور ''عالمی حکومت'' کے سربراہ ہیں ان کا نام دنیا میں شائد زیادہ معروف نہیں ہوتا مگر ان کے نائبین میں بڑی حکومتوں کے سربراہ اور عسکری اور سیاسی ماہرین شامل ہوتے ہیں۔دنیا میں نظر نہ آنے والی ''عالمی حکومت'' کے کرتا دھرتا کسی بھی عسکری، سیاسی اور مالی مفاد کی خاطر اس قسم کی کارروائی کر سکتے ہیں اور اب چونکہ تمام شواہد انہی کی جانب مڑ چکے ہیں اس لئے اب اس میں کسی شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔طیارہ سازی اور اس سے متعلق ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا ہر خاص وعام اس بات سے آگاہ ہے کہ امریکہ اور دیگر ترقی پذیر ممالک میں استعمال ہونے والے جدید مسافر بردار طیاروں میں ایک ایسا سسٹم نصب ہوتا ہے جسے ''رپلائی'' کا نام دیا جاتا ہے قاعدے سے ہٹ کر ذرا سی بھی حرکت پر یہ خود کار آلہ زمین پر مدد کا پیغام ارسال کر دیتا ہے یعنی اگر فنی خرابی یا طیارے کو اچانک اغوا کر لیا جائے اور پائلٹ کو حالات کی سنگینی کی وجہ سے مدد کا پیغام بھیجنے میں کوئی دشواری پیش آئے یا اسے مفلوج کر دیا جائے تو یہ آلہ خود کار نظام کے تحت کنٹرول ٹاور کو مدد کا پیغام بھیج دیتا ہے مگر تمام دنیا کے ماہرین

اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ نیویارک اور واشنگٹن میں ''تخریبی'' کارروائی کے لئے استعمال ہونے والے چاروں طیاروں میں سے کوئی ایسا پیغام کسی ائیر پورٹ کے کنٹرول ٹاور کو نہیں بھجوایا گیا یعنی پائلٹ کو آخری وقت تک زمین سے اغوا ہونے کی خبر نہیں تھی۔ اس کے علاوہ امریکی تحقیقی اداروں نے جو ''تحقیق'' کی وہ یہ تھی کہ ہائی جیکروں کے پاس چھوٹے تیز دھار آلے تھے پھر اس کے بعد ایک اور نقطہ ہے کہ اتنے بڑے جمبو طیارے میں جو مسافروں سے بھرے ہوئے تھے مسافر اپنے درمیان ان ہائی جیکروں کو دیکھ کر کوئی حرکت نہ کریں، یا کوئی زندگی کی بھیک نہ مانگے یا موت سامنے دیکھ کر ان میں سے کوئی مزاحمت کی کوشش نہ کرے مگر طیارے کے طاقتور اور حساس سننے والے آلات اس قسم کی کوئی بات زمین پر کنٹرول ٹاور کو نہیں بھیجتے۔ کیوں۔۔۔؟ اس لئے کہ طیاروں کے اندر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا سارا چکر تو باہر زمین پر موجود نامعلوم لوگ چلا رہے تھے۔

اس کے بعد جو اہم نکتہ اٹھتا ہے وہ ان طیاروں کے بلیک بکسوں کا ہے۔ وہ کہاں گئے؟ ان بلیک بکسوں میں کاک پٹ میں ہونے والی ذرا ذرا سی گفتگو بھی محفوظ ہوتی ہے ریکارڈنگ کا دورانیہ تیس منٹ ہوتا ہے مگر انہیں بھی منصوبے کے تحت امریکی حکومت نے غائب کر دیا کیا کوئی ذی عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ بلیک بکس گفتگو سے خالی ہوں گے۔۔۔؟ مگر حکومتی تحقیقی اداروں نے دعویٰ کیا کہ جو طیارے پینٹا گان اور دیگر عمارتوں سے ٹکرائے ان میں کسی قسم کی کوئی گفتگو ریکارڈ نہیں تھی بلکہ یہ بالکل خالی تھے۔۔۔ یہ بات بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ طیارے باہر سے طاقتور ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اغوا کئے گئے تھے۔''

امریکی محقق جو فیلز کے مطابق ''یہ بات اب پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ طیارے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اغوا کئے گئے۔ تھے اس کی ایک شہادت اس طرح بھی ملتی ہے کہ نیویارک میں دوسرے ٹاور سے ٹکرانے والا جہاز آخری وقت میں اس ٹاور سے دور ہونے کی کوشش میں تھا مگر اسے پوری طرح کنٹرول کر کے ٹاور سے ٹکرا دیا گیا عینی شاہدوں کے مطابق ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پائلٹ طیارے کو دور لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اس سارے معاملے میں ایک چیز شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ 11 ستمبر کے واقعات کے ٹھیک 24 گھنٹے بعد ایف بی آئی کی جانب سے جو رپورٹ جاری ہوئی اس کے

مطابق ہائی جیکر عرب تھے! اس بات پر کون یقین کرے گا کہ عربی بولنے والے ہائی جیکر طیارے کو اغوا کرنے کے لئے عربی زبان میں طیارے کی ڈائریکٹری لے کر طیارے میں داخل ہوئے تھے حالانکہ آج تک ایسی ڈائریکٹری کبھی کسی کار کے لئے بھی تیار نہیں ہوئی ہے پھر طیاروں کی ڈائریکٹری عربی میں کیسے مدون کر دی گئی اس کی بھی دنیا میں کہیں سے کوئی شہادت نہیں مل سکی اور اگر ان عربوں نے تین ماہ کے اندر انگریزی زبان سیکھ بھی لی تو کیا وہ دیو ہیکل جمبو طیارے کی ڈائریکٹری سے طیارہ اڑانے کی ترکیب سمجھ سکتے ہیں؟ یہ انتہائی مضحکہ خیز الزام ہے۔

پھر اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ بہت سے عربوں نے طیارے اڑانے کی تربیت حاصل کی تھی ان ہی میں سے ہائی جیکر بھی تھے مگر یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ تربیتی طیاروں کے ذریعے تربیت حاصل کر کے جمبو طیارہ نہیں اڑایا جا سکتا جمبو طیارے کی ساری ترکیب دوسرے چھوٹے طیاروں سے مختلف ہوتی ہے جس کو اڑانے کی خاص تربیت پائلٹ کو اس میدان میں خاصے تجربے کے بعد دی جاتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ چھوٹے طیارے سے اڑان کی تربیت حاصل کر کے ائیر بس یا جمبو 727 جیسے طیارے اڑا کر مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں لغو بات ہے۔''

دوسرے امریکی محقق لارنس ٹی مائی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اس نے چاروں طیاروں کی بورڈنگ لسٹ کا بغور مطالعہ کیا اس میں کہیں بھی کسی عرب مسافر کا دور تک کوئی نشان نہیں ملتا کسی ائیر پورٹ، ادارے یا تحقیقی ادارے کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت کیا جا سکے کہ ان طیاروں میں کوئی عرب مسافر بھی سوار تھا بلکہ عربوں کا نام ایک سازش کے تحت اس لسٹ میں شامل کیا گیا تھا جو اس منصوبے کا مرکزی حصہ تھا۔ آئندہ امریکی صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹک امیدوار لینڈن لاروش کے مطابق یہ سازش منصوبے کے تحت انتہائی مہارت کے ساتھ تیار کی گئی تھی جو داخلی سطح پر اس شعبے کے انتہائی قابل ماہرین کی مدد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی یہ بات عجیب نہیں ہے کہ قومی سلامتی اور ائیر سکیورٹی کے کسی ادارے کو آج تک شامل تفتیش نہیں کیا گیا۔۔۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن عربوں کا اس سلسلے میں نام لیا گیا کہ وہ ہائی جیکر تھے کہاں گئے؟ ان کو کہاں چھپایا گیا، یا کسی طرح قتل کر کے غائب کر دیا گیا؟ جن لوگوں کا نام لیا

گیا ہے وہ طیاروں کی بورڈنگ لسٹ میں شامل نہیں ہیں تو وہ پھر کہاں چلے گئے؟ انہیں کیسے اغوا کیا گیا؟ کیا یہ سوالات ہمیشہ سوال ہی رہیں گے؟ یا کبھی ان کا جواب بھی دیا جاسکے گا؟ جو فیالز ان چاروں طیاروں میں سوار مسافروں اور عملے کے ارکان کے نام جاری کرچکا ہے جس میں ایک نام بھی عربی نہیں ہے اس کا دعویٰ ہے کہ حادثے کے پیچھے کارفرما عناصر اور تحقیقی اداروں کا آپس میں گہرا گٹھ جوڑ ہے جس کی بنیاد پر حقیقت کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کی پوری پوری کوشش کی جارہی ہے۔''

یہ وہ خوفناک حقائق ہیں جن کی بنیاد پر امریکی حکومت کی ساکھ اور عزت کسی وقت بھی داؤ پر لگ سکتی ہے، عجب نہیں کہ واٹر گیٹ کی تاریخ دہرائی جائے اور بش کو ٹی وی پر آکر پوری قوم کے سامنے اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کرنا پڑے، القدس اور اورینٹ پریس نے کینیڈا کے اسلامی حلقوں کی جانب سے اس قسم کے خدشات کا اظہار کیا ہے کہ امریکی حکومت اس خوفناک سازش کے افشا ہونے سے پہلے دنیا میں مزید بحرانوں کی حالت پیدا کرسکتی ہے امریکہ کے طاقتور عسکری حلقے ہرصورت میں صدر بش کی پالیسیوں کی تائید میں ڈٹ چکے ہیں۔ جب اس سانحے کے خلاف تحقیقات کا آغاز ہوا تو جارج ٹنیٹ کے ایما پر افغانستان پر حملہ کرنے کا فوراً فیصلہ کیا گیا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ اس بین الاقوامی سازش میں ہنری کسنجر کے کردار کو کسی طور بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ پہلے بھی اس طرح کی بہت سی کارروائیوں میں ماسٹر مائنڈ رہ چکے ہیں رابرٹ میکنامارا کے بعد انہیں دنیا کا سفاک ترین امریکی وزیر خارجہ کہا جاسکتا ہے جس نے واٹر گیٹ کے سلسلے میں صدر نکسن کو منصوبہ تیار کرنے کا مشورہ دیا تھا صدر نکسن کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے اس سلسلے میں ''ہاں'' کی تھی اس کی باقی ٹیکنکل وجوہات کی ترتیب کسنجر کے زیرنگرانی پایہ تکمیل کو پہنچی تھی جس کے بعد اس سکنڈل کو ''رپورٹ'' تک پہنچانے میں بھی کسنجر کی خفیہ ہدایات کا ہاتھ تھا جو نکسن کے لئے عربوں کی جانب مائل ہونے اور نرم گوشہ رکھنے کی سزا تھی۔ وہی کھیل اب دوبارہ کھیلا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق جن عربوں کو ہائی جیکر ظاہر کیا گیا ہے انہیں بہت پہلے اغوا کرلیا گیا تھا اور ان کے کاغذات کی پڑتال کے بعد انہیں ٹھکانے لگا کر منصوبے کا حصہ بنا دیا گیا تا کہ اس سازش کے تانے بانے القاعدہ سے جوڑ کر افغانستان اور شرق الاوسط میں اسلامی تحریکوں پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ مگر اس حقیقت کو کس طرح فراموش کیا جا

ملتا ہے کہ سی آئی اے مارچ 2002ء میں وائٹ ہاؤس کو رپورٹ کرچکی ہے کہ ''تا حال زمین القاعدہ کا مقابلہ نامکمل معلومات کی بنا پر ممکن نہیں ہوسکا ہے۔''

جوں جوں وقت گذر رہا ہے 11 ستمبر کے واقعات کے پس منظر میں کھیلا جانے والا عالمی کھیل واضح ہوتا جارہا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ ان حقائق سے کسی مسلمان مہم جو نے پردہ نہیں اٹھایا بلکہ امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور اسرائیلی اخبارات اور تحقیقی صحافی پردہ اٹھا رہے ہیں جو اپنی جگہ انتہائی اہم اور قابل غور ہے۔ اس کی تفصیلات ہم اس مقالے کے آخر میں دیں گے۔ امریکہ پر ایک تباہی مسلط کی گئی امریکی انتظامیہ نے اس تباہی کی بنیاد پر اپنی عالمی سلطنت کے قیام کے منصوبے بنانے شروع کردیئے، امریکی معیشت اور عوام کی لاشوں پر بش انتظامیہ کا یہ گھناؤنا فعل ہے جسے عالمی تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی، امریکی انتظامیہ اور انٹیلی جنس ایجنسیاں پہلے سے ہی ان واقعات کے بارے میں باخبر تھیں ان حملوں کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟ اے بش اور کولن پاؤل سمیت سب جانتے ہیں مگر اشتباہ کی آڑ میں افغانستان جیسے غریب اور کمزور ملک کو جارحیت کا نشانہ بنایا اور وہاں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی گئی جس میں کابینہ کے اکثر ارکان امریکی شہریت کے حامل تھے اور ایک افغان نژاد امریکی ملک کا عبوری صدر بنا اسی کی آڑ میں تیل اور گیس سے مالا مال علاقے کیسپین کو بھی گھیر لیا گیا، مگر اب یہ حقائق امریکہ کے ساتھ ساتھ یورپی اور اسرائیلی اخبارات خود کھول رہے ہیں۔ جوں جوں تحقیق کا دائرہ پھیل رہا ہے امریکی انتظامیہ کو اپنے گلے کے گرد پھندہ تنگ ہوتا محسوس ہو رہا ہے انہی وجوہات کی بنا پر کولن پاؤل نے دوبارہ القاعدہ اور دیگر مسلمان تنظیموں پر الزامات کی بھرمار شروع کی اور امریکی عوام اور دنیا کو دوبارہ گمراہ کرنے کے لئے امریکہ پر دوبارہ حملے کے خطرات سے آگاہ کیا تا کہ امریکی عوام امریکہ پر دوبارہ حملے کے خوف میں مبتلا ہوکر اصل حقائق کی جانب کان ہی نہ دھریں مگر کب تک؟

پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ اب یہ حقائق کھل کر سامنے آچکے ہیں کہ 11 ستمبر کو استعمال ہونے والے طیاروں کو زمین سے کنٹرول کیا گیا تھا، امریکی محکمہ دفاع پینٹاگان کو طیارے کے ذریعے تباہ نہیں کیا گیا تھا اس سلسلے میں امریکی محکمہ دفاع نے سراسر جھوٹ سے کام لے کر امریکی عوام اور دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی۔ اگر پینٹاگان سے طیارہ

ٹکرایا ہوتا تو اس کوئی ٹکڑا ملنا چاہئے تھا یا کسی مسافر کی ایک آدھ جلی ہوئی لاش یا طیارے کے سامان میں سے کوئی ایک آدھا بیگ، مگر ایسا کوئی نشان دور دور تک نہیں ملتا۔ امریکی سرکاری رپورٹ کے مطابق پینٹا گان سے ٹکرانے والے طیارے میں **58** مسافر سوار تھے اور اس کا بلیک باکس حرارت کی وجہ سے خراب ہوگیا، حالانکہ طیاروں کے بلیک باکس آگ اور پانی دونوں کے اثرات سے محفوظ بنائے جاتے ہیں کتنے طیارے ہیں جو آگ لگنے سے فضا میں پھٹ جاتے ہیں کتنے ہی طیارے سمندروں میں گر کر تباہ ہوتے ہیں اور کئی سو میٹر گہرے پانیوں میں سے ان کے بلیک باکس نکال کر حادثے کی وجہ معلوم کرلی جاتی ہے تو پھر پینٹا گان سے ٹکرانے والے جہاز کا بلیک باکس کہاں گیا؟ وہ کیسے خراب ہوگیا؟ پینٹا گان سے ٹکرانے والا جہاز کیا ہوا میں تحلیل ہوگیا۔۔۔؟

اس سلسلے میں پہلے امریکی سرکاری میڈیا کی جانب سے دی گئی رپورٹ کا حال دیکھ لینا چاہئے ''پینٹا گان سے ٹکرانے والا طیارہ امریکن ائر لائن کا بوئنگ **757** طرز کا جہاز تھا، فلائٹ نمبر **77** تھی جو ڈلاس کے ہوائی اڈے سے صبح **8.51** منٹ پر روانہ ہوئی یعنی ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے والے پہلے طیارے کے تین منٹ بعد یہ طیارہ فضا میں پہنچا تھا (تاکہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے والے جہاز کی وجہ سے دنیا کی توجہ اس طرف مبذول ہوجائے گی اور پینٹا گان کے حادثے کو کوئی بھی رخ دیا جاسکے گا)، حکومتی رپورٹ کے مطابق پینٹا گان سے ٹکرانے والے جہاز کی زیادہ تر سیٹیں خالی تھیں صرف **58** مسافر سوار تھے جس وقت جہاز نو بجے کے قریب فضا میں پہنچا تو چند منٹ اپنے روٹ پر رہنے کے بعد اس کا رخ واشنگٹن کی جانب ہوگیا یہ **45** منٹ تک ہوا میں رہا اس کے بعد **9.45** منٹ پر پینٹا گان کی عمارت سے ٹکرا گیا''۔ امریکی ذرائع کے مطابق سرد جنگ کے ابتدائی دنوں سے واشنگٹن اور دیگر اہم شہروں کے گرد فضائی نگرانی کا مربوط نظام قائم کیا گیا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طیارہ اپنے روٹ سے ہٹ کر **45** منٹ تک فضا میں رہا اور پینٹا گان کی عمارت سے ٹکرا گیا۔۔۔ جبکہ اس دوران جنگی طیاروں کو آسانی کے ساتھ مطلوبہ طیارے کو روکنے کے لئے فضا میں بلند کیا جاسکتا تھا پھر دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل ملک میں اس قسم کا حادثہ کیسے ہوگیا؟ پینٹا گان کے حادثے کے اصل حقائق ایسوسی ایٹ پریس کی خبر سے ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں خبر کے مطابق ''پینٹا گان کی عمارت

بارود سے بھرے ٹرک سے اڑائی گئی'' خبر کا متن تھا (**A body trapped Truck had caused the explosion**) اس کے فوراً بعد امریکی انتظامیہ اس خبر کو جھٹلانے پر تل گئی اور اصرار کیا جانے لگا کہ عمارت سے طیارہ ٹکرایا تھا مگر کسی طرح بھی اسے ثابت نہیں کیا جاسکا امریکہ اور دیگر ملکوں کے میڈیا اپنے کیمروں کے ساتھ عمارت کی فلم بناتے رہے مگر یہاں کسی طیارے کے ٹکرانے کے شواہد سامنے نہیں آئے۔ اس کے بعد جب صحافیوں نے حادثے کے مقام پر سب سے پہلے پہنچنے والی امدادی ٹیموں کے سربراہ **Ed Plauger** سے حادثے کے بارے میں استفسار کیا تو ان کا جواب تھا کہ ''حیرت ہے کہ جہاز کا کوئی حصہ نظر نہیں آیا۔''

"In other words there's no fuslage..sections and that sort of thing..you know I'd rather not commet on that. We have a lot eye witness that can give you better information about what actually happend with the aircraft as it approached, so we don't know .. I don't know."

یوں یہاں یہ بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ امدادی ٹیم کو پینٹا گان کی عمارت سے کسی جہاز کا کوئی حصہ نہیں نظر آیا مگر اس نے معاملے کی نزاکت کو جانتے ہوئے صحافیوں کے سامنے تفصیلات میں جانے سے گریز کیا اور کہا کہ ''اس حادثے کے اور بھی بہت سے گواہ ہیں وہ آپ کو صحیح صورتحال سے آگاہ کریں گے۔۔۔'' مگر وہ اس بات کا اعتراف کر بیٹھا کہ طیارے کا ایک چھوٹا سا بھی ٹکرا دستیاب نہیں ہوسکا جو حیرت انگیز ہے۔

اس سلسلے میں انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ **www.asile.org** میں ایک عجیب مقالہ پیش کیا گیا ہے جس میں پینٹا گان کے طیارے کی گمشدگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ ''پینٹا گان سے جہاز نہیں ٹکرایا بلکہ اسے امریکہ کے مشہور جادوگر ڈیوڈ کاپر فیلڈ (یہودی) نے غائب کردیا جو بڑی بڑی اشیا کو غائب کرنے کا فن جانتا ہے اور اس کا مظاہرہ وہ میڈیا کے سامنے بھی کئی مرتبہ کرچکا ہے (ایک مرتبہ عالمی میڈیا کے سامنے اس نے امریکہ کا

مجسمہ آزادی بھی غائب کردیا تھا) اس ویب سائٹ پر جو اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

1۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دیو ہیکل جہاز کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تفتیش کے دوران نہیں ملا جبکہ اس کے پر خاصے لمبے اور وزن سو ٹن کے قریب ہوتا ہے اور 700 کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہے جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ پہلا طیارہ جو ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرایا تھا اس نے عمارت کی پہلی بیس منزلوں کو جلایا تھا اس کے بعد دوسرے طیارے کے ٹکرانے سے عمارت کی تباہی مکمل ہوتی ہے اس طرح جو تباہی ہمیں پینٹا گان میں نظر آئی وہ اگر طیارہ ٹکرانے سے ہوتی تو اصل تباہی سے دس گنا کم ہونی چاہئے تھی۔

2۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بوئنگ طیارہ جس کی لمبائی 115 میٹر ہو، پروں کی لمبائی 30 میٹر کے قریب ہو اور اونچائی 20 میٹر ہو وہ پینٹا گان کے زمینی حصے سے ٹکرائے کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے۔

3۔ امریکی محکمہ دفاع پینٹا گان نے حادثے کے دوسرے دن عمارت کے وسیع لان کو ریت سے کیوں ڈھانپ دیا تھا جبکہ عمارت کے سامنے والے وسیع حصے پر چھوٹے پتھروں کا ڈھیر لگا دیا گیا، حادثے کے شواہد پوشیدہ رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کیوں کیا گیا؟ اس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی سوائے اس چیز کے کہ کوئی موقع سے کسی قسم کے شواہد آسانی سے حاصل نہ کر سکے، کیونکہ دھماکہ خیز مواد سے لدھا ہوا ٹرک عمارت کے داخلی حصہ کے لان میں کھڑا کیا گیا تھا اور پینٹا گان کی عمارت میں ایسی خطرناک چیز صرف امریکی فوج کے زیر نگرانی ہی لائی جا سکتی ہے، امریکی حکومت کا یہ جرم امریکی عوام کے نزدیک نا قابل معافی ثابت ہوگا جس نے جان بوجھ کر امریکی عوام اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اصل شواہد کو چھپا کر بین الاقوامی سطح پر ان واقعات کو استعمال کیا، ویب سائٹ میں سوال کیا گیا ہے کہ:

(Can you explain why the Defence Secretary deemed it necessary to sand over the lawn, which was other wise undamaged after attack?)

ان ہی حقائق کی وجہ سے فرانسیسی محقق تھیری میسان (Thierry Meyssan) کو

11 ستمبر کے واقعات پر چونکا دینے والی فرانسیسی زبان کی کتاب (Leffroyable impostyre) (بڑا دھوکہ) تصنیف کرنا پڑی۔ مصنف فولٹیر ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں ان کی کتاب کے صرف پیرس میں بیس ہزار نسخے پہلے دو گھنٹوں میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے تھے ۔ اس کا شمار فرانس میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔۔۔پینٹا گان کے حادثے کے بارے میں مصنف رقم طراز ہے کہ پینٹا گان سے طیارے ٹکرانا سراسر امریکیوں کا گھڑا ہوا قصہ ہے، جبکہ تباہی کا اصل سبب بارود سے بھرا ہوا وہ ٹرک تھا جو عمارت کے اندر کی جانب کھڑا کیا گیا تھا مگر امریکی خفیہ اداروں نے مجرمانہ کارروائی کرتے ہوئے اصل حقائق عوام کے سامنے پیش نہیں کیئے بلکہ اپنے خاص مقاصد کی خاطر اس سارے واقعے کو ایک خاص زاویے سے پیش کیا تھا، دھماکے کی اصل وجہ امریکی ''نظام'' کے مخالفین کا طاقتور گروپ ہے جو امریکی سیاست کی بنیادی پالیسیاں بدلنے کا حامی ہے تاکہ امریکہ میں دفاعی بجٹ میں اضافہ کیا جائے اور افغانستان سمیت دنیا کے دوسرے ملکوں پر جنگ مسلط کر کے دفاعی صنعت سے مال کمایا جا سکے، اس فرانسیسی مفکر نے فرانس کے نیوز چینل France 2 کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''پینٹا گان سے کوئی طیارہ نہیں ٹکرایا بلکہ امریکی حکومت نے انتہائی غیر اخلاقی اور غیر قانونی رویہ اختیار کرتے ہوئے امریکی عوام اور دنیا کو کھلا دھوکہ دیا ہے۔ فرانسیسی جریدے ''لیبراسیون'' نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس کتاب میں دیئے گئے حقائق کو کسی بھی سطح پر جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مشہور فرانسیسی اخبار ''لی مونڈے'' کے مطابق ''پینٹا گان سے ٹکرانے والے جہاز کی کہانی من گھڑت ہے اور کتاب میں دیئے گئے حقائق کی کسی بھی سطح پر تردید ممکن نہیں ہے۔ فرانس اور دیگر مغربی ملکوں میں اس کتاب کا چرچا ہونے کے بعد ایک امریکی صحافی Glen Ford کو جب سوال و جواب کے لئے پینٹا گان کے ترجمان کے طور پر مدعو کیا گیا تو وہ اس کتاب میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب سرے سے دے ہی نہ سکا اور صرف یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ ''میں نے یہ کتاب ابھی پڑھی ہی نہیں۔۔۔اور نہ ہی پڑھوں گا۔۔۔کیونکہ اس میں امریکی عوام کی توہین کی گئی ہے''۔

امریکی حکومت کو اب ان امریکی صحافیوں کے ٹولے سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے جو اس حادثے کی غیر جانبدارانہ تحقیق کر رہے ہیں ان میں سے ایک سی آئی اے کا

سابق ایجنٹ میشل رابرٹ بھی شامل ہے جو سی آئی اے کے سابقہ ایجنٹ کے طور پر اس کی کارروائیوں اور طریقہ واردات سے اچھی طرح واقف ہے اب اس نے ایک کتاب کی شکل میں کام شروع کر دیا ہے جس کا نام The Truth & lies of 11/9 ہے اس کا دعویٰ ہے کہ سی آئی اے اور امریکی حکومت کے بعض طاقتور عناصر 11 ستمبر کے واقعات کے اصل ماسٹر مائنڈ ہیں۔ بن لادن اور دیگر افراد کے نام صرف دنیا کو دھوکہ دینے اور اپنے اصل مقاصد کی بار آوری کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ میشل کا دعویٰ ہے کہ حادثے کے قریبی دنوں تک سی آئی اے کسی نہ کسی طرح اسامہ سے رابطے میں تھی۔۔۔ اس کے علاوہ امریکی حکومت اور عالمی تیل کے بیوپاریوں کے اس کھیل کے بارے میں اصل حقائق اب امریکہ کی ہی بعض ویب سائٹوں میں نظر آ رہے ہیں جو دنیا کے لئے کھول دی گئی ہیں کوئی بھی شخص ان سائٹوں سے استفادہ کر سکتا ہے مثلاً ایک سائٹ www.copvcia.com ہے۔

اگر اسلامی ملکوں اور میڈیا کا اس سلسلے میں موقف لیا جائے تو شاید کہا جائے گا کہ یہ سب کچھ تعصب کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے مگر امریکہ، برطانیہ اور اسرائیلی اخباروں کا کیا کیا جائے جو اب خود اصل حقائق دنیا کے سامنے لانے پر مجبور ہو چکے۔

اب ذرا ان دشمنان اسلام مغربی اخبارات اور میڈیا کا جائزہ لے لیا جائے کہ وہ کیا انکشافات کرتے ہیں، بعض اسرائیلی اخبارات نے امریکہ میں خفیہ ہاتھوں کے ساتھ موساد کو بھی ملوث دکھایا ہے۔ موساد کے وہ ایجنٹ جو عربی زبان عربوں کی طرح بولتے ہیں۔ دوسری جانب برطانوی اور امریکی بھی فرانسیسیوں کی دیکھا دیکھی سچ اگلنا شروع ہو گئے ہیں جس کی مثال انڈیپنڈنٹ کے محقق رابرٹ فیسک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور فرانسیسی جریدہ ''انٹیلی جنس اون لائن'' بھی اب اس صف میں شامل ہے۔ 11 ستمبر کے واقعات کے حوالے سے دو اسرائیلی اخبارات ''یدیعوت احرنوت'' اور ''ھا آرتس'' نے انکشاف کیا کہ ''اسرائیلی جاسوس ایک عرصے سے امریکہ کے خلاف جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور انہی جاسوسوں نے 11 ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کام کرنے والے تقریباً چار ہزار یہودیوں کو خفیہ پمفلٹوں کے ذریعے خبردار کیا تھا کہ وہ 11 ستمبر کو ٹریڈ سینٹر سے دور رہیں انہی کارروائیوں کے پس منظر میں امریکی انتظامیہ نے ساٹھ اسرائیلی گرفتار کئے تھے''۔ اسرائیلی اخبار ''ھا آرتس'' کے مطابق

عمارتوں سے ٹکرانے والے جہازوں کے پائلٹوں کو ان کے کاک پٹ میں ہی غیر موثر کر دیا گیا تھا، کیونکہ اگر انہیں اندر سے اغوا کیا جاتا تو طیاروں کی جانب سے قریبی کنٹرول ٹاور کو خودکار نظام کے تحت خود بخود اس اغوا کی اطلاع موصول ہو جاتی۔''

سات اکتوبر 2001ء کو امریکی صحافی کارل ویلنٹائن نے نیوز میں ایک مقالہ تحریر کیا جسے بعد ازاں انٹرنیٹ پر ''پائلٹوں نے خودکشی نہیں کی'' کے عنوان سے جاری کیا گیا، کارل کے مطابق 11 ستمبر کو پیش آنے والے واقعات حیران کن جدید ٹیکنالوجی کا نتیجہ تھے جیسے اب دنیا ''گلوبل ہاک ٹیکنالوجی'' کے نام سے جانتی ہے اور جسے امریکی فوج کے لئے تیار کیا گیا تھا جو اڑتے ہوئے جہازوں کو قابو کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے''۔ 10 اکتوبر 2001 کو برطانوی اخبار اکنامسٹ نے برطانوی فضائیہ کے سابق سربراہ رابرٹ ایلن کا انٹرویو شائع کیا جس میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ'' 11 ستمبر کو تباہ ہونے والے جہازوں کو زمین سے اغوا کر کے مطلوبہ مقامات سے ٹکرایا گیا تھا۔'' 10 اکتوبر 2000ء کو واشنگٹن پوسٹ نے انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن ملٹری اسٹریٹیجک کے ایک آفیسر کا بیان شائع کیا جس میں کہا گیا کہ ''امریکہ پر حملے کرنے کی صلاحیت دنیا میں صرف اسرائیل کے پاس ہے کیونکہ اسرائیلی موساد ایک ایسی خفیہ ایجنسی ہے جس کی ڈکشنری میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں وہی مطلوبہ منصوبے ترتیب دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، موساد امریکی فوج کے شرق الاوسط میں کردار سے خوش نہیں ہے۔'' اس مقالے کے نشر ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد ہی پینٹاگان میں دھماکہ ہو گیا۔۔۔ اور الزام عربوں کے گلے ڈال دیا گیا۔

حادثے کے ایک دن بعد یعنی 12 ستمبر کو امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے ''ہمارے اغوا شدہ طیارے'' کے عنوان سے مقالہ نشر کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ جہازوں کو انتہائی مہارت کے ساتھ کنٹرول کیا گیا۔۔۔ کیونکہ خودکار نظام نے اغوا کی اطلاع سرے سے نہیں کی''۔

18 ستمبر کو میری لینڈ سے شائع ہونے والے امریکی جریدے پرنس جارج جرنل نے فضائی انسٹرکٹر مارسیل برنہارڈ کا ایک بیان شائع کیا جس کے مطابق ''جن اشخاص پر اغوا کا الزام عائد کیا جا رہا ہے اور جن اداروں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہاں انہوں نے تربیت حاصل کی، صحیح نہیں ہے کیونکہ ان اداروں میں اس قسم کے پیچیدہ اور حساس طیاروں کو اڑانے کی تربیت

دی ہی نہیں جا سکتی‘‘۔ اس کے ساتھ ہی دو صحافیوں کی تحقیقی رپورٹ شائع کی گئی جس کا عنوان تھا کہ ’’کیا ہائی جیکر عرب تھے؟ اس مقالے میں انہوں نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہائی جیکروں کا تعلق عرب ملکوں سے تھا؟ اسرائیلی ایجنٹ اس قسم کی کارروائی کی صلاحیت رکھتے ہیں جس میں امریکی یہودیوں کو بھی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ **1986**ء میں ایک عالمی یہودی دہشت پسند تنظیم کے سربراہ وکٹر وانسیر ون حالیہ مقیم لندن نے ایک بیان دیا تھا کہ اگر دنیا کو یہ پتا ہے کہ لبنان کی شیعہ ملیشیا حزب اللہ دہشت گردی کی وارداتوں پر قادر ہے تو یہودیوں کی خفیہ قوت امریکیوں کو ذلیل کر کے یہ باور کرا سکتی ہے کہ یہودی بھی اس میں کہاں تک مہارت رکھتے ہیں۔۔۔ **6** مئی **1986**ء کو صحافی فریڈ مان نے فرانسیسی اخبار ’’ذہ فیلیج فولیس‘‘ میں یہودی لیڈر کے اس بیان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس تنظیم کے ارکان کے نزدیک زندگی اور موت کوئی معانی نہیں رکھتی۔۔۔‘‘ امریکی صحافی مائیکل کولینز کا تجزیہ ہے کہ اغوا ہونے والے طیاروں میں سرے سے کوئی عرب مسافر سوار نہیں تھا بلکہ ان کی جگہ یہودی ہو سکتے ہیں اس واقعے کے پیچھے شرق الاوسط پر امریکہ کے ذریعے جنگ مسلط کروانا ہو سکتا ہے۔‘‘

ادبیات میں امریکہ کا سب سے بڑا انعام ولٹزر حاصل کرنے والے مصنف اور محقق سیمور ہیرش نے **8** اکتوبر **2001**ء میں نیویارک کے مشہور جریدے ’’نیویارکر‘‘ میں ایک مقالہ شائع کرایا جس میں امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ’’امریکی ایف بی آئی اور دیگر تحقیقی ادارے اصل حقائق سے ہٹ کر تحقیق کر رہے ہیں جس میں عربوں کو جان بوجھ کر ملوث کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس قسم کی کارروائیوں نے امریکیوں کی زندگیاں اسرائیلیوں کے رحم کرم پر چھوڑ دی ہیں بلکہ متشدد اور بنیاد پرست یہودی مغرب میں رہنے والے یہودیوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کریں گے کیونکہ ان کے خیال میں امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں مقیم یہودی اصل یہودی تشخص کے خلاف ہیں‘‘۔ اسرائیلی کاہن کے حالات زندگی پر کتاب تصنیف کرنے والے صحافی رابرٹ فریڈ مان کے مطابق ’’ہو سکتا ہے کہ امریکہ میں ہونے والے حادثوں کا اسرائیلی انچارج سابق اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق شامیر ہو کیونکہ وہ شرق الاوسط میں امریکی کردار سے کبھی مطمئن نہیں رہا، اس کے علاوہ حاخام مائیر کاھانا کا موقف ہے کہ مغرب کی

جانب مائل یہودیوں کو قتل کر دینا عین ثواب ہے۔‘‘

اس تمام صورتحال کے علاوہ ایک اور نیا زاویہ جو سامنے آیا ہے وہ بھی **11** ستمبر کے واقعات کا ایک حصہ ہے جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ **11** ستمبر کے واقعات سے عالمی خفیہ ہاتھ نے کئی قسم کے کام پورے کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسرائیلیوں کو امریکہ کی جانب بڑی تعداد میں ہجرت سے روکا جا سکے۔ **15** اکتوبر **2001**ء کو یہودی محقق یوسی کلاین ہالیفی نے اسرائیلی جریدے ’’النیور بابلیک‘‘ میں لکھا تھا کہ ’’ٹریڈ سینٹر کی تباہی اصل یہودی تشخص کی حفاظت کے لئے ضروری تھی۔۔۔‘‘ **11** ستمبر سے پہلے اسرائیل میں اس قسم کے خیالات پروان چڑھ رہے تھے کہ فلسطین کی تحریک انتفاضہ کی وجہ سے اسرائیلی خود کو اسرائیل میں محفوظ نہیں سمجھتے جبکہ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ امن وامان والا علاقہ ہے ایک سروے کے مطابق **37** فیصد اسرائیلی جسے اسرائیل کا دولت مند طبقہ قرار دیا جاتا ہے ان میں سے بڑی تعداد فوراً اسرائیل چھوڑ کر امریکہ میں آباد ہونے کے منصوبے ترتیب دے رہی تھی مگر **11** ستمبر کے واقعات کے بعد اس پروان چڑھتے طرز فکر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگان پر حملے کے بارے میں جو مختلف ذرائع دنیا کے سامنے آرہے ہیں اس کے مطابق اسرائیلیوں نے تباہی کے خوف سے اب امریکہ جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔

امریکی، برطانوی اور اسرائیلی اخبارات کی روشنی میں ان حقائق کو جھٹلانا اب امریکی حکومت کے لئے ناممکن ہے امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے غبار میں ان تلخ حقائق کو چھپانا چاہتا ہے۔ امریکہ میں یہودی لابی کے سربراہ ہنری کسنجر نے منصوبے کے مطابق حادثے کے فوراً بعد مسلمانوں کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیئے تھے، جسے بقول فرانسیسی محقق امریکی محکمہ دفاع کے غنڈوں نے بڑی کامیابی سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال امریکی وزیر دفاع رامز فیلڈ کا دفاعی بجٹ میں حکومت سے اضافہ کرانا تھا۔۔۔ جبکہ دوسری طرف صورتحال واضح ہونے کے بعد اب یورپ امریکہ کی بین الاقوامی جنگ میں شامل ہونے سے گریزاں ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سارے بکھیڑے سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔

این ایس اے
عالمی مواصلاتی جاسوسی

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آپ ٹیلی فون پر گفتگو کر رہے ہیں یا کہیں فیکس کے ذریعے پیغام بھیج رہے ہیں اور ہزاروں میل دور آپ کی گفتگو ریکارڈ کر لی جائے یا آپ کی جانب سے بھیجی گئی فیکس کی ایک کاپی کہیں اور بھی حاصل کر لی جائے اور اس کام کے لئے ہزاروں افراد پر مشتمل عملہ مختص ہو تو آپ یقیناً تعجب کا اظہار کریں گے۔ مگر یہ امر واقع ہے کہ امریکہ کا ''ادارہ برائے قومی سلامتی'' (NSA) تمام دنیا میں ہونے والی ''سرگوشیوں'' کا ریکارڈ جمع کرنے میں منہمک ہے۔

NSA کا شمار دنیا کے لئے امریکہ کی خطرناک ترین قومی ایجنسیوں میں ہوتا ہے جس کا احوال بڑی حد تک پردۂ اخفا میں ہے۔ اس کا بنیادی کام دنیا بھر میں ہونے والے واقعات، حادثات مختلف عالمی تنظیموں، شخصیات حتیٰ کہ مختلف ممالک کے درمیان ہونے والے روابط کا مکمل ریکارڈ ہے۔ 1975ء تک اس ادارے میں کام کرنے والے افراد کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی مگر اب کوئی نہیں جانتا کہ اس ادارے کے افراد کتنی تعداد میں ہیں۔ اس ادارے کی بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر ایک اندازے کے مطابق اس سے وابستہ افراد کی نفری 12 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ امریکہ کی مختلف خفیہ ایجنسیوں کے لئے مختص کیا جانے والے سالانہ بجٹ

یعنی 27 بلین ڈالر کا 80 فیصد حصہ اس خطرناک ترین ادارے NSA پر صرف ہوتا ہے۔ اس ادارے کے کام کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ لیڈی ڈیانا سے متعلق اس ادارے نے ہلکی سی ہلکی معلومات اور گفتگو ریکارڈ کر رکھی تھی۔ برطانوی اخبارات ڈیلی مرر، اور دی ڈیلی ریکارڈر کے مطابق شہزادہ چارلس سے تعلقات کی ابتداء کے ساتھ ہی لیڈی ڈیانا نے جیسے ہی شہرت کے میدان میں قدم رکھا NSA کی زد میں آ گئی۔ اس وقت سے لے کر اس کی موت تک اس ادارے نے ڈیانا کی ہر ٹیلی فون کال، کمیونی کیشن کے دوسرے ذرائع اور معاملات ریکارڈ کرنے شروع کر دیئے مگر اس راز سے پردہ اس وقت اٹھا جب نیویارک میں قائم انٹرنیٹ کے مرکز نے امریکی قانون کے مطابق معلومات طلب کیں تو اس ادارے NSA نے اسے امریکی قومی مفادات کے خلاف تصور کرتے ہوئے انٹرنیٹ کی درخواست مسترد کر دی۔

NSA نے انٹرنیٹ کو جو آفیشل جواب دیا وہ اس طرح تھا کہ ''اس قسم کی درخواست منظور کر لینے میں امریکہ کے قومی مفاد میں نقصان کا احتمال ہے۔ ڈیانا کا موضوع اس ادارے کے لئے اتنا اہم نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذات کو اہمیت دے کر یہ معلومات اکٹھی کی گئیں۔ اس سلسلے میں ہم آپ کو صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ ڈیانا کے موضوع سے متعلق ہماری معلومات کا ذخیرہ 1056 صفحات پر مشتمل ہے..... '' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا موضوع جو اس ادارے کے نزدیک اتنا حساس نہیں ہے اس پر معلومات کا ذخیرہ اس قدر ہے اور وہ معاملات جو اس ادارے کے نزدیک حساس ہوں گے ان تک رسائی کا کیا عالم ہوگا...... اس سے پہلے کہ اس ادارے کی مزید کارکردگی پر روشنی ڈالی جائے اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں تھوڑا پیچھے جانا پڑے گا۔

امریکہ میں داخلی اور خارجی سطح پر جاسوسی اور معلومات کے حصول کے تین بڑے ادارے ہیں جس میں جزید مواصلاتی و الیکٹرانک آلات کے ذریعے دنیا بھر کی حکومتوں، تنظیموں اور افراد کے درمیان ہونے والے گفتگو اور معاملات کو ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری NSA کے سپرد ہے اس کے بعد سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی CIA اور فیڈرل بیورو انوسٹی گیشن FBI آتی ہے۔ ذمہ داری کے لحاظ سے ان میں حساس ترین ادارہ NSA ہے۔ جس کا قیام امریکہ صدر

ہیری ٹرومین کے حکم سے 24 اکتوبر 1952ء میں عمل میں آیا تھا اس ادارے کی تشکیل کے وقت امریکہ میں کوئی بھی اس کے قیام اور اس کے مقاصد کے بارے میں نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ اس سلسلے میں امریکی کانگریس کو بھی بے خبر رکھا گیا تھا۔ اس وقت کے امریکی صدر کے احکامات کے مطابق یہ ادارہ اعالمی سطح پر امریکی مفادات میں ''سننے'' کی ذمہ داری ادا کرے گا۔ شروع شروع میں یہ ادارہ امریکہ میں غیر ملکی سفارتکاروں اور امریکہ میں ممکنہ غیر ملکی ایجنسیوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے اعلیٰ عہدیداروں کی سرگرمیاں اور بات چیت ریکارڈ کو ریکارڈ کیا جانے لگا۔ اس کے بعد امریکہ کے نزدیک حساس ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کی سرگرمیاں اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد کی باہمی گفتگو NSA کی زد میں آ گئی۔ ان اداروں کی گفتگو اور معلومات عام ٹیلی فون موبائل فون' فیکس' ٹیلیگراف اور انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل کی جانے لگیں۔ NSA کا دائرہ مختلف ملکوں کے صدور' وزراء' سیاسی جماعتوں کے قائدین اور کاروباری حضرات تک پھیل چکا ہے۔ اس کام کے لئے NSA دنیا بھر میں قائم امریکی سفارت خانے' قونصل خانے' امریکی فوجی اڈے' بحری جنگی جہاز' آبدوزیں' جنگی طیارے اور مصنوعی سیارے استعمال کرتی ہے۔

1952ء میں NSA کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد ہی NSA اور CIA کے دائرہ عمل کی حدود وضع کر دی گئیں تا کہ دونوں ایجنسیاں کسی متوقع تصادم سے بچ سکیں اور ایک دوسرے کے امور میں مداخلت نہ ہو ایسی ہی حد بندی ایک سال بعد CIA اور FBI کے درمیان بھی کی گئی۔ بشرطیکہ اس کی سرگرمیاں FBI سے متصادم نہ ہوں۔ اس کے فوراً بعد ہی CIA کو گفتگو سننے یا ریکارڈ کرنے کے لئے الیکٹرانک آلات استعمال کرنے کی اجازت مرحمت ہوئی۔ ٹرومین کے دور میں امریکہ کی سیاسی صورتحال میں اس وقت ہلچل مچ گئی تھی جب بہت سے امریکی مصنفین اور دوسری سرکردہ شخصیات پر کمیونزم کی حمایت کا الزام لگایا گیا جس کے فوراً بعد ٹرومین نے FBI کو امریکی قومی سلامتی کے پیش نظر کسی بھی شخصیت کی گفتگو ٹیپ کرنے کا اختیار دے دیا۔ 1972ء میں جب اپوزیشن نے ویت نام کی جنگ سے متعلق امریکی پالیسیوں پر کھل کر تنقید شروع کر دی تو اس ہنگامے میں بہت سے دوسرے اعتراضات بھی اٹھائے گئے جس میں FBI کے ان اقدامات کی کھل کر مخالفت کی گئی جس میں وہ امریکہ کی

KURF

ی بھی شخصیت کی گفتگو ٹیپ کر سکتی تھی۔ FBI کے اس اقدام کے خلاف امریکہ میں اتنی شدت کے ساتھ مخالفت ہوئی کہ بعد میں کسی حد تک اس پر پابندی عائد کی گئی کہ اس کا کوئی بھی رکن بغیر محکمے کی اعلیٰ قیادت کی اجازت سے کسی بھی شخص کی گفتگو ریکارڈ نہیں کر سکے گا۔ ورنہ اس سے پہلے FBI کے عام رکن کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ''قومی مفاد'' کے معاملے میں کسی بھی شخص کی گفتگو ریکارڈ کر سکتا ہے مگر اس قرارداد کی وجہ سے گفتگو سننے کا عمل رک نہیں سکا۔ 1973ء تک نو سو امریکیوں کی گفتگو ریکارڈ کی گئی جبکہ اس وقت چھ ہزار غیر ملکی امریکہ میں مقیم تھے جن امریکیوں کی گفتگو اس دوران ریکارڈ ہوئی ان میں سینیٹر رابرٹ کینیڈی کا نام بھی شامل ہے جو اپنے زمانے کے مشہور مافیا لیڈر سوم جینکانا کے ساتھ 1988ء میں قتل کر دیا گیا۔

امریکہ کا یہ حساس ادارہ NSA برطانیہ' کینیڈا' نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے تعاون سے بھی اپنی کاروائیوں کا دائرہ وسیع کرتا رہتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ مذکورہ بالا ممالک میں بھی چھوٹے پیمانے پر ایسی ایجنسیاں کام کرتی ہیں جو داخلی سطح پر ریکارڈنگ کے علاوہ دوسری سرگرمیوں کا ریکارڈ بھی رکھتی ہیں۔ NSA ایک خاص سطح پر ان سے روابط استوار کرتی ہے جسے اس کی اصطلاح میں Echelon کہا جاتا ہے۔ اس نے دوست مغربی ممالک کی ایجنسیوں کے ساتھ مل کر سابق سوویت یونین اور وارسا پیکٹ میں شامل ممالک میں ہونے والے مذاکرات اور ان ممالک سے تعلق رکھنے والے حکومتی وعسکری عہدیداروں کا بھرپور ریکارڈ جمع کیا اور اس سلسلے میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ حلیف ممالک کو بھی نہیں بخشا۔ 1960ء کی دہائی میں NSA نے اٹلی اور فرانس کے حساس اور حکومتی شعبوں میں ہونے والی گفتگو بھی ریکارڈ کی۔ 1975ء تک NSA کی سرگرمیوں کے متعلق خود امریکہ میں زیادہ لوگوں کو علم نہیں تھا مگر اس عرصے کے بعد اس کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں' خاص طور پر 1975ء میں جب NSA کے ڈائریکٹر جنرل لوی ایلن نے کانگریس کی تفتیشی کمیٹی کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے 1967ء سے 1973ء تک ہزاروں امریکی شہریوں کی گفتگو ریکارڈ کی ہے۔ ایسے ہی انکشافات مشہور امریکی مصنف جیمس باسفورڈ نے NSA کے متعلق اپنی کتاب (Puzzle Place) میں کئے ہیں کہ اس ادارے کا قیام کس مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا۔ کس طرح یہ ادارہ سیاسی وعسکری شخصیات کی گفتگو ریکارڈ کرتا ہے۔

مصنف کے مطابق NSA کی جانب سے ریکارڈ کی گئی اور دوسری دستاویزات کا ریکارڈ سالانہ 10050 ملین صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی اس ادارے کے تحت یومیہ خفیہ رپورٹوں پر مشتمل وثائق کا وزن چالیس ٹن کے قریب ہے جو حساس کمپیوٹروں کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ رپورٹیں مختلف ممالک کے سربراہوں' وزراء' عسکری قیادت' اپوزیشن لیڈروں' بڑے اخبارات کے مالکوں سے لے کر حساس شعبوں کے صحافیوں کی گفتگو پر مبنی ہوتی ہیں۔

1957ء میں یعنی صدر آئزن ہاور کے آخری دور میں NSA نے عالمی سطح پر سیاسی و معاشرتی گفتگو اور عسکری سگنلز کی ریکارڈنگ کا کام پہلی مرتبہ آبدوزوں کے ذریعے لینا شروع کیا۔ یہ آبدوزیں جدید الیکٹرانک اور مواصلاتی آلات سے لیس ہوتی تھیں جو لاسلکی ذرائع سے بھیجے گئے مکالمات اور سگنلز آسانی کے ساتھ ریکارڈ کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ آبدوزوں میں ایسے آلات اور حساس کیمرے نصب ہوتے ہیں جو دنیا بھر کے حساس اور سٹریٹیجک علاقوں کی تصاویر بآسانی بنا سکتی ہیں۔ NSA کی اس حکمت عملی کے تحت جو انہیں اس وقت سب سے بڑی کامیابی نصیب ہوئی وہ سابق سوویت یونین کے میزائل پروگرام سے متعلق ایسے اشارات کی ریکارڈنگ' تجربات کے دوران میزائل چھوڑنے کی جگہ اور اس کے اہداف کی نشاندہی تھا اس لئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ امریکی آبدوزیں اور جنگی بحری جہاز ابھی بھی اس قسم کی کاروائیوں میں منہمک ہیں۔ آج کل ان کے دائرہ عمل میں شط العرب' بحیرہ عرب میں کراچی کا ساحل جہاں سے افغانستان تک کا علاقہ کور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیاء' بحیرۂ بالٹک اور قزوین کا علاقہ NSA کی سرگرمیوں کا بڑا مرکز ہے۔

1976ء میں امریکہ کی جانب سے پہلی مرتبہ سماعتی آلات سے لیس پہلا مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا گیا۔ جس نے دنیا کے اس خطرناک ترین ادارے NSA کی استعداد کو کئی گناہ زیادہ بڑھا دیا۔ اس دور میں امریکہ نے اس ادارے کی وساطت سے سابق سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے معاملات میں سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک امریکہ اس مقصد کے لئے کئی سو مصنوعی سیارے خلا میں بھیج چکا ہے۔ جو جاسوسی مقاصد کے لئے دنیا بھر کی نگرانی کرتے ہیں۔ کمیونی کیشن کے ذرائع ان سیاروں کے ذریعے انتہائی وسیع ہو چکے ہیں۔ 1987ء میں دنیا بھر میں ٹیلی فونوں کی تعداد 447 ملین تھی

مگر نو سال بعد ہی اس تعداد میں 741 ملین کا اضافہ ہو گیا۔ یہ تعداد کمیونی کیشن کے دوسرے ذرائع کے علاوہ ہے۔ 1996ء میں صرف امریکہ اور کینیڈا کے درمیان ہونے والے ٹیلی فونک مکالمات کا دورانیہ ایک اندازے کے مطابق 5 بلین 107 ملین جبکہ چین اور ہانگ کانگ میں ٹیلی فون گفتگو کا دورانیہ مجموعی طور پر دو بلین 775 ملین منٹ تھا۔

دنیا بھر کی سماعت اور دوسرے کمیونی کیشن کو ریکارڈ کرنے کے لیے NSA کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کے بعد CIA کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ سی آئی اے کی کاروائیوں کا زیادہ انحصار اپنے کارندوں پر ہے۔ اس لئے سی آئی اے کے امریکی نژاد جاسوسوں کی تربیت میں الیکٹرانک آلات کے ذریعے گفتگو ریکارڈ کرنا خفیہ تصاویر بنانا' دستخط اور مہریں تیار کرنا خطوط کو کھول کر پڑھنا اور پھر انہیں اسی طرح بند کر دینا۔ خفیہ سیاہی سے لکھنا وغیرہ سکھانا NSA کے سپرد ہے۔ اس کی معلومات کا بڑا ذریعہ دوسرے ممالک کی خفیہ ایجنسیوں سے معلومات کا تبادلہ بھی اس کے بڑے ذرائع میں شامل ہے۔ مگر این ایس اے NSA کو اپنی تاریخ میں جو سب سے بڑا سبق حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ دوست ممالک کی خفیہ ایجنسیوں پر اندھا اعتماد نہ کیا جائے۔ ایرانی انقلاب کے سلسلے میں NSA نے شاہ کے دور کی ایرانی خفیہ ایجنسی ''سفاک'' پر اعتماد کر کے بڑی خطا کھائی تھی۔ جب سافاک نے NSA کو اطلاع فراہم کی کہ ''علامہ خمینی جیسا ضعیف اور جلاوطن شخص شاہ ایران کے طاقتور اقتدار کے خلاف کبھی مؤثر تحریک منظم نہیں کر سکتا''۔ مگر معاملہ اس سے الٹ ثابت ہوا اور NSA کی ''باخبری'' ایران میں امریکی مفادات لے ڈوبی اس کے بعد سے یہ ایجنسی حلیف ممالک کی ایجنسیوں پر بھی زیادہ اعتبار نہیں کرتی۔

ستر کی دہائی کے آخر میں NSA اور CIA نے الیکٹرانک جاسوس ٹیکنالوجی کو بہت ترقی دی اس پروگرام کا نام Special Collection رکھا گیا۔ اس پروگرام کے تحت چھوٹے سے چھوٹے الیکٹرانک آلات کے ذریعے جاسوسی اور مکالمات سننے کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ ان آلات میں ایک ''لیزر مائیکروفون'' کا ایک چھوٹا سا حصہ کمرے کی کسی بھی کھڑکی کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ حساس مائیکروفون شیشے کے پار سے آنے والی صوتی لہروں کو آسانی کے ساتھ کیچ کر کے مطلوبہ مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

گفتگو ریکارڈ کر لی جاتی ہے بلکہ اس لیزر مائیکروفون کے ذریعے کسی دوسری طرف سے بھیجا گیا لاسلکی اشارہ بھی پکڑا جا سکتا ہے۔

اسپیشل کولیکشن پروگرام کے تحت استعمال ہونے والے آلات میں دوسرا اہم آلہ (TX) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس آلے کے ایجاد ہونے کے بعد اب ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے لئے ٹیلیفون سیٹ میں کوئی آلہ نصب نہیں کرنا پڑتا بلکہ کافی فاصلے پر مطلوبہ ٹیلی فون کی تار پر یہ چھوٹا سا آلہ نصب کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ بات کرنے والے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ عدم استعمال کی صورت میں یہ ٹیلی فون جس کمرے میں نصب ہوتا ہے اس کمرے میں ہونے والی گفتگو دور کہیں اس ٹیلی فون کی تار کے ساتھ منسلک آلے (TX) کے ذریعے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ آلہ کسی اور ٹیلیفون کے تار پر نصب کر کے مطلوبہ فون کے نمبر پر رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اس قسم کے آلے NSA کے ذرائع سے دنیا بھر میں سی آئی اے کے مقامی ایجنٹوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق قاری سوال کر سکتا ہے کہ دنیا بھر میں روزانہ لاکھوں افراد کی گفتگو کس طرح سنی یا ٹیپ کی جا سکتی ہے تو اس سوال کا جواب اس طرح ہے کہ موجودہ سائنسی ترقی نے یہ سب کچھ ممکن کر دیا ہے۔ اس سے فرار یا چھپنا اب ممکن نہیں رہا۔ NSA نے معلومات کیبڑے بڑے ذخائر جدید ترین کمپیوٹروں من محفوظ کر رکھے ہیں۔ مثلاً 1985ء کے بعد دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں پہ NSA کو بھرپور نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اب اس کے کمپیوٹروں میں مختلف کوڈ نام مثلاً اسلام' اسلامی تحریک' قرآن' محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیرت' غزالی' شافعی' حنفی ابن تیمیہ' حسن البنا' مودودی' سعید النواسی' اخوان المسلمون' جہاد' الجہاد الاسلامی' طلبہ النور وغیرہ کینام سے فائلیں محفوظ ہیں جن میں روزانہ حاصل کردہ معلومات کا اضاہ کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے الیکٹرانک نظام میں جرمنی کی خفیہ ایجنسی BND نے بھی کافی پیشرفت کی۔ اس نے لاسلکی (وائرلیس) پیغامات کی فضائی لہروں کے ذریعے کیچ کرنے اور مطلوبہ معلومات کو اس سے الگ کرنے کا نظام وضع کیا جس کا نام آسٹن 2 (Austin 2) رکھا گیا۔ جرمن انٹیلی جنس نے اس نظام کو زیاہ تو منشیات اور اسلحہ کے اسمگلروں کے خلاف استعمال کیا

1990ء کے بعد دنیا بھر میں موبائل فونوں کی بھرمار ہوگئی خصوصاً امریکہ' یورپ اور شرق وسطیٰ میں اس کا استعمال عام لوگوں میں فروغ پانے لگا۔ شروع شروع میں موبائل فون کو ریکارڈ کرنے میں NSA اور اس جیسی دوسری ایجنسیوں کو سخت دشواری پیش اتی تھی۔ کیونکہ موبائل نظام میں GSM نامی ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے جیسے ٹریس کرنا NSA کے دائرہ اختیار سے باہر تھا اس مشکل کو حل کرنے کے لئے NSA نے CIA سے اعانت طلب کی کہ موبائل فون کی ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر اپنی دسترس میں رکھنے کے لئے موبائل فون سیٹوں میں ایسے باریک آلات کا نصب کرنا لازمی قرار دے دیا جائے جس کی مدد سے ان فونوں کو استعمال کرنے والے افراد کی گفتگو آسانی سے ریکارڈ ہو سکے۔ اس کام کے لئے جرمن کمپنی (Rode and Schwarz) کو استعمال کیا گیا جس نے موبائل ٹیکنالوجی میں مطلوبہ جدت پیدا کر کے اس نئے موبائل سسٹم کا نام (Imsi catcher subscriber idinity International Mobile) کا مخفف ہے۔ اس سسٹم نے نہ صرف گفتگو ٹیپ کرنے میں آسانی پیدا کر دی بلکہ اس میں دوسرے لاسلکی روابط کو کیچ کرنے کی سہولیت بھی موجود ہے۔ موبائل سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اس نے نہ صرف گفتگو ٹیپ کرنے کی پہلے صلاحیت حاصل کی بلکہ اس کے ذریعے گفتگو کے مقام کا بھی آسانی سے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس سسٹم میں ایسا مائیکروفون نصب کیا جانے لگا جس سے گفتگو کرنے والے کے اردگرد کے لوگوں کی باتوں کو بھی بہ آسانی سنا جا سکتا تھا۔ اس نظام کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اسے NSA اور CIA منتقل کر دیا گیا۔ یہ خطرناک ٹیکنالوجی سب سے پہلے چاچنیا کے مجاہد لیڈر اور سابق سوویت یونین کی فضائیہ کے سربراہ جوہر دودیف کے سازشی قتل کا سبب بنی چیچنیا کی جنگ آزادی جس تیزی کے ساتھ مؤثر انداز میں شروع ہوئی تھی اس نے روس کو تو مشکل میں ڈال دیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا کی ریاستوں میں امریکی مفادات زبردست خطرے میں پڑ گئے تھے۔ روس اور چیچن مجاہدین کے درمیان جنگ شروع ہونے سے پہلے امریکیوں کا خیال تھا کہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ ایک تحریک مزاحمت کی حد تک رہے گی مگر چیچن مجاہدین نے انتہائی قلیل مدت میں ہزاروں روسی فوجیوں کے ساتھ ساتھ متعدد روسی جنرل بھی واصل جہنم کر دیئے تھے۔ چیچن مجاہدین کے اس جارحانہ جہاد میں جوہر دودایف کی مجاہدانہ قیادت کا زیادہ دخل تھا۔

جنگ بندی کے معاملے میں عالمی طاقتوں کے اصرار کے باوجود چیچنیا کی آزادی سے کم پر راضی نہیں تھے ان عزائم میں امریکہ کے لئے خطرات پنہاں تھے جو ہر دوداایف کی نقل حرکت کے بارے میں مطلع کرنا شروع کر دیا۔ آخر میں جو ہر دوداایف کے موبائل فون کے ذریعے ان کے خفیہ جنگی ہیڈ کوارٹرز کا پتہ چلا کر روسی فضاء سے شدید بمباری کرائی گئی جس مس یہ عظیم چیچن مجاہد شہید ہو گیا مگر ان کی شہادت کے بعد امریکہ اور روس بھی مطلوبہ مقاصد پوری طرح حاصل نہ کر سکے کیونکہ ان کی شہادت کے بعد جنگی قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جنہوں نے پہلے سے زیادہ جارحانہ انداز میں جہاد جاری رکھتے ہوئے روس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

موبائل فون استعمال کرنے کی غلطی ترکی کو مطلوب مفرور کرد لیڈر عبداللہ اوجلان نے بھی کی جس کا خمیازہ اسے اپنی گرفتاری کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ اوجلان یونان کے پاسپورٹ پر کینیا فرار ہو چکا تھا۔ ترکی کی مدد کیلئے امریکہ اور اسرائیل میدان میں آ چکے تھے مگر اوجلان کی روپوشی کا علم آخری وقت تک کسی کو نہ ہو سکا مگر جب اوجلان نے کینیا کے دارالحکومت نیروبی سے یورپ میں قائم کردوں کی تنظیم ''کرد پارلیمنٹ'' سے موبائل کے ذریعے رابطہ قائم کیا تو فوراً اسے نہ صرف ٹریس کر لیا گیا بلکہ اس کی روپوشی کے مقام کا بھی پتہ چلا لیا گیا اور صرف چند گھنٹوں کے بعد اوجلان ترک کمانڈوز کے نرغے میں استنبول روانہ ہو رہا تھا جس پر یونانی وزیر خارجہ نے چیختے ہوئے یونانی اخبارات کو بیان دیا تھا کہ ''ہم نے اس احمق کو منع کیا تھا کہ موبائل فون استعمال نہ کرے..... مگر تمام تر جدید ٹیکنالوجی کے باوجود امریکی صومالیہ میں صومالین لیڈر جنرل فرح عدید کا ٹھکانہ معلوم نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرح عدید نے امریکی فوج کے ساتھ جنگ کے دوران ایک مرتبہ بھی موبائل فون اور دوسرے الیکٹرانک آلات استعمال نہیں کئے تھے۔

ستر کی دہائی کے آخر میں دنیا میں کمپیوٹر عام ہونا شروع ہو گیا جس نے انسانی کام کی استعداد کئی گناہ بڑھا دی اور اس کے معاملات اور طرز عمل میں فرق آنے لگا۔ عالمی خفیہ ایجنسیاں اس معاشرتی اور عملی تبدیلی پر نظر رکھے ہوئے تھیں جوں جوں کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں جدت آتی گئی توں توں انٹیلی جینس ایجنسیاں اس شعبے میں زیادہ فاعل ہوتی گئیں۔ 1982ء کے بعد سے لے کر اب تک جن کمپیوٹرز سوفٹ ویئر میں جدت پیدا کی گئی اس میں ہونے والے کام کو ٹریس کرنے کی ٹیکنالوجی پہلے متعارف کرائی جانے لگی۔ مگر ان کا استعمال صرف خفیہ

ایجنسیوں کے لئے ہوتا تھا اس میں NSA سرفہرست ہے۔ 1985ء میں کمپیوٹر سسٹم کے مشہور ماہر ولیم ہملٹن نے NSA میں باقاعدہ ملازمت اختیار کی ہوئی تھی۔ یہ شخص NSA میں کمپیوٹر معلومات کے شعبے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے NSA میں ایک پروگرام متعارف کرایا تھا جس کا نام پرامس (Promis) رکھا گیا۔ اس پروگرام کے ذریعے ہونے والی پیغام رسانی کو جن میں انٹرنیٹ، ای میل اور فیکس موڈیم شامل ہے آسانی کے ساتھ اپنے سسٹم میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ولیم ہملٹن نے NSA کی ملازمت چھوڑ کر اپنی الیکٹرانک کمپنی (Inslaw) کے نام سے قائم کر لی۔ یہاں آنے کے بعد ولیم ہملٹن نے کمپیوٹر کے ذریعے پیغام رسانی کے کام کو ریکارڈ کرنے کی استعداد کو مزید ترقی دی۔ اس سسٹم میں انتہائی جدت پیدا کرنے کے بعد اسے نیا نام Pronss- Vax کا نام دیا گیا مگر اس سے پہلے کہ اس جدید سسٹم کو حکومت کو تجارتی بنیادوں پر فروخت کیا جاتا اسے اسرائیلی موساد نے اڑا لیا جس نے اس میں مختلف قسم کی تبدیلی کر کے حلیف ممالک کی سیکرٹ ایجنسیوں کو بیچنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ سسٹم بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں، عالمی سطح کے بینکوں کو فروخت کر دیا گیا۔ اس بات کا انکشاف اسلحے کے بین الاقوامی یہودی تاجر ''بن منانت'' نے اپنی کتاب (Profits of war) میں کیا۔ اس کتاب میں CIA اور NSA کے عالمی نیٹ ورک پر بڑی حد تک روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کس طرح عالمی سطح پر جاسوسی کیلئے مکالمات سنتی ہیں۔ ایک امریکی صحافی نے بعض وکلاء کے ساتھ مل کر NSA کے ایک کارکن کے ساتھ مل کر اس موضوع پر تحقیقی کام شروع کیا تھا مگر جلد ہی یہ کارکن ''نامعلوم'' وجوہ کی بنا پر قتل ہو گیا...... جرمن صحافی اس موضوع کو برسرعام لانے کے حق میں ڈٹ گئے اور جو کچھ اس موضوع پر ان کے پاس تھا اسے جرمن زبان کی ایک کتاب Die Datin Mafia (معلوماتی مافیا) کے نام سے 1990ء میں شائع کر دیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس یورپی یونین سے تعلق رکھنے والے مغربی ممالک بھی امریکہ کے اس خطرناک شعبے میں مشروط طور پر شریک ہو چکے ہیں اور کئی مشترکہ ''منصوبوں'' پر کام بھی کر رہے ہیں۔ یہ خبر جرمنی کے جریدے ''انٹرنیٹ'' نے سب سے پہلے آؤٹ کی تھی اس کے بعد برطانوی اخبار The Observer نے یورپی ممالک کے اس خفیہ پروجیکٹ کو بے

نقاب کر دیا جس میں انہوں نے امریکی NSA کی طرز پر چلتے ہوئے ٹیلی فون، فیکس، انٹرنیٹ، موبائل فون کے ذریعے مکالمات اور پیغام رسانی کے دوسرے ذرائع ریکارڈ کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ یورپی ممالک نے اپنے اس خفیہ پروجیکٹ کا نام Enfopol-98 رکھا۔ خیال ہے کہ جلد ہی اس پروجیکٹ کے ساتھ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا منسلک ہو جائیں گے۔ اس طرح امریکی ادارہ NSA کا دائرہ لامحدود حد تک وسیع ہو جائے گا۔ امریکہ اور یورپی ممالک کی ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ روسی خفیہ ایجنسی (FSB) بھی اب اس شعبے میں وسیع پیمانے پر کارکردگی دکھانے کے موڈ میں آ چکی ہے۔ مگر ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر اگر دیکھا جائے تو اس میں مجموعی طور پر سب سے زیادہ نقصان اسلامی ممالک کا نظر آتا ہے۔ جنہیں بڑی طاقتوں کی جانب سے مختلف قسم کے فرقہ واریت اور نسلی تنازعات میں الجھا دیا گیا ہے۔ پاکستان، افغانستان، ایران، مصر، لیبیا، شام، اردن اور عراق ان مغربی ایجنسیوں کے ٹارگٹ ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی دھماکے سے تھوڑا عرصہ پیشتر NSA کی تمام توجہ جنوبی ایشیا پر مرکوز ہو چکی تھی۔ تاکہ پاکستانی متوقع ردعمل کو پہلے ہی رپورٹ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے بحیرہ عرب میں کراچی اور مکران کے ساحل کے قریب امریکی، بحری جہاز جاسوسی کرتے رہے۔ افغانستان پر کروز میزائلوں سے حملہ بھی NSA کی نشاندہی پر کیا گیا تھا جن کی رہنمائی ''شمالی علاقوں'' میں لگے بعض پراسرار لاسلکی بوسٹر کر رہے تھے۔ یہ کام ابھی بھی شد و مد سے جاری ہے۔!

ایشلون

(امریکہ کا مواصلاتی جاسوسی نظام)

جب امریکی جاسوس طیارہ EP-3 ایریز کو چینی فضاؤں کی خلاف ورزی کے جرم میں ایک چینی جزیرے ہینان (Hainan) میں اتار لیا گیا اور طیارہ اور اس کے عملے کو چینیوں نے اپنی تحویل میں لے لیا تو دنیا پر نئے انکشافات ہونا شروع ہو گئے اس کے ساتھ ہی دنیا دو بڑی طاقتوں کے درمیان تنازع کی زد میں آ گئی، تنازع کی سنگینی میں اضافہ چینی ایف ۸ لڑاکا طیارے کی تباہی کی وجہ سے ہوا جس پر چینی انتظامیہ نے امریکہ سے باقاعدہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگنے کی شرط عائد کردی۔ کچھ روز تک امریکیوں نے اپنی روایتی غنڈہ گردی سے کام لیتے ہوئے بغیر معذرت کے امریکی عملہ رہا کرنے پر زور دیا اس سلسلے میں انہوں نے ہر طرح کی دھمکیاں بھی دیں مگر چینیوں نے ایک باعزت اور باوقار قوم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور یوں معافی مانگنے پر ہی امریکیوں کی جان چھوٹ سکی۔

جدید ترین جاسوسی آلات سے لیس امریکی طیارہ EP-3 امریکی جاسوسی کے اس نیٹ ورک کا اہم حصہ تھا جو امریکہ نے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا رکھا ہے۔ اس جاسوسی نیٹ ورک میں چین، شمالی کوریا، جاپان، انڈونیشیا اور ملائیشیا کی عسکری اور اقتصادی سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ان سرگرمیوں کو امریکہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنا حق سمجھتے ہوئے جاری رکھے

ہوئے ہے۔علاقے میں امریکہ کی ان مواصلاتی جاسوسی سرگرمیوں کا دائرہ چین اور تائیوان پر زیادہ محیط ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی ہر پیچیدہ چیز کی نقل تیار کر لینے والا چین امریکہ کی ان سرگرمیوں سے بے خبر ہے، تاہم اپنی تجارتی سرگرمیوں کا دائرہ بڑھانے کا خواہشمند چین طویل عرصے سے جنگی کیفیات سے پہلو بچاتا رہا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ عالمی تجارت پر زور دیا جاسکے۔چین کی اسی کامیاب تجارتی اور اقتصادی پالیسی نے امریکی منڈی پر بڑی حد تک غلبہ حاصل کرلیا ہے جو مغربی سرمایہ داروں کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا۔اسی لئے امریکہ وقفے وقفے سے تائیوان کی جانب سے چین کے لئے جنگی کیفیات کا سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔امریکی اور چینی طیاروں کے ٹکراؤ کا حادثہ بھی چین اور تائیوان کے درمیانی سمندر میں پیش آیا جہاں امریکہ کے بحری جنگی جہاز اور طیارے جدید جاسوسی آلات کے ساتھ گشت پر رہتے ہیں۔چین اور جاپان کے سمندروں میں امریکہ کی عسکری موجودگی سیاسی دباؤ کے لئے از حد ضروری ہے۔

علاقے میں امریکی جاسوسی سسٹم کے تحت کام کرنے والے EP-3 طیاروں میں ایسے جدید آلات نصب ہیں جو دنیا میں کہیں بھی مواصلاتی آلات کو ٹریس کرسکتے ہیں ٹیلیفون، فیکس، ای میل اور انٹرنیٹ تک اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حساس جاسوسی نظام کا کنٹرول کس امریکی ایجنسی کے پاس ہے؟ اپنی وسعت اور طریقہ کار کی بنا پر یہ سی آئی اے کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا۔اس نظام کی وسعت دنیا میں اس قدر ہے کہ اس کے لئے امریکہ کو خفیہ طور پر الگ نظام وضع کرنا پڑا ہے۔اس کا انکشاف گذشتہ دنوں یورپی یونین پارلیمینٹ کی ایک تحقیقاتی ٹیم نے کیا ہے یہ انکشاف امریکہ کے جدید ترین جاسوسی نظام ''ایشلون'' کے بارے میں ہے جس کی بڑی ذمہ داریوں میں عالمی سیاسی اور اقتصادی معلومات کے علاوہ بھاری اسلحے کے سودوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا شامل ہے۔

''ایشلون'' کی سرگرمیوں کا یورپ میں سب سے پہلے انکشاف برطانیہ کے شہر یارک شائر کے مضافات مین ودہل Men With Hill کے علاقے میں ہوا جس پر یورپی یونین کی جانب سے خاصے غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔برطانیہ میں واقع ایشلون کے اس جاسوسی مرکز میں

بے شمار چینلوں کی بہتات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ امریکہ اس مرکز کے ذریعے یورپ اور افریقہ کے علاوہ شرق الاوسط کی جاسوسی بھی کرتا ہے۔ایک فرانسیسی وکیل ڈیوڈ نتاف کے مطابق ''برطانیہ یورپی یونین کا رکن ہونے کے باوجود کیوں ایسی حرکتوں پر اتر آیا ہے؟ وہ کیوں ایشلون کی جاسوسی سرگرمیوں میں معاون بن کر اپنے ہی حلیفوں کی جاسوسی کرا رہا ہے''۔ذرائع کے مطابق امریکہ کا یہ جاسوسی نظام امریکن نیشنل سیکورٹی کونسل کے تحت کام کرتا ہے جس میں امریکہ کے علاوہ چار ممالک برطانیہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا بھی شامل ہیں۔چین اور تائیوان کو مانیٹر کرنے والا امریکی جاسوسی سسٹم وسط آسٹریلیا میں واقع ہے۔جبکہ برطانیہ کے علاقے ''مین ودہل'' میں واقع ایشلون کے مرکز سے فیکس، ٹیلی فون اور ای میل کے ذریعے ہونے والی تجارت، دفاعی سودوں اور عسکری نقل و حرکت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔یورپی یونین کے ڈائریکٹر برائے فنی معلومات ایلین بوم بیڈو کے مطابق ''ایشلون کے تحت کام کرنے والے اس مرکز کے ذریعے امریکہ کی حریف یورپین کمپنیوں کے سودوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں اس نظام کے تحت اسی فیصد جاسوسی اقتصادی مفادات کے حصول کے لئے کی جاتی ہے''۔یورپی ذرائع کے مطابق یورپ میں ''ایشلون'' کے تحت امریکہ تین وجوہات کی بنا پر جاسوسی کرتا ہے اس کے علاوہ اس کی سرگرمیوں کا تعلق اسلحے کی تجارت یا تخریب کاری کی کارروائیوں سے نہیں ہے۔۔! اس استدلال میں یورپی ذرائع بتاتے ہیں کہ:

☆ پہلی وجہ یہ ہے کہ جرمنی کی کمپنی فاکس ویگن اور امریکی فرم جنرل موٹرز کے درمیان بین الاقوامی سودوں کے معاملات میں تنازع شروع ہوا جس کی وجہ طرفین کے یہ الزامات تھے کہ انہوں نے صنعتی اور فنی شعبے میں جاسوسی کی ہے تا کہ ان کمپنیوں کی پیشگی پیداوار کا علم ہو سکے۔جرمن کمپنی کے عہدیداروں نے انکشاف کیا ہے کہ ''ہم نے اپنے آئندہ کے پروجیکٹ مکمل رازداری میں رکھے ہوئے ہیں مگر ان کی حرف بحرف تفصیلات جنرل موٹرز تک پہنچ گئی ہیں۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ معلومات جرمنی میں موجود ''ایشلون'' کے ذریعے مائکروویو سسٹم کی مدد سے اڑائی گئیں تھیں''۔

☆ دوسری حالت میں فرانسیسی الیکٹرانک کمپنی ٹامسن سی ایس ایف کا تنازع ہے۔اس کمپنی نے برازیل کے ساتھ راڈار کی سپلائی کا معاملہ طے کیا، یہ سودا 1.4 بلین ڈالر کا تھا

مگر امریکیوں نے اس سودے کے دوران ہونے والی تمام ٹیلی فونک گفتگو اور ای میل پیغامات اڑا لئے اور تفصیلات امریکن کمپنی ریثیون کے حوالے کر دیں یہ کمپنی بین الاقوامی سطح پر فرانسیسی کمپنی کے ساتھ مقابلے کی حالت میں رہتی ہے۔

☆ تیسرا مسئلہ ائربس کمپنی اور امریکن بوئنگ اور میکڈونلڈ ڈگلس کے درمیان ہے۔ ائربس کمپنی کا سودا سعودی عرب کے ساتھ ہو رہا تھا اس سودے کی مالیت تقریباً ایک بلین ڈالر تھی مگر امریکیوں نے اس سودے کی تفصیلات اڑا کر امریکن بوئنگ کے حوالے کر دیں جنہوں نے ائربس کمپنی سے کم قیمت پر پیش کش کر کے سودا منسوخ کرا دیا۔

یورپی یونین کی تحقیقاتی کمیٹی کے مطابق اب تک امریکن ایجنسی ''ایشلون'' کی زیادہ کارروائیوں سامنے نہیں آسکیں اور نہ ہی اس بات کا ثبوت ملا ہے کہ ''سننے'' کے سوا ایشلون کسی اور قسم کی کارروائی میں ملوث پائی گئی ہے۔ مگر اس کمیٹی کی تحقیق سے ہٹ کر یورپ میں ایسے شواہد موجود ہیں کہ امریکیوں نے سفارتی حدود بھی پار کیں۔ چند سال پہلے جرمنی سے ایک امریکی سفارتکار کو اس بنا پر نکال دیا گیا تھا کہ وہ جرمنی کی فنی مہارت اور دیگر ٹیکنیکل معلومات جمع کر کے واشنگٹن روانہ کرتا تھا۔ مگر برطانیہ میں ویسٹ مین ہل کے مقام پر امریکی جاسوسی نظام کی موجودگی نے تہلکہ مچا دیا اور اس احتمال کا اظہار کیا جانے لگا ہے کہ امریکی ''سننے'' سے بھی زیادہ کے معاملات میں ملوث ہیں۔

ویسٹ ودہل کا علاقہ برطانوی وزارت دفاع کی ملکیت تھا جسے ۱۹۶۶ء میں امریکیوں نے برطانوی حکام سے خرید لیا تھا اور اس کا نام ''Ground Station F.83'' رکھا گیا تھا جو اب دنیا میں جاسوسی کی غرض سے ''سننے'' کا سب سے بڑا مرکز تصور کیا جاتا ہے اور ۱۵۶۰ ایکڑ رقبے پر محیط ہے۔ یہ علاقہ برطانویوں کے لئے مکمل طور پر ممنوع ہے، اس کے چاروں طرف بجلی کی حفاظتی باڑ لگی ہوئی ہے جبکہ گارڈز اور محافظ کتے ہر وقت گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس نظام میں استعمال ہونے والی بجلی مکمل طور پر برطانوی الیکٹرک سپلائی سے الگ ہے۔ ہاں پہلے چار سو کے قریب فنی ماہرین کام کرتے تھے مگر اب ان کی تعداد ۱۴۰۰ کے قریب پہنچ چکی ہے ان میں سے ۳۷۰ برطانوی ہیں جو صرف سیکورٹی کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اتنی ہی تعداد برطانیہ کی داخلی خفیہ ایجنسی MI5 میں تعینات ہیں۔ امریکی ماہرین میں

KURF

انجینیر، فزکس اور ریاضی کے ماہر، زبانوں کے ماہر اور کمپیوٹر ماہرین شامل ہیں۔

برطانیہ میں موجود ''ایشلون'' کا یہ جاسوسی مرکز تمام معلومات اکٹھی کر کے براہ راست امریکن نیشنل سیکورٹی کونسل کے ہیڈ آفس کو جو میری لینڈ میں واقع ہے ارسال کرتا ہے۔ ان میں روزانہ کی معلومات درج ہوتی ہیں جن میں ٹیلی فونک گفتگو، فیکس، ای میل کے پیغامات بھی شامل ہوتے ہیں یہ معلومات روزانہ یورپ افریقہ اور شرق الاوسط سے حاصل کی جاتی ہیں۔ یورپی ذرائع کے مطابق مین ودہل کے مقام پر امریکی مرکز ''ایشلون'' سے ۱۰۰ ملین کے قریب پیغامات کی ریکارڈنگ کی جاتی ہے یہ معلومات جاسوس مصنوعی سیاروں کے ذریعے خود بخود ''ایشلون'' کے کمپیوٹروں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں حاصل ہونے والی ان حساس معلومات کا جدید ترین لینگویج پروگراموں کے ذریعے ترجمہ کیا جاتا ہے اس کے بعد میری لینڈ مرکز کو ارسال کر دی جاتی ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ایک یورپی مصنف جارج آرویل نے امریکہ کے بارے میں مشہور ''بڑے بھائی'' کی اصطلاح وضع کی۔ اس وقت مصنف کا خیال تھا کہ امریکہ ہی یورپی مفادات کے تحفظ کے لئے جاسوسی کے وسیع نظام کو حرکت میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر جس وقت جارج آرویل نے یہ نظریہ پیش کیا تھا اس وقت اسے علم نہیں تھا کہ پانچ برس قبل امریکہ اور برطانیہ ایک خفیہ معاہدے میں منسلک ہو چکے ہیں ۱۷ مئی ۱۹۴۳ء میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا جسے تاریخ میں BRUSA معاہدے کا نام دیا جاتا ہے یہ معاہدہ اس وقت جرمنی کی مواصلاتی جاسوسی ایجنسی ENIGMA کے مقابلے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا تاکہ دنیا کو نازی ازم کا سامنا کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ عالمی جاسوسی کے اس وسیع نیٹ ورک ''ایشلون'' کی بنیاد ریاضی کے مشہور عالم ایلن ٹورینگ کے ذریعے رکھی گئی تھی جو اس وقت نیشنل سیکورٹی ایجنسی NSA میں مشیر کے عہدے پر تعینات تھا۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد امریکیوں کی خواہش تھی کہ یہ نظام خفیہ طور پر پہلے کی طرح کام کرتا رہے تاکہ سرد جنگ میں اس سے استفادہ کیا جاسکے۔ جاسوسی کا یہ نظام طویل عرصے تک دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا مگر اگست ۱۹۸۸ء میں ایک برطانوی صحافی ڈیونکان کیمبل نے اپنی ایک رپورٹ میں اس پر سے پردہ اٹھایا۔ ڈیونکان کی رپورٹ ''مین ودہل'' کے علاقے میں واقع ایشلون

کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

ایک خاتون انجینیر مارگریٹ نیوشام کی مہیا کردہ رپورٹوں پر مشتمل تھی۔مگر این ایس اے نے ان خبروں کی تردید کرتے ہوئے بیان دیا کہ برطانیہ میں اس کا کوئی ایسا مرکز موجود نہیں ہے!

اس انکشاف کے آٹھ سال بعد نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے نیکی ہیگر جو ایک این جی او کا رکن تھا نے اس موضوع پر حساس کتاب ''Secret Authourty'' کے نام سے ۱۹۹۶ء شائع کردی اس کتاب میں مصنف نے امریکہ کے جاسوسی نظام ''ایشلون'' اور اپنے ملک کی اس میں شراکت داری کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ نیکی نے ''ایشلون'' کا طریقہ واردات بیان کیا کہ وہ کس طرح تمام دنیا میں تجارتی، اقتصادی اور عسکری سرگرمیوں کو نوٹ کرتی ہے، کون کون سے طیارے، بحری جہاز اور آبدوزیں اس سے منسلک ہیں اس کتاب کے منظر عام پر آنے پر نیوزی لینڈ سمیت مغربی میڈیا میں ایک مرتبہ پھر شور وغل کی کیفیت طاری ہوگئی۔جس پر امریکیوں نے ایک مرتبہ پھر ڈھٹائی کا ثبوت دیتے ہوئے ''ایشلون'' کے وجود سے ہی انکار کردیا۔امریکن نیشنل سیکورٹی ایجنسی کے ڈائریکٹر مائیکل ہائیڈن نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''ایشلون'' نام کی کوئی ایجنسی امریکیوں کے لئے کام نہیں کرتی اور نہ ہی دنیا میں اس کا کہیں کوئی وجود ہے''۔مگر یورپین ذرائع نے اس انکار کو ہضم کرنے سے انکار کردیا۔مئی ۱۹۹۹ء میں فرانسیسی پبلک پراسیکوٹر جان بیار نے پیرس کی عدالت میں درخواست دی کہ ''فرانسیسی خفیہ ایجنسی DST کے ذریعے اس بات کا پتا چلایا جائے کہ کیا واقعی امریکی عالمی سطح پر ایسا جاسوسی نظام وضع کر چکے ہیں جس کی پہنچ سے دنیا میں ہونے والا کوئی بڑا اقتصادی اور تجارتی معاہدہ محفوظ نہیں'' پیرس کی عدالت میں اس درخواست نے ایک مرتبہ پھر ''ایشلون'' کو لوگوں کے ذہنوں میں زندہ کردیا۔

اس مسئلے کے عدالت میں آتے ہی فرانسیسی حکام کے امریکیوں کے بارے میں شکوک وشبہات جڑ پکڑ گئے کیونکہ فرانسیسی کمپنیوں کو بین الاقوامی سطح پر ''نامعلوم'' وجوہات کی بنا پر بڑے سودوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے ان میں سے راڈاروں اور طیاروں کی دو ڈیلیں قابل ذکر ہیں۔فرانسیسیوں کے مطابق امریکیوں نے برطانیہ میں موجود اپنے جاسوسی نظام ''ایشلون'' کے ذریعے فرانسیسی کمپنیوں کی ڈیل کو حساس آلات کے ذریعے ٹریس کیا اور امریکی کمپنیوں کو اس کی تفصیلات مہیا کردیں جنہوں نے کم ریٹ پر ان سودوں کو بیچ میں سے اچک لیا۔پیرس کی

عدالت میں ایشلون کے بارے میں درخواست آتے ہی مئی ۱۹۹۹ء میں فرانس کی خفیہ ایجنسی DST نے ایک کمیٹی تیار کی اور اس کا سربراہ برطانوی صحافی ڈیونکان کیمبل کو مقرر کیا یہ وہی صحافی ہے جس نے سب سے پہلے ''ایشلون'' پر سے پردہ اٹھایا تھا۔اکتوبر ۱۹۹۹ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ اعلیٰ فرانسیسی حکام کو ارسال کردی گئی جس کے مطابق امریکہ کی جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے ادارے National Security Archive کے تحت یورپین اقتصادی سرگرمیوں کو مانیٹر کیا جاتا ہے باقی تفصیلات نے اس بات کو ثابت کردیا کہ ''ایشلون'' نامی سسٹم نہ صرف موجود ہے بلکہ پوری طرح فعال ہے۔اس رپورٹ کے مکمل ہونے کے چھ ماہ بعد اسے یورپین پارلیمنٹ کی تحقیقاتی کمیٹی کے سپرد کردیا گیا جسے ۱۱ مارچ ۲۰۰۱ء کو شائع کردیا گیا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ''یورپ کی حد تک ''ایشلون'' یورپین کمپنیوں کی جاسوسی کرتی ہے تاکہ اسے امریکی کمپنیوں کے مفاد میں استعمال کیا جاسکے۔''

فرانسیسی ذرائع کے مطابق امریکہ نے ''ایشلون'' کو ۱۹۵۲ء میں مکمل طور پر فعال بنانے کا پروگرام وضع کیا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ دنیا کی نظر سے اسے مکمل طور پر پوشیدہ رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ امریکی کانگرس کے زیادہ تر ارکان بھی اس کے وجود سے بے خبر ہیں! امریکہ کے اس وسیع جاسوسی نظام میں دنیا بھر کے مواصلاتی نظاموں کو ٹریس کرنا شامل ہے تاکہ دنیا خصوصاً یورپ میں ہونے والے عسکری اور تجارتی سودے امریکیوں کی معلومات میں رہیں۔اس نظام کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا کام امریکیوں نے ۱۹۴۶ء میں کیا اس دور میں جدید جاسوسی کے آلات امریکی فوج اور وزارت خارجہ کے زیر استعمال لائے جارہے تھے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں ایسے اسٹیشن قائم کرنے کا دور آیا جن کے ذریعے جاسوس آلات کے ذریعے سننے کا کام لیا جاتا ہے۔دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان اسٹیشنوں کو آپس میں منسلک کرنے کے لئے جدید ترین جاسوس طیارے، بحری جہاز اور آبدوزیں ہر وقت متحرک رہتی ہیں۔نازیوں کے خلاف اس ایجنسی کو استعمال کرنے کے بعد اس کا رخ سرد جنگ کے دور میں سوویت یونین اور اس کے حلیف مشرقی یورپ کی جانب پھیر دیا گیا۔اس دور میں اس سسٹم کو United States Communication Intelligence Board (U.S.C.I.B) کے نام سے جانا جاتا تھا۔

www.facebook.com/kurfku/blogspot.com

اسی دوران 1943ء میں برطانیہ [illegible]
Government Communication (G.C.H.Q) Headquarters کا نام دیا گیا تھا۔ جو Brusa معاہدے کے تحت یورپ میں امریکی مفادات کے لئے کام کرتی تھی مگر اس کا زیادہ تر مقابلہ نازیوں کی جرمن ایجنسی Enigma سے تھا۔

1947ء میں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان دوسرا خفیہ معاہدہ عمل میں لایا گیا جسے Ukusa کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں امریکہ کی U.S.C.I.B سرد جنگ کے دوران سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں اپنی برطانوی ہم شغل G.C.H.Q کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ ذرائع کے مطابق امریکہ برطانیہ گٹھ جوڑ کے نتیجے میں امریکہ نے شرق الاوسط اور جنوب مشرقی ایشیا میں خاصا استفادہ کیا یہاں برطانویوں نے امریکہ کے لئے اہم خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں برطانیہ نے اپنی دو کالونیوں میں امریکیوں کو جاسوسی کے حساس سسٹم نصب کرنے کی اجازت بھی دی ان میں ایک برطانوی اڈا Agios Nikolaos قبرص میں واقع ہے جبکہ دوسرا ہانگ کانگ میں Little Sai Wan کے علاقے میں نصب تھا۔ یہ دونوں جدید نظام امریکہ کے حساس جاسوسی مصنوعی سیاروں سے منسلک ہیں ان کی زد میں دنیا بھر میں مواصلاتی نقل و حمل کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے ۲۷۰۰۰ ہزار فنی ماہرین ہمہ وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق امریکہ کے اس جاسوسی سسٹم ''ایشلون'' سے دنیا کے چار حلیف ممالک کے جاسوسی سسٹم منسلک ہیں:

☆ Government Communications Headquarter یہ برطانوی ایجنسی ہے جو امریکی نیشنل سیکورٹی کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ برطانیہ میں اس کے دو اڈے ہیں ایک Menwith Hill میں اور دوسرا Morwenstow میں واقع ہے۔

☆ Defence Signal Directorate یہ آسٹریلوی مواصلاتی ایجنسی ہے اس کا اسٹیشن آسٹریلیا میں Geraldton کے مقام پر واقع ہے۔ امریکی جاسوسی ایجنسی اس [illegible] سے علاقے میں [illegible]

کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش KURF

☆ Government Communications Headquarters

[illegible] Security Establishment کا تعلق [illegible] امریکہ میں واقع اس کے تیسرے بڑے اسٹیشن سے منسلک ہے اسے Yakima اسٹیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی ادارت کی براہ راست ذمہ داری امریکن نیشنل سیکورٹی کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ Fort Meade کا اسٹیشن جو امریکہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے اس نظام کے ساتھ منسلک ہے۔

☆ Government Communications Security Bureau یہ نیوزی لینڈ کی مواصلاتی خفیہ ایجنسی ہے جو ایشلون کے تحت کام کرتی ہے اس کا اسٹیشن نیوزی لینڈ میں Waihopai کے مقام پر واقع ہے۔ تمام تر رازداری کے باوجود ان جاسوسی مراکز کی بہت سی تفصیلات اب تک سامنے آچکی ہیں۔

☆ امریکہ میں واقع ایشلون کے دو اسٹیشنوں کی ذمہ داری میں لاطینی امریکہ، روس اور چین کے علاوہ ایشیا کے کچھ حصے کی مسلسل معلومات حاصل کرنا شامل ہے۔

☆ برطانیہ میں واقع ایشلون کے دو اسٹیشنوں کی ذمہ داری میں یورپ، ماسکو سے ملحق کچھ علاقہ، شرق الاوسط اور افریقہ کا علاقہ آتا ہے۔

☆ نیوزی لینڈ میں واقع اسٹیشن سے بحرالکاہل میں فرانسیسی ملکیت کے حامل جزائر ''پولینیشیا'' پر نظر رکھی جاتی ہے، فرانس ان جزائر پر ایٹمی تجربات کرتا رہا ہے۔

☆ آسٹریلیا میں واقع اسٹیشن کے ذریعے جنوب مشرقی ایشیا اور وسطی چین کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔

یورپی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اس خسارے نے فرانس اور جرمنی کو زیادہ الرٹ کر دیا، جو ان انکشافات کے بعد ''ایشلون'' کے خلاف خاصے مستعد نظر آتے ہیں۔

''ایشلون'' کے بارے میں جب تحقیقات کا دائرہ مزید وسیع کیا گیا تو بہت سے ذرائع نے اس حساس ایجنسی میں کام کرنے والے افراد کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ظاہری بات ہے کہ حاضر سروس رکن کسی قسم کی معلومات نہیں پہنچا سکتا تھا کیونکہ عام طور پر اس بات کا پتا چلانا انتہائی [illegible] جواب ریٹائر ہو چکے ہیں، اور کسی وجہ سے اس ایجنسی کی سرگرمیوں کو ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں معلومات

برائے علم و دانش

کے لئے مفید ثابت ہو سکتے تھے، اس لئے یورپ کے بعض ادارے جن میں ایک اسلامی ملک سے تعلق رکھنے والا واشنگٹن میں مقیم صحافی بھی شامل ہے انہوں نے واشنگٹن میں ایک ایسے شخص ''وین میڈسن'' کا سراغ لگایا جو سرد جنگ کے زمانے میں اس ایجنسی سے وابستہ رہ چکا تھا اور ''ایپک'' نامی تنظیم کے ذریعے امریکی شہریوں کی جاسوسی کے خلاف مہم چلانا چاہتا ہے۔ ایشلون کے بارے میں اس سے چند سوالات کئے گئے جو اس طرح ہیں:

س۔ آپ نے اس ایجنسی کو کیوں چھوڑا؟ یہاں آپ کے کام کی نوعیت کیا تھی؟

ج۔ یہ سرد جنگ کے زمانے کی بات ہے اور میں جاسوسی کے خارجی شعبے سے منسلک تھا۔ اس زمانے میں صدر ریگن امریکہ کے صدر تھے ان کے دور میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ میں نے اس ایجنسی کو اس لئے چھوڑا کہ میری ٹرانسفر ملٹری انٹیلی جنس میں ہو چکی تھی۔ یہی میرا اصل شعبہ تھا کیونکہ ایشلون میں کام کرنے سے پہلے میں ملٹری انٹیلی جنس سے ہی وہاں ٹرانسفر کیا گیا تھا۔

س۔ کیا ایشلون سے تعلق رکھنے والے حکام آپ سے ناراض نہیں تھے، کیونکہ پہلے آپ نے اس ایجنسی کو چھوڑا پھر اس کے کچھ رازوں کو فاش کر دیا۔

ج۔ میں نے سی آئی اے کے بعض سابق جاسوسوں کی طرح راز فاش نہیں کئے ہیں۔ سی آئی اے کے سابقہ جاسوسوں نے تو غیر ممالک میں اپنے بعض ساتھیوں کے نام تک افشا کر دیے تھے جس کی وجہ سے امریکہ کے دشمنوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کمیونزم کا خاتمہ ہو چکا اس لئے اب اس ایجنسی کو کمیونزم کی بجائے اپنے ہم وطنوں کی جاسوسی نہیں کرنی چاہئے۔

س۔ کیا آپ ''ان'' کی ناراضگی سے خوفزدہ ہیں؟

ج۔ نہیں۔۔ میں امریکی شہری ہوں اور اپنا قانونی حق جانتا ہوں۔

س۔ ہمارے اور آپ کے درمیان اس وقت ٹیلی فون پر گفتگو ہو رہی ہے آپ کا کیا خیال ہے کہ ''وہ'' سن رہے ہوں گے؟

ج۔ بالکل نہیں۔

س۔ لیکن اگر کال امریکہ کے باہر سے ہو تو؟

ج۔ پھر ممکن ہے کیونکہ وہ امریکہ کے باہر سے آنے والی ہر فون کال، فیکس اور ای میل لوٹ کرتے ہیں۔

س۔ لوگ سی آئی اے کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہیں مگر اس کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں، کیوں؟

ج۔ کیونکہ اس ایجنسی سے متعلق حکام راز داری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ میں جب ''وہاں'' کام کرتا تھا تو مجھے بھی اجازت نہیں تھی کہ میں اس بات کا ذکر کروں کہ کن لوگوں کے ساتھ میں کام کرتا ہوں۔ بلکہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ بھی معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہاں بالٹی مور (میری لینڈ ریاست کے علاقے فورٹ میڈ) میں اس ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر کہاں واقع ہے۔

س۔ آپ کے خیال میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اس ایجنسی کو اپنا حجم کم کر دینا چاہئے اور وہ ایسا کر سکتی ہے؟

ج۔ یہاں واشنگٹن میں آپ نے کوئی ایسی ایجنسی یا وزارت دیکھی ہے جو یہ چاہے کہ دائرہ اختیار کے طور پر وہ اپنا حجم کم کر لے میرے خیال میں یہ جاسوسی کے طبعی قوانین کے خلاف ہے۔ اس ایجنسی کے ڈائریکٹر نے پچھلے سال کہا تھا کہ وہ ایک شعبے کا اور اضافہ کر رہے ہیں جو انٹرنیٹ انٹیلی جنس کے نام سے کام کرے گا کیونکہ مستقبل میں ہونے والی جنگ جو انٹرنیٹ پر لڑی جائے گی ہمیں ابھی سے اس کے لئے تیاری کرنا ہے۔

س۔ یہ کس کس کی جاسوسی کرتے ہیں؟

ج۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کر دیتا ہوں کہ یہ پوپ، دلائی لاما اور لیڈی ڈیانا اور اس کی بارودی سرنگیں صاف کرنے والی تنظیم کی بھی جاسوسی کرتے رہے ہیں اس وقت تو میں دستاویزات کے ساتھ ثبوت پیش نہیں کر سکتا مگر ایسا فی الواقع ہے۔ کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ایجنسی ایک ایسی تنظیم کی جاسوسی کرتی ہے جو بارودی سرنگیں صاف کرنا چاہتی ہے یا پھر اس ایجنسی کی ایسی کیا مصلحت ہے کہ یہ تباہ کن سرنگیں ہمیشہ زمین کے اندر ہی رہیں! اس میں شک نہیں کہ یہ اب اردن کی سابقہ ملکہ نور کی بھی جاسوسی کرتے ہوں گے جو ڈیانا کے بعد اس مہم پر نکلی ہوئی ہیں۔

س۔ یہ ادارہ جاسوسی کے لئے کونسا طریقہ اختیار کرتا ہے؟

ج۔ ''ایشلون'' تمام دنیا میں کمیونی کیشن کے ذرائع اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ہر لمحے میں ہونے والی بات چیت ان کے ریکارڈ میں آرہی ہوتی ہے۔ یہ ایک سیکنڈ میں ایک ملین ای میل پیغامات ٹریس کرتے ہیں۔ یہی حال ٹیلی فون اور فیکس کا ہے اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو یہ یومیہ تین بلین کاغذات پر درج معلومات پر مبنی ہوگا۔ کیا کوئی اس پر یقین کرسکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔۔ مگر ''وہ'' ایسا کررہے ہیں۔

س۔ معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ یہ لوگ کیسے جمع کرلیتے ہیں؟

س۔ کمیونی کیشن جاسوسی میں ایک نظام ''کومینٹ'' ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک اور سسٹم ہے جسے ہم ''ویرڈسبوٹ'' کہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ کام تیزی کے ساتھ کمپیوٹر میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے کسی بھی مقام سے کوئی ریڈار کوئی اشارہ دے رہا ہو تو اسے یہ کیچ کرلیں گے۔

س۔ اس طرح حاصل ہونے والی معلومات کی کوئی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے؟

ج۔ یقیناً، سب سے پہلے اہمیت کے لحاظ سے وہ معلومات آتی ہیں جو غیر ممالک کی وزارت دفاع یا وزارت خارجہ سے متعلق ہوں۔ کسی بھی ملک کی وزارت خارجہ دنیا میں کہیں بھی اپنے ملک کے سفارتخانے کو کوئی پیغام ارسال کرے گی تو اسے ٹریس کرلیا جائے گا۔ اسی طرح بڑی بڑی اقتصادی کمپنیوں کی آپس کی گفتگو، سائنسدانوں کے آپس کے پیغامات یہاں تک کہ منشیات کے سمگلروں کی باتیں اور دہشت گردوں کی خفیہ گفتگو بھی اس ادارے کے تحت ریکارڈ کی جاتی ہے۔

س۔ اس ادارے کے تحت جاسوسی کے مراکز دنیا میں کہاں کہاں ہیں؟

ج۔ مواصلات کے شعبے میں سب سے پہلے آبدوزوں کے ذریعے دنیا کے تمام سمندروں میں نیٹ ورک کیبلوں کا جال بچھایا گیا ہے جن کو براہ راست بوسٹر سسٹم سے حساس مصنوعی سیاروں سے منسلک کردیا گیا۔ ریاست ویسٹ ورجینیا میں شوگر گروف کے مقام پر خلاء میں کنٹرول کرنے کا سسٹم نصب ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا میں اس کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔

س۔ اسی نظام کو ایشلون کہا جاتا ہے؟

ج۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یورپین یا ان کے علاوہ لوگ ایشلون کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہ تمام ادارے ایشلون کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں اور خود ایشلون نیشنل سیکورٹی ایجنسی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔۔۔!

س۔ مگر این ایس اے تو اس کے وجود سے انکار کرتی ہے؟

ج۔ اس سے پہلے این ایس اے اپنے وجود سے بھی انکار کرتی تھی۔۔۔

س۔ کیا وائٹ ہاوس یا امریکن کانگرس ''ایشلون'' کے وجود سے باخبر ہیں؟

ج۔ NSA اس موضوع پر بات نہیں کرتی۔ آپ کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ موضوع انتہائی حساس ہے۔ ہم امریکی بھی دوسروں کی طرح اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کام کے لئے بہت ہی حساس اور خفیہ پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے بارے میں کانگریس بہت کچھ جانتی ہو۔

س۔ کیا کانگریس اس کے بارے میں جاننا چاہے گی؟

ج۔ چند سال قبل کانگرس کی انٹیلی جنس کمیٹی نے ایشلون کے بارے میں سوال اٹھایا تھا۔ اس کمیٹی کا سربراہ بھی سی آئی اے کا سابق جاسوس پورٹر گوس تھا مگر این ایس اے نے صاف جواب دیا تھا کہ وہ اس موضوع پر زبان نہیں کھول سکتی کیونکہ یہ ایک انتہائی حساس موضوع ہے جس کا تعلق امریکہ کی سلامتی سے منسلک ہے۔

س۔ ''ایپک'' کے نام سے آپ کی تنظیم کے کیا مقاصد ہیں؟

ج۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے ہم غیر ممالک میں امریکی جاسوسوں کے نام نہیں افشا کررہے۔ ہم اس سلسلے میں NSA کے ساتھ ہیں مگر ہمارا اختلاف ہے کہ اس تنظیم کو امریکی ہم وطنوں کی جاسوسی کے لئے استعمال نہ کیا جائے اس لئے ہم ''ایشلون'' کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لائے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے (ECLU) تنظیم جو امریکی شہری حقوق کے لئے کام کرتی ہے، کے ساتھ اتفاق رائے کیا ہے کہ اس مسئلے کو ہم مل کر امریکی عدالتوں میں اٹھائیں گے۔

س۔ کیا امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفاد میں بھی جاسوسی کی جاتی ہے؟

ج۔ اب یہ کوئی راز نہیں کہ امریکی ایجنسی ایسا کرتی ہے۔ امریکہ میں ایسا یورپی اور تیسری دنیا کی اقتصادی کمپنیوں کے خلاف کیا جاتا ہے تاکہ امریکی کمپنیوں کو کسی قسم کا اقتصادی یا

تجارتی نقصان نہ ہو۔اس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ چند سال قبل امریکہ کے سابق صدر کلنٹن نے ایشلون کو حکم دیا تھا کہ وہ جاپان کی کارساز کمپنیوں کی جاسوسی کرے تاکہ اس کا فائدہ امریکی فورڈ، جنرل موٹرز اور کرائسلر کمپنیوں کو ہو سکے۔

س۔آپ کے خیال میں کیا یہ بات پسندیدہ ہے؟

ج۔اس بات کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ ہر ملک کی اپنی جاسوس ایجنسیاں ہوتی ہیں جو ملکی مفادات کے لئے کام کرتی ہیں۔ برطانیہ بنک آف انگلینڈ کے حق میں ارب پتی رابرٹ میک سیل کے خلاف جاسوسی کرتا رہا ہے۔جنوبی کوریا کی خفیہ ایجنسی کینیڈا کی تین کمپنیوں کی جاسوسی کرتی رہی ہے۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ امریکی کی ان جاسوسی سرگرمیوں سے دنیا بھر میں حکومتوں اور اقتصادی کمپنیوں کے درمیان ہونے والے سودوں میں رشوت کے کئی اسکینڈل بھی منظر عام پر آجاتے ہیں۔

Ω Ω Ω

فیبس FIBS

یہ چالیس برس پہلے سرد جنگ کے عروج کی بات ہے امریکی صدر جان ایف کینیڈی اور سوویت لیڈر خروشیف کے درمیان میزائلوں کی تنصیب پر اختلافات عروج پر پہنچ چکے تھے،سوویت یونین نے امریکہ کے پہلو میں واقع ملک کیوبا میں میزائلوں کی تنصیب کا کام شروع کررکھا تھا جس کی وجہ سے صدر کینیڈی نے خروشیف کو ایٹمی جنگ کی دھمکی دے رکھی تھی اس کشمکش میں دنیا کو موت اپنی دہلیز پر کھڑی نظر آرہی تھی ،اسی اثنا میں کینیڈی نے خروشیف کو ایک ٹیلی گرام روانہ کیا جس میں سوویت اقدامات کو عالمی بقاء کے لئے خطرناک قرار دیا گیا تھا یہ پیغام سننے کے بعد خروشیف جو پہلے ہی اپنے غصے اور جارحانہ انداز کی وجہ سے مشہور تھے نے چیخ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ان کی یہ دھاڑ اور ردعمل میں ادا کئے گئے الفاظ ماسکو کے امریکی سفارتخانے میں بھی سنے گئے اور چند لمحوں میں سوویت یونین کا متوقع جواب کینیڈی کی میز تک پہنچ چکا تھا ،بعد میں جب سوویت لیڈر خروشیف کا رسمی جواب وائٹ ہاؤس پہنچا تو امریکی اس خط کا ''جواب'' پہلے ہی تیار کر چکے تھے---!یہ سب کچھ قبل از وقت سننے کی صلاحیت کی بدولت ہو سکا۔

دنیا میں آجکل اس کو طاقتور تصور کیا جاتا ہے جو مخالف قوتوں کے بارے میں سب سے زیادہ باخبر ہو یہی وہ حقیقت ہے جس پر مغرب نے خاموشی کے ساتھ پچاس سال پہلے کام شروع

گیا تھا اور اب اس میں کوئی ملک حد تک دسترس حاصل کر چکا ہے اس شعبے میں نہ صرف امریکہ فعال ہے بلکہ برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا بھی اس کے شانہ بشانہ اس مکروہ کام میں مشغول ہیں۔اس سے پہلے اسی نوعیت کے دو اداروں کی تفصیلات ''این ایس اے'' اور ''ایشلون'' کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔اب مرتبہ ایک اور امریکی ادارے (Foreign Broadcast Information Service) کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں اس ادارے کا مخفف (FIBS) ہے۔فبس کا شمار بھی ایسے بڑے مغربی اداروں میں ہوتا ہے جو امریکی اور یورپی حکومتوں پر پوری طرح اثر انداز ہیں، دنیا کے تمام براعظم اور ان میں پائے جانے ملکوں کے لیڈروں اور حکومتی اہلکاروں کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس ادارے کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں اتنی وسعت رکھنے کے باوجود یہ ادارہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔اس ادارے کی سب سے بڑی ذمہ داری عالمی رہنماؤں اور بااثر شخصیات کی گفتگو کو سننا اور اسے امریکی رہنماؤں تک پہنچانا ہے تاکہ قبل از وقت ایسی پالیسی اختیار کی جائے جو مطلوبہ شخصیت کے ردعمل کی شکل میں اس کا توڑ ہو۔

لندن سے شائع ہونے والا بین الاقوامی عربی جریدے ''المجلۃ'' نے اپنی اشاعت میں سعودی عرب کے ولی عہد امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کے چار ملکی دورے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''سعودی ولی عہد نے گذشتہ دنوں شام، جرمنی، سویڈن اور مراکش کا دورہ کیا اس دورے کے دوران واشنگٹن کے علاوہ کئی یورپی دارالحکومتوں میں سعودی ولی عہد امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کی گفتگو اور بیانات زیر بحث رہے جو انہوں نے ان ملکوں میں دورے کے آخر میں دیئے، اس کے بعد خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز کی سربراہی میں ہونے والے سعودی کابینہ کے اجلاس میں سعودی عرب کی سیاسی حکمت عملی بھی زیر بحث رہی۔امیر عبداللہ بن عبدالعزیز نے اپنے ان دوروں کے دوران شرق الاوسط کی صورتحال پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ علاقے میں امن اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس سلسلے میں تمام فریق مخلص نہ ہوں انہوں نے کہا کہ امت مسلمہ محو خواب نہیں ہے اور نہ طویل عرصے سے جاری ظلم و ستم پر خاموش ہے۔اس کے بعد واشنگٹن، لندن اور پیرس سے سویڈن اور جرمن حکام کے اس مؤقف پر ردعمل کا سلسلہ شروع ہوگیا جو انہوں نے امیر عبداللہ کے موقف پر اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں دنیا بھر کے ذرائع حرکت میں آئے جنہوں نے چوبیس گھنٹے عالمی صحافتی ذمہ داریاں پوری کرنے والے اداروں جن میں اخبارات، جرائد، ریڈیو اور ٹی وی چینل شامل تھے سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ان تحقیقات کے بعد جو انکشاف ہوا وہ یہ تھا کہ کئی ادارے ایسے ہیں جو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر عالمی سطح پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرتے ہیں''۔ذرائع کے مطابق سعودی ولی عہد امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کی گفتگو کا ریکارڈ رکھنا اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہے،ان اداروں کے تحت ہر لمحے ہر بات اور ہر حرکت ریکارڈ کی جاتی ہے یہ ادارے حکومتی سرپرستی میں کام کرتے ہیں اور جغرافیائی طور پر کام کو آپس میں تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ہر براعظم اور اس کے مختلف حصوں کا ایک ذمہ دار انچارج ہوتا ہے اس کے زیر ادارت ایسے لوگ کام کرتے ہیں جو متعلقہ ملکوں کی زبانیں پوری مہارت کے ساتھ بولتے ہیں۔ان ہی اداروں کے مجموعے کو (FIBS) کہا جاتا ہے۔

فبس (FIBS) کیا ہے؟ اس کے بارے میں سی آئی اے کے ایک اہلکار کا کہنا ہے کہ ''امریکہ کے بارے میں دنیا کے کسی بھی نشریاتی ادارے یا اخبار و جرائد میں جو کچھ چھپتا ہے یا نشر کیا جاتا ہے اسے سی آئی اے کے بڑے افسران روزانہ صبح وائٹ ہاؤس پہنچاتے ہیں'' تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہوئے اس اہلکار نے بتایا کہ سی آئی اے کا ڈائریکٹر یا کوئی ذمہ دار آفیسر روزانہ وائٹ ہاؤس خفیہ معلومات کی تفصیلات پہنچاتا ہے ان میں کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں خفیہ نہیں کہا جاسکتا مثلاً ریڈیو، اخبارات اور جرائد کی خبروں کی تلخیص وغیرہ۔مگر اس کے ساتھ ساتھ سی آئی اے اپنے اور دیگر اداروں کے ذریعے حاصل کردہ ٹاپ سیکرٹ معلومات بھی اس کے ساتھ وائٹ ہاؤس پہنچاتی ہے۔یہ ادارے امریکی سیاست پر دنیا بھر کے حکومتی ردعمل اور ان کے اہلکاروں کی آراء کو ریکارڈ کرتی ہے کسی ایک بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا، اس سے زیادہ میں تفصیلات میں نہیں جاسکتا''۔

سی آئی اے کے اس بڑے اہلکار نے بتایا کہ ''خفیہ اور غیر خفیہ دونوں قسم کی معلومات کے مختلف شعبے ہیں اور یہ شعبے سی آئی اے کے زیر سرپرستی چلنے والے ادارے (FIBS) کے ذریعے اکھٹی کی جاتی ہیں، یہ ادارہ وزارت تجارت کے لئے بھی کام کرتا ہے اب انٹرنیٹ کے ذریعے معلومات متعلقہ اداروں کو منتقل کی جاتی ہیں۔

(FIBS) کے ذریعے روزانہ آٹھ ہزار سے زائد عالمی صحافتی حلقوں اور نیوز چینلوں کی نگرانی کی جاتی ہے جو سو سے زیادہ زبانوں میں کام کرتے ہیں۔ (FIBS) کے مرکزی دفاتر واشنگٹن کے قریب ریسٹون کے علاقے میں واقع ہیں۔ **1941**ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران سی آئی اے کا قیام عمل میں آیا تھا اسی سال فبیس (FIBS) کا ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا تاکہ جنگ میں شریک ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اسی سال امریکی صدر روزویلٹ نے غیر ملکی اخبارات، جرائد اور ریڈیو چینلوں کو سننے کی غرض کے لئے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا فنڈ مختص کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بارے میں امریکیوں کا خیال ہے کہ اس حملے سے پہلے جاپانیوں نے ہونولولو کے امریکی بحری اڈے کی تمام تفصیلات حاصل کرنے کے بعد اسے ہولناک تباہی سے دوچار کیا تھا۔ اس سلسلے میں اب سی آئی اے کے اہلکار کہتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ پرل ہاربر کی تاریخ دوبارہ دہرائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت فبیس کا قیام عالمی براڈ کاسٹنگ کے اداروں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ خاص طور پر جاپانی ریڈیو کی نگرانی کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔

انٹرنیٹ صحافت کے بارے میں سی آئی اے کے اہلکار کا بیان ہے کہ ''انٹرنیٹ صحافت کا دور شروع ہونے سے اجنبی ملکوں کی صحافت کی نگرانی کرنا کئی گنا آسان ہو چکی ہے، انٹرنیٹ کے ذریعے خبروں کی نقل وحمل کے دوران فبیس معلومات اچک لیتی ہے اس کام کے لئے شخصی طور پر زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑتا''۔ واشنگٹن کے مضافات کے علاوہ دنیا میں تین مقامات پر اس کے بڑے مراکز قائم ہیں جہاں پر غیر امریکیوں کی بڑی تعداد کام کرتی ہے، ان مراکز میں مختلف زبانوں سے انگریزی میں خبروں کو ترجمہ کرنے کا بڑا انبٹ ورک قائم ہے۔ سی آئی اے کے اہلکار کے مطابق اس سسٹم کی دیگر تفصیلات میں جانے کی اجازت نہیں مگر صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس ادارے میں دنیا کا سب سے بڑا ترجمہ کرنے کا سسٹم موجود ہے جہاں پر دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کے ماہر دن رات کام میں منہمک رہتے ہیں۔

سی آئی اے کے ایک اور اہلکار نے اپنا نام ظاہر کئے بغیر لندن سے شائع ہونے والے عربی جریدے ''المجلۃ'' کے کچھ سوالوں کے جواب دیے یہ گفتگو امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کے غیر ملکی دوروں کے دوران دئے گئے بیانات کے بارے میں جو اس طرح ہیں:

س۔ سعودی ولی عہد امیر عبداللہ بن عبدالعزیز کے بیانات کی روشنی میں اسلامی اور عالمی سطح پر مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے ہیں، کیا امریکی وزارت خارجہ انہیں واچ کرتی ہے؟

ج۔ شرق الاوسط کی صورتحال کے معاملے میں سعودی ولی عہد کی تقریباً تمام باتوں کا ہم نے بغور جائزہ لیا ہے، سعودی عرب امریکہ کا دوست ملک ہے بہت سے معاملات میں دونوں ملکوں کی مصلحتیں بھی ایک ہیں، اس سلسلے میں ہم بڑی سعودی حکومتی شخصیات، سعودی میڈیا اور سعودی حکومت کی جانب سے جاری کردہ بیانات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔

س۔ آپ کے پاس اس قسم کی معلومات جمع کرنے کے وسائل کیا ہیں؟

ج۔ سب سے پہلے سعودی عرب میں امریکی سفارتخانہ ہے، اس کے بعد فبیس (FIBS) ہے اس کے علاوہ امریکی سکیورٹی ایجنسیاں اور آخر میں نیوز ایجنسیاں ہیں۔

س۔ ان معلومات کو کس ترتیب سے حاصل کیا جاتا ہے؟

ج۔ امریکی وزارت خارجہ میں شعبہ شرق الاوسط سعودی عرب کی ہر چھوٹی بڑی بات کی معلومات رکھنے کا ذمہ دار ہے یہ ادارہ شرق الاوسط کے شعبے کے نائب وزیر کے زیر نگرانی کام کرتا ہے تمام معلومات اور اس پر غور وخوض اسی ادارے میں ہوتا ہے اس کے بعد اسے بڑے حکومتی اہلکاروں تک پہنچا دیا جاتا ہے، یہ کام آسان نہیں ہے بلکہ بہت سے رخ لئے ہوئے ہے، بسا اوقات اس مشکل کام میں متعلقہ ممالک میں امریکی سفارتکاروں کو بھی کام لانا پڑتا ہے۔

س۔ کیا اس حکومتی سطح کے کام میں غیر سرکاری ادارے بھی استعمال کئے جاتے ہیں؟

ج۔ ہم وزارت خارجہ کے ذرائع سے ان کاموں کو انجام دیتے ہیں انہی ذرائع سے زیادہ تر معلومات اکھٹی کی جاتی ہیں ان معلومات کی تہہ تک پہنچنا، انہیں اچھی طرح سمجھنا اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا اس ادارے کی ذمہ داری ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ واشنگٹن میں دیگر اسٹڈی سرکل بھی اس شعبے میں ہمارے معاون ثابت ہوتے ہیں ان مراکز میں ایسے ماہرین کام کرتے ہیں جو مطلوبہ علاقوں اور شخصیات کے بارے میں ماہر تصور کئے جاتے ہیں مگر بالآخر معلومات کو آخری شکل ہم نے ہی دینا ہوتی ہے اور ہم ہی اس کا نفاذ کرتے ہیں۔

س۔ سعودی ولی عہد کے دورۂ یورپ کو آپ نے کس طرح کور کیا۔۔۔؟

www.facebook.com/kurf.ku

www.kurfku.blogspot.com

ج۔اس سلسلے میں روایتی طور پر ریاض میں امریکی سفارتخانے کی رپورٹیں تھیں اس کے بعد امیر عبداللہ بن عبدالعزیز جن ملکوں میں جاتے رہے وہاں کے امریکی سفارتخانے رپورٹیں ارسال کرتے رہے ہیں اس کے علاوہ فیبس، امریکن سکیورٹی ایجنسیوں اور نیوز ایجنسیوں کی رپورٹیں ہمیں موصول ہوتی رہی ہیں۔

س۔یہ رپورٹیں بڑے ذمے دار اہلکاروں تک کیسے پہنچتی ہیں؟

ج۔ضروری معلومات کو سب سے پہلے اوپر پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اس سلسلے میں شرق الاوسط کے شعبے کا نائب وزیر اسے حتمی شکل دیتا ہے جو اسے وزیر خارجہ کے سپرد کرتا ہے اس کے بعد یہ معلومات وائٹ ہاؤس یا متعلقہ وزارت میں ارسال کی جاتی ہیں۔بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے ملک سے کوئی حساس قسم کی معلومات اچانک موصول ہوتی ہے جس پر پورے ادارے میں ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا جاتا ہے تا کہ ہنگامی بنیادوں پر اسے نمٹایا جا سکے۔

س۔سعودی ولی عہد نے اپنے دورہ شام کے دوران کہا تھا کہ علاقے میں کہیں بھی امن کے لئے امریکی کردار نظر نہیں آ رہا، ہم امریکہ یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ امن بات چیت کے لئے تاریخی کردار ادا کریں؟

ج۔جی ہاں، ہم نے یہ بیان وصول کیا تھا ہم اس کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں، علاقے میں امریکی کردار کی عدم موجودگی کا ذکر وزیر خارجہ کولن پاؤل بھی کئی مرتبہ کر چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ وہ علاقے میں اس کو دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔وزیر خارجہ مقرر ہونے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے شرق الاوسط کا اہم دورہ بھی کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ علاقے کی اہمیت امریکہ کی نظر میں اولیت رکھتی ہے۔

س۔سعودی ولی عہد نے اپنے دورہ جرمنی کے دوران اسرائیلی فوج کا سامنا کرنے والے فلسطینیوں کے بارے میں کہا تھا کہ یہ غیر متوازن جنگ ہے ایک طرف جنگی طیارے اور میزائل ہیں جبکہ فلسطینی ان کا جواب پتھروں سے دے رہے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ''مجھے وہ اسرائیلی گولی مل گئی ہے جس سے ایک فلسطینی بچی، ایک عورت اور بوڑھا شخص قتل کئے گئے تھے''۔

ج۔ہم ان افسوس ناک واقعات پر خاموش نہیں ہیں امریکی صدر نے متعدد بار اس سلسلے میں سعودی حکومت اور دیگر عرب ملکوں کے رہنماؤں سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا ہے اور ان المناک واقعات پر امریکی تشویش سے آگاہ کیا خاص طور پر جب زیادتیوں کا دائرہ شہریوں تک وسیع ہوا اور بچے، عورتیں اور بوڑھے اس کی زد میں آنے لگیں۔

س۔جرمن اخبار ''دیر شپیگل'' کو انٹرویو دیتے ہوئے سعودی ولی عہد نے خبردار کیا تھا کہ شرق الاوسط میں کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔انہوں نے کہا کہ ''ہم سب بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے؟

ج۔ہم اپنے سعودی دوستوں کی تشویش سے آگاہ ہیں بلکہ خود ان کے ساتھ اس تشویش میں شامل ہیں بلکہ ہم خود خبردار کر چکے ہیں کہ اگر طرفین کی جانب سے فائر بندی نہ ہوئی اور جلد مذاکرات کا سلسلہ شروع نہ ہوا تو علاقے میں بڑا دھماکہ ہو سکتا ہے۔وزیر خارجہ کولن پاؤل نے بھی اس سلسلے میں کئی مرتبہ باور کرایا ہے کہ فریقین کو ضبط نفس سے کام لینا پڑے گا بصورت دیگر خطرات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس قسم کی معلومات اکٹھی کرنے میں فرانسیسیوں کا طریقہ واردات اپنے امریکی دوستوں سے تھوڑا مختلف ہے، فرانسیسیوں کے نزدیک دنیا بھر میں ان کے سفارتی عملے کو محفوظ کارروائیوں کے لئے ہی کہا جاتا ہے اس سلسلے میں شرق الاوسط کے معاملے میں خاص خیال رکھا جاتا ہے۔پیرس میں فرانسیسی وزارت خارجہ نے اس شعبے کو پانچ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

۔وزیر اور اس کے مشیر معلومات کو حتمی رپورٹ کی شکل دیتے ہیں۔

۔وزارت خارجہ کا سکریٹری جنرل برائے سیاسی امور، اس کا تعلق معلومات بہم پہنچانے والے اداروں سے براہ راست ہوتا ہے۔

۔ڈائریکٹر برائے سیاسی شعبہ، شرق الاوسط کا شعبہ بھی اس کے زیر انتظام کام کرتا ہے۔

۔شمالی افریقہ اور شرق الاوسط کا مشترکہ شعبہ، وزارت خارجہ میں اس کو اہم شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔

۔شعبہ اطلاعات، یہ شعبہ وزارت خارجہ کے ساتھ ساتھ وزارت تجارت اور اقتصاد کو بھی خدمات مہیا کرتا ہے اس شعبے کا تعلق دیگر غیر سرکاری تنظیموں سے بھی ہوتا ہے۔

فرانس کا شمار یورپ کے ان ملکوں میں ہوتا

KURF

کے تناظر میں خاص شہرت کا حامل ہے۔تمام یورپ میں فرانس واحد ملک ہے جس کا بحرانوں کے دور میں عراق کے ساتھ بدستور رابطہ رہا تھا۔شرق الاوسط میں فرانس کے تعلقات کا سلسلہ گذشتہ تین صدیوں سے ہے مصر اور شام اس کے دائرہ اثر میں رہے ہیں ان علاقوں سے نکل جانے کے باوجود یہاں معلومات کے مراکز موجود تھے جنہیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاتا رہا ہے۔ذرائع کے مطابق کام کے طریقوں میں فرق ہونے کے باوجود امریکی خفیہ ادارے فیبس (FIBS) کا تعاون بھی فرانسیسیوں کو حاصل ہے۔فرانسیسی وزارت خارجہ کے ایک آفیسر برنار فالیرو کے مطابق ''سفارتکاری میں ہمارا ادارہ معتبر روایتوں کا امین ہے ہم امریکیوں کی طرح ایسا قدم نہیں اٹھاتے جس پر اکثر اوقات شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے''۔

فرانس کی نسبت برطانیہ امریکہ سے قریب تر یورپی ملک تصور کیا جاتا ہے۔بالعموم عالمی سطح پر اور بالخصوص شرق الاوسط کے معاملے میں باہمی اشتراک سے کام کرتے ہیں۔برطانیہ کی حد تک معلومات تک رسائی کے لئے BBC خاص شہرت کا حامل ہے یہ ادارہ 1943ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران دشمن ملکوں کے اطلاعاتی شعبے پر نظر رکھنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اس کا سب سے پہلا مرکز لندن کے مضافات میں تھا اس کے بعد اس کی تین اہم شاخیں تل ابیب، عمان اور قبرص میں قائم کی گئی تھیں ان مراکز کی ڈیوٹی ہے کہ علاقے کی ہر سیاسی اور اہم سرگرمی پر نظر رکھی جائے۔بی بی سی کے شعبہ شمالی افریقہ اور شرق الاوسط کے انچارج عرب نژاد علی شکری کے مطابق امریکہ اور برطانیہ نے معلومات کے حصول کے لئے مشترکہ پلیٹ فارم کو امریکی ادارے (FIBS) کے زیر انتظام دیا ہوا ہے اس ادارے سے منسلک افراد نہ تو کبھی اپنی آواز میں کوئی خبر ریکارڈ کراتے ہیں اور نہ انہیں کبھی کیمرے کے سامنے دیکھا جاسکتا ہے۔علی شکری کے مطابق ہماری تمام خدمات حکومتی اداروں کے لئے ہوتی ہیں جن میں وزارت دفاع قابل ذکر ہے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہم تجارتی شعبے میں خدمات انجام دیں۔ورلڈ سرفیس World surface اور news on Line کے نام سے بھی ہم نے شعبے قائم کر رکھے ہیں 'NGO میں ایمنسٹی انٹرنیشنل بھی ہماری سروس سے مستفید ہوتی ہے ''کچھ عرصہ پیشتر میں چین میں تعینات تھا میری ذمہ داری تھی کہ چین میں ایسی کوئی بھی خبر جو

حکومتی اہلکاروں کی جانب سے کسی زیادتی پر مبنی ہو یا کسی قسم کی گرفتاری کے بارے میں کوئی خبر موصول ہو اسے فوراً ایمنسٹی انٹرنیشنل تک پہنچادوں۔اس کے علاوہ نیٹو، یورپی یونین اور وزارت خارجہ کے لئے بھی خدمات انجام دی جاتی ہیں''۔

ان مختصر معلومات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مخصوص اداروں کے علاوہ جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر کام کرتے ہیں ایسے معروف ادارے بھی ہیں جو دنیا میں خبر رسانی کے لئے مشہور ہیں مگر ان کے سسٹم کا بڑا حصہ امریکہ اور یورپ کے ان جاسوس اداروں کے لئے بھی خدمات انجام دیتا ہے۔

فرانسیسی ''فرنشلون''

فروری 2001ء میں یورپین پارلیمنٹ اور میڈیا میں اس وقت شور مچ گیا جب دنیا میں سننے کے امریکی خفیہ نظام ''ایشلون'' کا انکشاف ہوا اس نظام کے تحت دنیا میں کہیں بھی ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو، فیکس اور ای میل کا ریکارڈ امریکی اتھارٹی تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ یورپ بھر میں اس نظام کی کھوج لگانے میں سب سے زیادہ کام فرانسیسی اتھارٹی نے کیا اور اس خفیہ امریکی جاسوس سسٹم کی تفصیلات اکٹھی کرکے یورپی یونین پارلیمنٹ کی تحقیقاتی ٹیم کے سامنے پیش کیں۔ اس رپورٹ کے مطابق امریکی سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے اس سسٹم کو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار لائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یورپ کی حد تک جو بات سامنے آئی اس کے مطابق ''ایشلون'' کے ذریعے امریکی یورپ میں تجارتی سودوں کا کھوج لگا کر اسے امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفاد میں استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ بڑے سودے جو یورپی کمپنیاں حاصل کرنا چاہتی ہیں اس سے پہلے ہی امریکی کمپنیوں کو حاصل ہو جائیں اس طرح امریکی اور یورپی کمپنیوں کے درمیان مقابلے کی فضاء خاصی کشیدہ ہو چکی تھی۔

اس کے بعد امریکیوں کو اپنے سننے کے خفیہ ذرائع سے اس بات کا علم ہوا کہ امریکیوں کے ہاتھ لگنے والے دو بڑے تجارتی سودے فرانسیسی لے اڑے ہیں ان کمپنیوں کا عمل خفیہ انداز میں جاری تھی کہ فرانسیسیوں کو اس کی خبر ہوگئی انہوں نے فرانسیسی کمپنیوں کے

KURF

ذریعے کم قیمت پر ان سودوں کو حتمی شکل تک پہنچا دیا۔ اس میں سے ایک کاروباری ڈیل برازیل کے ساتھ امریکی راڈار کمپنی **Raytheon** کی ہو رہی تھی، مگر یہ **4.1** ملین ڈالر کا سودا فرانسیسی کمپنی **Thomson** کے حصے میں آگیا جس کے ذریعے برازیل ایمیزن کے جنگلات میں فضائی نگرانی کا سسٹم قائم کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا سودا امریکی کمپنی **Mcdonell Douglas** کا سعودی ائر لائن کو طیاروں کی فروخت کا تھا مگر یہ **30** ملین ڈالر کا سودا بھی فرانسیسی **Airbus** لے اڑی۔ اس بات کا سرا امریکیوں کے ہاتھ نہیں آرہا تھا کہ فرانس کس طرح امریکی سسٹم ایشلون میں نقب لگا کر یہ بڑے سودے لے اڑے۔ فرانسیسیوں کو بھی توقع نہیں تھی کہ وہ یورپی پارلیمنٹ جو آج یورپ میں امریکی جاسوس نظام ایشلون کی موجودگی کے خلاف سخت احتجاج کر رہی ہے چند ہفتوں بعد وہ فرانس کے خفیہ سسٹم کے بارے میں تحقیقات کا حکم جاری کردے گی۔ فرانسیسی جریدے ''نوفیل اوبسر فاتور'' نے دنیا کے مختلف علاقوں میں قائم فرانس کے تین جاسوس اسٹیشنوں کی تصاویر شائع کر دیں جن کے ذریعے عالمی سطح پر خفیہ طریقے سے ''سننے'' کی کارروائی کی جاتی ہے۔ یورپی میڈیا نے فرانس کے اس جاسوس نظام کا نام امریکی ایشلون کی طرز پر ''فرنشلون'' رکھا ہے۔

فرانس آج تک شمالی افریقہ کے علاوہ عالمی صورتحال مین خاموش کردار ادا کرتا رہا ہے وہ ممالک جو امریکہ اور برطانیہ کے نزدیک جارح ممالک تصور کئے جاتے ہیں فرانس کے ان سے قریبی تعلقات ہیں۔ ان میں عراق سرفہرست ہے۔ فرانس کی خفیہ ایجنسی اور اس کے ذیلی ادارے ان تعلقات میں خاموش کردار ادا کرتے رہے ہیں، تمام یورپ میں عراق پر سے پابندیاں اٹھانے کا صرف فرانس حامی ہے تاکہ عراق کے ساتھ پھنسے تجارتی اور عسکری معاہدوں کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں فرانس کا سننے کا جاسوس ادارہ ہمہ وقت عراق کی عسکری نقل وحمل اور مواصلات پر نظر رکھتا ہے۔

فرانس کا خفیہ الیکٹرانک جاسوسی کا ادارہ ابھی تک دنیا کی نگاہوں میں پوری طرح نہیں آسکا ہے۔

اپریل 2001ء میں پہلی مرتبہ اس کی تفصیلات دنیا کے سامنے آئیں، جریدے نوفیل اوبسر فاتور میں اس سے متعلق تفصیلات شائع ہونے کے بعد فرانسیسی وزارت دفاع نے پہلی

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

مرتبہ اس کے وجود کا اقرار کیا اور اس کے بارے میں محدود معلومات افشا کرنے کی اجازت دی جن کے مطابق یہ نظام خفیہ الیکٹرانک جاسوسی کے تین مراکز پر مشتمل ہے اس میں سب سے بڑے مرکز کا قیام دس برس قبل عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ مرکز جزیرہ کوروجو بحر ہند میں فرانس کے زیر نگیں علاقہ ہے میں ''گائیانا'' کے گھنے جنگلات کے وسط میں واقع ہے یہیں یورپی دفاعی میزائل سسٹم کا اڈہ ''اریان'' ہے۔ دوسرا بڑا مرکز بھی بحر ہند کے جزیرے ''مایوٹی'' کے پہاڑی علاقے میں قائم ہے یہ دونوں مراکز ایسے علاقوں میں قائم کئے گئے ہیں جہاں پر زمین کے گرد چکر لگانے والے مصنوعی سیاروں کے ذریعے بھیجی جانے والی معلومات آسانی کے ساتھ پکڑی جاسکتی ہیں۔ تیسرا بڑا مرکز پیرس کے مغرب کی جانب واقع علاقوں ''الویہ'' اور ''لورا'' کے قریب ہے۔

یہ تینوں مراکز حساس اور جدید الیکٹرانک آلات پر مشتمل ہیں جو جغرافیائی طور پر تمام زمین میں ہونے والی مواصلاتی سرگرمیوں کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ اس نظام کی گرفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شمالی سائبیریا جسے انسانوں سے خالی علاقہ تصور کیا جاتا ہے بھی فرانسیسیوں کے اس نظام کی پہنچ سے دور نہیں ہے۔ اس نظام کے تحت دنیا بھر میں ہونے والی مواصلاتی گفتگو ریکارڈ کر کے اس میں سے کام کی چیزیں الگ کر لی جاتی ہیں یہ مواصلاتی گفتگو ٹیلی فون، فیکس اور ای میل کے سسٹم پر مشتمل ہوتی ہے ایشلون کے معاملے میں بھی یہ بات سامنے آچکی ہے کہ یہ کام انتہائی پیچیدہ نوعیت کا ہے اسی قسم کی دشواریاں فرانسیسیوں کو بھی ہیں۔ ذرائع کے مطابق فرانسیسیوں کا یہ جاسوسی نظام اس وقت تک امریکیوں کے ''ایشلون'' کے ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اس کے تین بڑے مراکز میں ایک اور چوتھے مرکز کو نہ شامل کیا جائے۔ یہ چوتھا مرکز باقی تین مراکز سے حاصل شدہ معلومات کو چیک کرنے اور حساس معلومات اس سے الگ کرنے پر قادر ہے۔ اس مرکز کے بارے میں ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ فرانس کے قصبے ''دوردونی'' کے ہوائی اڈے ''سارلیٹ'' سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ''بیریگور'' کے علاقے میں قائم ہے اس علاقے کو ''دوم'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس مرکز کا رسمی نام ''کمیونیکیشن سنٹر آف الیکٹرانک ریڈیو'' ہے اس کا شمار دنیا کے چند بڑے ''سننے'' والے مراکز میں ہوتا ہے یہ تیرہ بڑے الیکٹرانک حصوں پر مشتمل ہے ہر حصے کا قطر 25 میٹر ہے یہ مرکز جدید

KURF

مواصلاتی سسٹم سے آراستہ ہے جس میں **Cray** نامی طاقتور کمپیوٹر سسٹم استعمال کیا جاتا ہے یہ سسٹم اس مرکز کو 1991ء میں فرانسیسی خفیہ ایجنسی نے مہیا کیا تھا جس کے ذریعے سیاسی اور عسکری نوعیت کی عالمی معلومات کو الگ کر کے ان کی الگ الگ ''فائلیں'' مرتب کی جاتی ہیں۔

اس مرکز میں تین سو سے لے کر پانچ سو افراد تک ہمہ وقت کام کرتے ہیں۔ ان ماہرین کو موصول ہونے والی اطلاعات کی روشنی میں رپورٹیں مرتب کرنا ہوتی ہیں اس کے بعد ان رپورٹوں کو نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ حساس کمپیوٹروں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق روزانہ 15 ہزار رپورٹیں جن کا کوڈ نام ''قیمتی خزانہ'' ہوتا ہے کو وصول کر کے ایک خاص ترتیب میں لایا جاتا ہے۔ ٹیلی فونک گفتگو، فیکس اور ای میل کے سالانہ پانچ ملین پیغامات اس سسٹم کے تحت جمع کر کے فرانس کی انٹیلی جنس ایجنسی جس کا ہیڈ کوارٹر ''مورتیہ'' روڈ پیرس میں واقع ہے کو ارسال کر دئے جاتے ہیں۔

فرانسیسی اس حساس سسٹم کے تحت حاصل ہونے والی رپورٹوں کا کیا کرتے ہیں؟ انہیں کس جگہ استعمال کیا جاتا ہے؟ اس سے حاصل ہونے والی معلومات اور مسائل کو کہاں اٹھایا جاتا ہے؟ اس سسٹم سے تعلق رکھنے والا ایک سابق اہلکار ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اس نظام کے تحت حاصل کی گئی معلومات اور رپورٹیں چھانٹی کے بعد خفیہ ایجنسی کو فراہم کی جاتی ہیں جہاں ان پر مخصوص مہریں لگا کر فرانسیسی صدر کے پاس ارسال کر دی جاتی ہیں''۔

اسی طرح ایک اور فرانسیسی اہلکار کے مطابق جس نے جریدے ''نوفیل اوبسرفاتور'' کو رپورٹ پیش کی تھی کے مطابق جب اسرائیل نے 1982ء میں لبنان پر حملہ کیا تو اس وقت لبنان میں موجود اسرائیلی کمانڈروں کی تمام گفتگو فرانسیسیوں نے ریکارڈ کی تھی۔ اسی طرح بلقان کی جنگ کے دوران نسل پرست سرب لیڈروں اور ان کے فوجی کمانڈروں کے درمیان جو سلکی اور لاسلکی گفتگو ہو رہی تھی فرانسیسی اس سے پوری طرح باخبر تھے۔ اقوام متحدہ کے متعدد اہلکار جو سلامتی کونسل میں رائے شماری کے معاملات کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کے درمیان حساس نوعیت کی گفتگو بھی جاری تھی، دور کہیں بیٹھ کر فرانسیسی ان کی مواصلاتی جاسوسی میں مصروف تھے۔

فرانسیسیوں کے نزدیک شمالی افریقہ کے ممالک اسٹریٹیجک لحاظ سے خاصے اہم تصور کئے جاتے ہیں۔ الجزائر، مراکش اور تیونس اس کی باقاعدہ کالونیاں رہی ہیں

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

www.facebook.com/kurf.ku
www.kurfku.blogspot.com

امریکہ کے ساتھ ساتھ فرانسیسیوں کے لئے بھی پریشانی کے سبب بنے رہے اس لئے الجزائر کے بعد تمام شمالی افریقہ میں فرانس کی نظروں کا مرکز ان کی شخصیت رہی ہے ذرائع کے مطابق لیبیا پر امریکی حملے کے دوران فرانسیسی بحیرہ روم سے لیبیا اور امریکہ کی اس چپقلش کا بغور جائزہ لیتے رہے ہیں جبکہ آج بھی فرانس کی خفیہ ایجنسی معمر قذافی کے ساتھ ہونے والے بین الاقوامی رابطوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور ان کی ہر ٹیلی فونک کال کا ریکارڈ حاصل کیا جاتا ہے۔طرابلس سے ایک گھنٹے کے بحری فاصلے پر واقع مالٹا میں ایک فرانسیسی مرکز بظاہر موبائل فون سسٹم کا دفتر کہا جاتا ہے اس کام میں مصروف عمل ہے۔

اسی طرح الجزائر کی عسکری حکومتوں کے دوران جنرلوں کی باہمی گفتگو کو باقاعدگی سے ریکارڈ کیا جاتا تھا۔خاص طور پر جب الجزائری جنرل ملک کی اسلامی تحریکوں کے خلاف باقاعدہ منصوبہ بندی سے مہم چلائے ہوئے تھے اس وقت ''نامعلوم'' ہاتھ تمام الجزائر کو سخت قسم کی دہشت گردی کی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا فرانسیسی الجزائر میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے خاصے تشویش میں مبتلا تھے،اس نظام کے تحت ہی فرانسیسیوں کو ایسی خبریں بھی موصول ہوئی تھیں جن کے ذریعے پتا چلتا تھا کہ ملک میں جنرل منصوبہ بندی کے تحت دہشت گردی پھیلا رہے ہیں تاکہ ان کا سارا بہتان اسلامی تحریکوں پر لگا کر عوام کو ان سے متنفر کیا جاسکے۔الجزائری جنرلوں کی یہ کارروائیاں دبے الفاظ میں بعض یورپی اخبارات کی زینت بن چکی ہیں مگر اصل حقیقت ''فرنشولون'' کے پاس محفوظ ہے کیونکہ وہ اس وقت الجزائر میں ہونے والی ہر سلکی و لاسلکی سرگرمی کو ریکارڈ کر رہی تھی اس کام کے لئے **1991**ء میں اس وقت کے خارجی انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر ''کلاد سیلبر زاھن'' نے حکومت فرانس سے خاص اجازت لی تھی تاکہ الجزائر میں فرانس کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔

اسرائیلی فوج کی جاسوسی،قذافی اور الجزائری جنرلوں کی گفتگو اور دیگر معاملات کس طرح اور کس جہت سے فرانسیسی جاسوسی آلات کی زد میں آتے ہیں اس سلسلے میں کسی اعلیٰ فرانسیسی اہلکار نے تفصیلات میں جانے سے گریز کیا ہے لیکن اس حد تک بات سامنے آچکی ہے کہ یہ سب کچھ مواصلاتی سیاروں اور زمین پر فرانسیسی الیکٹرانک مراکز کی مدد سے کیا جاتا ہے ... میں فرانس کا عام انٹیلی جنس کا ادارہ ملوث نہیں ہے۔

نوفیل اوبسر فاتور کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد جو شور و غوغا اٹھا اس نے اس بات کو بھی کھول دیا کہ شرق الاوسط میں ہونے والی فرانسیسی جاسوسی مصنوعی سیارے ''عربسات'' کے ذریعے کی جاتی ہے۔یہ فرانسیسی مصنوعی سیاروں میں سب سے اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔جس کے ذریعے عرب ممالک کی عسکری جاسوسی کے ساتھ ساتھ فوجی نقل وحمل پر بھی نظر رکھی جاتی ہے، ایک فرانسیسی ماہر کے مطابق ''عربسات'' شرق الاوسط اور شمالی افریقہ کے علاقے کی مکمل نگرانی کرسکتا ہے مگر اسے دیگر عالمی مصنوعی سیاروں کے مقابلے میں زیادہ جدید نہیں کہا جاسکتا۔۔۔

فرانسیسیوں کی مواصلاتی جاسوسی کا ایک بڑا مرکز بحیرہ روم میں تیرنے والا بحری جہاز ہے جس کا خفیہ نام ''بیری'' ہے ذرائع کے مطابق ہزاروں میل دور سے آنے والی ریڈیائی لہریں بھی اس کے جدید سسٹم کی پہنچ سے دور نہیں ہیں بحیرہ روم کے بین الاقوامی سمندر میں موجود رہتے ہوئے یہ نہ صرف شرق الاوسط کی جاسوسی کرتا ہے بلکہ ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود پاکستانی فوج کی عسکری مواصلات مانیٹر کرنا بھی اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ پاکستان فرانسیسی جاسوس ادارے کے لئے کیوں اہم ہوسکتا ہے اس کا جواب دفاعی سودوں کے علاوہ ابھی تک سامنے نہیں آسکا،پاکستان کی بحریہ اور فضائیہ میں بیشتر ساز وسامان فرانسیسی ساختہ ہے اس لئے ممکن ہے ان میں ایسے آلات بھی نصب ہوں جنہیں فرانسیسی آسانی سے مانیٹر کرسکتے ہوں!

فرانس کی خارجہ انٹیلی جنس ایجنسی کے سابق ڈائریکٹر کلاد سیلبر زاھن کی یادداشتیں **2000**ء میں **(Heart of Secrat)** کے نام سے منظر عام پر آئی ہیں،کلاد **1989** سے **1993**ء تک فرانسیسی خفیہ ادارے کا ڈائریکٹر رہا ہے۔اپنی یادداشتوں میں وہ رقم طراز ہے کہ ''شرق الاوسط میں ہم سب سے زیادہ عراق پر توجہ دیتے رہے ہیں مگر الجزائر کے بگڑتے ہوئے حالات نے ہمیں اس کی جانب تیزی کے ساتھ موڑ دیا **1991**ء میں فرانس کو اپنے مفادات کے تناظر میں الجزائر میں کئی قسم کے خطرات کا سامنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے الجزائر میں ہر قسم کی گفتگو سننے کا فیصلہ کیا،ہم نے جنرلوں کے علاوہ اسلامی جماعت کے مسلح افراد کی گفتگو ریکارڈ کی۔فرانس کے خفیہ ادارے گفتگو سننے کے آلات سے کیسے لیس ہوئے اس کا دورانیہ خاصا پرانا ہے،ہم نے جنوب (شمالی افریقہ) کی جانب اپنے آلات کا رخ کیا ہوا تھا مگر اسی کی دہائی میں

یہ الیکٹرانک تنصیبات وقت کے تقاضوں کی نسبت سے ناکافی ثابت ہو رہی تھیں۔''

ذرائع کے مطابق فرانس کی خفیہ ایجنسی اس وقت عراق، کویت، پاکستان، روس اور سربیا کے فوجی حکام کے ذرائع مواصلات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ جزیرہ کورو میں واقع سننے کا فرانسیسی نظام بحیرہ روم میں کھڑے فرانسیسی جنگی جہاز ''بیری'' کے ساتھ منسلک ہے جو اطلاعات کو مغربی پیرس کے سنٹر تک منتقل کرتا ہے جزیرہ کورو کا مرکز عراق اور پاکستان کی عسکری مواصلات کو براہ راست نگرانی میں لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ذرائع کے مطابق عراق کے ریڈار سسٹم کو ازسرنو قابل استعمال بنانے کے لئے چینی ماہرین کی موجودگی کی سب سے پہلے نشاندہی کرچکا ہے مگر عراق کے ساتھ قریبی تعلقات ہونے کی بنا پر اس نے ابھی تک ان معلومات کو مکمل طور پر امریکہ اور برطانیہ کو استفادے کے لئے مہیا نہیں کیا ہے! اس سسٹم کو فرانس افغان جنگ کے دوران احمد شاہ مسعود سے رابطے کے لئے استعمال کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی تاجکستان کی سرزمین پر اسی طرح جاری ہے۔

سی آئی اے کی مکروہ تاریخ

عالمی دہشت گردی میں جو گھناؤنا کردار امریکی سی آئی اے کا ہے اس کی تاریخ میں مثال ملنا مشکل ہے۔ امریکہ کا جاسوسی ادارہ سی آئی اے دنیا بھر میں اپنی کارکردگی کے اعتبار سے بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ امریکہ کے دنیا بھر پر چھا جانے کے تیز تر عمل کی بنیادی سی آئی اے کو ہی قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ اس ادارے نے اپنی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں جو نقوش چھوڑے ہیں وہ خود امریکی قوم کے لئے بھی کچھ ایسے باعث افتخار نہیں ہیں۔

سی آئی اے کی تاریخ سیاسی وفکری دہشت گردی کے ایک لامتناہی سلسلے سے عبارت ہے' اہل دنیا کے سامنے اس کا جو تاثر مرتب کیا جاتا رہا ہے وہ انتہائی مسحور کن اور دیومالائی حیثیت کا حامل ہے۔ درحقیقت سی آئی اے کا یہ تمام دور حکومتوں کے تختے الٹنے' بادشاہتوں کو بلیک میل کرنے اور امریکی سیاسی مفادات کی خاطر کسی بھی غیر اخلاقی اقدام سے گریز نہ کرنے میں صرف ہوا ہے۔ سی آئی اے کی گزشتہ کارکردگی پر ایک نظر ڈالئے آپ کو بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جس میں سرکاری طور پر کئی بڑے بڑے آپریشنز کی ناکامی کا اعتراف بھی کیا گیا ہے' غرض کہ سی آئی اے کی تاریخ غارت گری' سازشوں، انسانیت کی تذلیل سے بھری پڑی ہے۔ جس کی واحد غرض امریکی مفادات کا تحفظ تھا۔ ان تمام تر حقائق کے باوجود بہت سے غریب اور دیگر اسلامی ممالک کے لوگ سی آئی اے کے کردار کو اس رخ سے نہیں دیکھتے جو اس کا حقیقی انداز

ہے۔ بہت سے اسلامی ممالک میں سی آئی اے کی باقاعدہ شاخیں موجود ہیں۔ جہاں زیادہ تر مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے جنہیں امریکی معیار کے مطابق بھرپور مالی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے ضمیروں کا سودا کرنے میں قطعاً جھجک محسوس نہیں کرتے۔

سی آئی اے سے متعلق اسلامی ملکوں میں جو تصورات پائے جاتے ہیں وہ کسی حد تک مبالغہ آرائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس قسم کی غلطی ہمارے بعض سیاسی حلقے اور اطلاعاتی شعبے بھی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ اس قسم کے تصورات کو جان بوجھ کر بھی فروغ دیا گیا کہ جیسے سی آئی اے ایک ایسی طاقت ہے جس کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ وہ جہاں چاہے جس وقت چاہے کارروائی کر سکتی ہے اور اس کے علاوہ تیسری دنیا میں ہونے والے اقتصادی و سیاسی بحران کے پیچھے سی آئی اے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے اور ان ممالک کے حکمران و لیڈروں کو اپنے طریقے سے چلانے میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ مصنوعی سیاروں کے ذریعے سڑکوں پر چلنے والی کاروں کے نمبروں تک سے اسے آگاہی ہے۔ تیسری دنیا کا کوئی بھی ملک اور اس کی فوجی چھاؤنی سی آئی اے کے شکنجے سے آزاد نہیں۔

اس قسم کے فکری پراپیگنڈے کو ہالی وڈ کے ذریعے بھی تمام دنیا میں پھیلایا گیا۔ سی آئی اے سے متعلق بے شمار فلمیں بنائی گئیں۔ پچھلے پچاس برسوں کے دوران تیسری دنیا کے ممالک اسی ایجنسی کے حوالے سے دائرہ اثر میں لانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ ان فلموں سے زیادہ عوامی حلقوں میں اثرات مرتب ہوئے اور لوگ ذہنی طور پر بری طرح متاثر ہوئے اور سی آ اے ایک ہوا بن کر ان کے اذہان پر سوار ہو گئی۔ یہاں تک کہ کسی ملک میں ہونے والا ہر واقعہ سی آئی اے سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کا تمام تر سہرا عرب حلقوں کی طرف سے امریکن سی آئی اے کے سر باند گیا۔ یہ بات کسی حد تک درست کہی جا سکتی ہے لیکن شکست کے تمام عوامل کی وجہ صرف سی آ اے نہیں تھی بلکہ داخلی طور پر خود عربوں میں نفاق کی وبا پھوٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ عربوں حد سے زیادہ خود اعتمادی نے انہیں اسرائیلی حربی مہارت و ٹیکنالوجی کے سامنے شکست سے دوچار کر دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ امریکہ براہ راست اس جنگ میں ملوث تھا سی آئی اے کی تم صلاحیتیں یہودیوں کے لئے وقف کر دی گئی تھیں لیکن اس کے باوجود عربوں کی غلط منصوبہ بن

نے انہیں ناکام بنا دیا۔ اس کے برعکس 1973ء کی جنگ رمضان میں عربوں نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ مصری افواج نے بارلے لائن عبور کی نہر سویز کا قبضہ واپس لیا اس جنگ کی منصوبہ بندی کئی مہینوں سے انتہائی خفیہ انداز میں جاری تھی۔ یہاں تک کہ امریکی مصنوعی سیارے اندھے ہو گئے اور انہیں مصری افواج کی سرحدوں کی جانب نقل و حرکت معلوم نہ ہو سکی۔ کئی ہفتوں تک چھاؤنیوں سے اسلحہ سرحد پر پہنچایا جاتا رہا لیکن امریکن سی آئی اے کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ عربوں نے مصر کی قیادت میں اسرائیل پر کامیاب حملہ کیا اور کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے اس طرح اسرائیل کے ناقابل شکست ہونے کا تصور پاش پاش ہو گیا۔ لیکن بعض خوش فہم نقادوں نے اس کامیابی کو بھی سی آئی اے سے منسوب کیا کہ اس طرح مختصر کامیابی کے بعد بالعموم عربوں کو اور بالخصوص مصر کو کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی جانب دھکیلا جا سکتا تھا جو کسی طور پر قرین قیاس نہیں ہے۔

سی آئی اے سے متعلق غلط فہمی میں مبتلا حلقوں نے اپنے گرد موجود لوگوں میں طرح طرح کے وسوسے پروان چڑھا دیئے جنہوں نے سیاسی محاذ پر اپنے معاشروں کو غیر مستحکم کرنے میں بڑی حد تک معاونت کی۔ حالانکہ امریکی صحافت میں سی آئی اے کو مختلف زاویہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ مثلاً سی آئی اے کے پچاس سال مکمل ہونے پر نیویارک ٹائمز نے تبصرہ کیا ہے کہ ''ایسا بارعب ادارہ جو عہد شباب سے نکل کر بڑھاپے کی طرف گامزن ہے'' اسی طرح واشنگٹن پوسٹ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''ایسا ادارہ جو ناکامیوں کی طویل فہرست کا حامل ہے اس کو چلانے کا دارومدار عورتوں اور مخبروں پر ہے اور اس سے وابستہ بیشتر لوگ اپنے اصل اہداف سے بے خبر رہے ہیں۔ ہلمٹ زونیفلیڈ جو واشنگٹن میں مرکز مطالعہ و پالیسی میں استاد ہے اس کے علاوہ سابق امریکی صدر نکسن کے مشیر برائے داخلی امن بھی رہے، نے سی آئی اے کے متعلق کہا کہ ''اس ادارے نے زیادہ وقت شخصی بحران میں گزارا''۔

پچھلے پچاس سالوں کے دوران سی آئی اے نے بہت سی ناکامیوں کا منہ دیکھا۔ تمام تر وسائل میسر ہونے کے باوجود اسے اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ ان ناکامیوں کا تذکرہ امریکی اخبارات کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک کے صحافتی حلقوں میں بھی آتا ہے۔ شاہ ایران کا زوال بھی سی آئی اے کی ناکامی کا ثبوت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سی آئی اے نے

ایران کے اسلامی انقلاب کے متعلق منصوبہ بندی پر کافی تاخیر سے کام کیا نتیجتاً وہ اپنے پولیس مین شاہ ایران کوزوال سے بچانے میں ناکام رہی۔ حالانکہ اس سے پہلے سی آئی اے نے کامیابی کے ساتھ ایران میں اپنے مشن پایہ تکمیل تک پہنچائے تھے۔ سابق ایرانی وزیراعظم ڈاکٹر محمد مصدق کوشکست سے دوچار کرنے میں سی آئی اے مکمل طور پر ملوث رہی خلیج سے تیل کی دولت کی ترسیل رکنے کے خطرے کے پیش نظر **1953**ء میں سی آئی اے نے مصدق کے زوال اورشاہ ایران کودوبارہ لانے کامنصوبہ بنایا۔

سی آئی اے سے متعلق بڑی حدتک تخیلاتی داستانوں کے علاوہ اس کے کچھ ایسے مجرمانہ اقدام بھی تاریخ پر رقم ہو چکے ہیں جن کا داغ کبھی امریکی تاریخ پر سے مٹایا نہیں جاسکے گا۔ ان میں غیر اخلاقی طور پر دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت اورانسانوں کا بے دریغ قتل بھی شامل ہے۔ **1961**ء کا خلیج خنازیر کا قبضہ جس میں سی آئی اے نے کیوبا پر مسلح حملے کامنصوبہ ترتیب دیا تھا۔ اس منصوبے میں ہزاروں افراد موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ سینکڑوں لوگ خلیج خنازیر میں غرق کر دیئے گئے۔ فونیکس کے نام سے سی آئی اے نے جنوبی ویت نام میں کئی مشن ترتیب دیئے۔ اس جنگ میں ہزاروں امریکی و ویتنامی فوجی ہلاک ہوئے۔ اسی طرح سی آئی اے نے شمالی عراق میں کردوں کے کئی گروہوں کو آپس میں لڑا دیا۔ محض اس کوشش میں کہ یہ سب حکومت عراق کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ سینکڑوں کردسی آئی اے کے اس کھیل تماشے کی نذر ہو گئے۔ دوسری خلیجی جنگ کے نتائج تمام دنیا کے سامنے ہیں۔ یہ ایک ایسا بین الاقوامی ڈرامہ تھا جس میں سی آئی اے بڑی حدتک کامیاب رہی۔ لیکن آئندہ کے لئے عربوں کو اپنے عزائم اور طریقہ واردات سے آگاہ کر دیا گیا۔ یہ سی آئی اے کی ایسی وارداتیں ہیں جن پر پردہ ڈالنا خود امریکہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ سی آئی اے کا کام **1970**ء کے عشرے تک بڑی خاموشی کے ساتھ جاری رہا ہے۔ یہ زمانہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ سرد جنگ کے اس زمانے میں جبکہ دونوں طرف کی ایجنسیاں زیرزمین کارروائیوں میں مشغول تھیں اوران کی کارروائیاں زیادہ منظر عام پر نہیں آسکتی تھیں اس لئے سی آئی اے کی بے شمار خامیوں پر پردہ پڑا رہا۔ لیکن افغانستان کی جنگ کے بعد سے تمام ایجنسیاں کھل کر اپنا کردار سامنے لے آئیں۔ سی آئی اے کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ میں **16** ڈائریکٹر منظر عام پر آئے

ہیں۔ ان میں سے چار ڈائریکٹر گذشتہ سات سالوں کے درمیان تبدیل ہوئے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالت میں سی آئی اے کس قدر انتشار کا شکار رہی ہے۔ خود امریکیوں کے کئی حلقے اس کے کردار سے متنفر نظر آتے ہیں۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر ولیم کولبی نے کہا تھا کہ ”کئی امریکی ایجنٹ آپس میں ایک دوسرے کے لئے خطرناک ہیں“ سی آئی اے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے دنیا بھر میں مجرمانہ مافیا سے بھی رابطے استوار رکھتی ہے اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود کسی مشن کو مکمل کرنے سے عاجز آجائے مثلاً سی آئی اے نے اب تک کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو کو قتل کرنے کی آٹھ کوششیں کیں مگر بری طرح ناکام رہی۔ آخر تنگ آکر سی آئی اے نے شکاگو کی ایک مجرم تنظیم سے فیڈل کاسترو کے قتل کا سودا ڈیڑھ لاکھ ڈالر میں کرنا چاہا جسے اس تنظیم نے مسترد کر دیا۔

چند سال پہلے سی آئی اے میں کچھ نئے قوانین لاگو کر کے اسے مزید فعال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب کی بار امریکی حکومت اور سی آئی اے انسانی حقوق کے علمبردار کے طور پر سامنے آئے حالانکہ یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ جو تنظیم تمام عمر انسانی حقوق کو پامال کرتی رہی ہو اسے کیسے انسانوں کے حقوق یاد آگئے۔ امریکی اسی تصور سے پھولے نہیں سماتے کہ وہ تمام دنیا میں انسانی حقوق کے محافظ ہیں لیکن تمام دنیا اس بات سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے کہ انسانیت کے لٹیرے جتنے یہاں پائے جاتے ہیں کہیں اور نہیں.....

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سی آئی اے کے احتساب کے لئے بھی امریکی معاشرے میں کوئی ادارہ ہے۔ سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر رچرڈ ہیلمز کا کہنا ہے کہ ”امریکی صدر ایسے اختیارات کا حامل ہے جو اپنے قلم کی حرکت سے سی آئی اے کی کسی بھی کارروائی کو روک سکتا ہے ..... مگر آج تک کسی صدر نے ایسا نہیں کیا“۔

سی آئی اے آج کے دور میں بھی سیاسی اور عسکری جاسوسی کے لئے سابقہ طریقوں پر گامزن ہے۔ سیاسی لوگوں کے ذریعے ہی اپنے بہت سے مسائل حل کرواتی ہے۔ امریکی خزانے کا ایک بڑا بجٹ تقریباً تین بلین ڈالر اس کے تصرف میں ہوتا ہے۔ شاید اسی نے اسے اتنا طاقتور کر دیا ہو۔ سابق امریکی صدر ٹرومین کے دور میں **1947**ء میں امریکی آئین میں سی

آئی اے سے متعلق چار شقوں کا اضافہ کیا گیا جہاں سے اس ایجنسی نے طاقت پکڑ لی۔ سی آئی اے کی تاسیس میں ایک بڑی وجہ پرل ہاربر پر جاپانی فضائیہ کا حملہ بھی ہے۔ اس حملے میں امریکی بحریہ کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ بعد میں اسے امریکی ملٹری انٹیلی جنس کی نالائقی قرار دیا گیا کہ اگر اس حملے کی اطلاع بروقت موصول ہو جاتی تو شاید اتنی بڑی تباہی نہ آتی۔ اس کے بعد سے سی آئی اے کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

امریکی صدر اور کانگریس کے درمیان یہ مسئلہ کافی شدت اختیار کر گیا تھا لیکن بقول ایک سابق ڈائریکٹر جیمس کولی کے کہ ان تمام تنازعات کے باوجود سی آئی اے اپنی کارروائیوں میں مصروف رہی۔ امریکی صدر اور کانگریس کے اختلافات کے نکات کیا تھے اس کی آج تک تفصیل سامنے نہیں آسکی۔ اسے قومی راز قرار دے کر دبا دیا گیا۔

سی آئی اے کے نئے اہداف ناٹو کے مفادات کے ساتھ وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ 1991ء میں ناٹو کی مشترکہ کانفرنس میں ''اسلامی بنیاد پرستی'' کو ایک نیا چیلنج قرار دیا گیا تھا۔ یقینی بات ہے کہ یہ چیلنج سی آئی اے کے لئے بھی ہے۔ مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے اس چیلنج کا سی آئی اے کیسے مقابلہ کرتی ہے اس کا جواب آنے والا مؤرخ دے گا۔

امریکہ کی علیحدگی پسند تنظیمیں اور سی آئی اے

اب تک امریکہ کے اندر اس کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں کا تناسب خارجی سطح سے زیادہ رہا ہے۔ ڈھائی سو سے زیادہ علیحدگی پسند اور انتہا پسند تنظیمیں امریکی وفاق کے خلاف طویل عرصے سے صف آرا ہیں مگر امریکی میڈیا میں اس کی خاطر خواہ کوریج کبھی بھی نہیں کی گئی۔ داخلی معاملات میں امریکہ کی یہ سرفہرست پالیسی رہی ہے اس لئے امریکہ کو چاہئے کہ اپنے سفارت خانوں اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف قیاس کے گھوڑے دوڑانے کے ساتھ ساتھ اس تخریب کاری کے سرے اپنی داخلی صورتحال میں بھی تلاش کرے۔

نیویارک کی بندرگاہ میں داخل ہوتے ہی آزادی کے مجسمہ کی شکل میں آزادی کی بہت بڑی علامت نظر آتی ہے جس پر امریکیوں کو بہت ناز ہے کہ امریکی قوم انسانی آزادی کا بہت بڑا نشان ہے مگر خود امریکیوں میں اتنا فکری اور نسلی بُعد پیدا ہو چکا ہے جس نے اس کے تشخص کو بڑی حد تک مخدوش کر دیا ہے۔ 4 جولائی 2001ء امریکیوں نے آزادی کے دو سو سال مکمل ہونے پر قومی تقریبات منعقد کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ نسلی اور فکری عناصر کا امریکی معاشرے میں بغض و عناد بھی ایک لمبی عمر پوری کر چکا ہے جو امریکہ میں بسنے والے لاکھوں مہاجرین کے باعث پیدا ہوا ہے۔ یہ مہاجرین اپنے ممالک کے نظام سے فرار حاصل کر کے اور

کچھ روزگار کی تلاش میں امریکہ وارد ہوئے تھے' مگر یہاں سامراجی سوچ نے مختلف نسلوں کے لوگوں میں باغیانہ خیالات پروان چڑھائے۔ اس تباہ کن روش کو دیکھتے ہوئے امریکہ کے 17ویں صدر ابراہام لنکن (1809-1856) نے غلامی کی لعنت سے آزادی کا اعلان کیا تھا۔ 1963ء میں امریکہ کے جنوبی ریاستوں میں خانہ جنگی کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی مگر بھائی چارے کی یہ کوشش بھی گوروں کے نسلی تفاخر تلے دب گئی۔ تفرقہ بازی کی یہ فضا آج دو سو سال بعد بھی اسی طرح برقرار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہام لنکن اور لوتھر کنگ کے قتل ان ہی نسلی تنظیموں کے کارنامے تھے یاد رہے کہ امریکن سی آئی اے کا شمار امریکہ کی بہت سی تنظیموں کے نزدیک ایک سرکاری دہشت گرد تنظیم کے طور پر ہوتا ہے۔ کنگ لوتھر کے قتل میں اس کا ملوث ہونا اب کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ 1865ء میں امریکی صدر لنکن کے قتل کے بعد نسلی تعصبات کا یہ طویل سلسلہ ایک مرتبہ پھر زور پکڑ گیا۔ اس کے بعد اس قوم کا دوسرا بڑا حادثہ امریکی صدر جان ایف کینیڈی (1917-1963) کا قتل ہے جنہیں 1963ء میں لی ہاروے آسوالڈ نامی علیحدگی پسند نے سرکاری تقریب کے دوران گولی مار کر قتل کر دیا تھا بعد میں اس قتل کی سماعت کے دوران لی ہاروے کو ایک نامعلوم شخص نے گولی مار دی۔ یوں اس قتل کی ساری شہادتیں گول کر دی گئیں۔ حالانکہ کینیڈی کے قتل سے متعلق تحقیقات کا ایک رخ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ صدر کینیڈی اپنی رنگین مزاجی کی وجہ سے اداکارہ مارلن منرو کے کافی نزدیک آ چکے تھے جس کی وجہ سے خلوت کے دوران صدر کینیڈی کے منہ سے ایسی باتیں نکل گئیں تھیں جو امریکہ کے قومی مفادات کے خلاف جا سکتی تھیں۔ اسی لئے سی آئی اے کے نزدیک صدر کینیڈی امریکہ کے لئے سیکورٹی رسک قرار پائے جس کی پاداش میں انہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بعد میں مارلن منرو کی موت کے ساتھ اصل معاملہ ہی ختم کر دیا گیا۔ ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق لی ہاروے آسوالڈ امریکہ کی نازی ازم سے متاثر تنظیم کا رکن تھا۔ اسی طرح امریکہ کے حکومتی اداروں کی جانب سے رپورٹ پیش کی جاتی ہے کہ امریکہ میں شہری حقوق کے سیاہ فام داعی مارٹن لوتھر کنگ اور اس سے پہلے امریکی جماعت الاسلام کے سیاہ فام لیڈر میلکم ایکس (1925-1965) کو امریکہ کی انتہا پسند تنظیموں نے قتل کروایا۔

ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق 1969ء سے 1993ء کے دوران حکومتی

اداروں پر مجموعی طور پر 32 مرتبہ مسلح حملے کئے جا چکے ہیں۔ یہ حملے امریکہ کی انتہا پسند علیحدگی کی تنظیموں کی جانب سے کئے گئے تھے۔ 1993ء کا سال امریکہ میں بدامنی کا سال قرار دیا جاتا ہے۔ دائیں بازو کے انتہا پسند عناصر نے امریکہ کے پرہجوم علاقوں پر حملے کئے ان حملوں کی تعداد اکیس بتائی جاتی ہے جبکہ 1992ء میں چار حملوں کے دوران سینکڑوں امریکی لقمہ اجل بن گئے تھے۔ تمام دنیا میں انسانی حقوق اور اظہار رائے کی آزادی کا چیمپئن امریکہ دوسرے ممالک خصوصاً ایشیائی ممالک کو انسانی حقوق کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بناتا رہتا ہے مگر خود اس کی داخلی صورتحال کا برا حال ہے۔ 1990ء سے لے کر تا حال امریکہ کے مضبوط حکومتی اداروں پر منظم حملے ہو چکے ہیں۔ امریکہ کی نیوز ایجنسی کے مطابق انتہا پسندوں کی جانب سے گزشتہ تین سالوں کے دوران 15 بڑے حملے تجارتی اداروں پر دس حملے فوجی تنصیبات پر تین حملے تعلیمی اداروں اور ایک امریکی وزارت خارجہ کی سفارتی اکیڈمی پر کیا گیا۔ ان میں 24 حملوں کے دوران بڑے دھماکہ خیز بم استعمال کئے گئے ان دھماکوں میں زیادہ تر نوعیت کار بموں کی تھی۔ چھ گھنٹوں پر آگ پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ جس کی وجہ سے آگ لگنے والے مقامات مکمل طور پر جل گئے۔ ان تخریبی کاروائیوں کے نتیجے میں امریکہ کو 1989ء میں 84 ملین 9 لاکھ ڈالر' 1990ء میں 16 ملین تین لاکھ ڈالر' 1991ء میں 72 ملین ایک لاکھ ڈالر' 1992ء میں 22 ملین چھ لاکھ ڈالر' 1993ء میں 526 ملین چار لاکھ ڈالر کا مجموعی طور پر نقصان ہوا۔ یہ نقصان املاک کی شکل میں تھا۔

ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق 1989ء میں 569' 1990ء میں 449' 1991ء میں 770' 1992ء میں 514' 1993ء میں 1445 افراد امریکہ میں دھماکوں اور دوسری تخریبی کاروائیوں کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ 1995ء تک ہونے والے دھماکوں کی تعداد امریکی تفتیشی ادارے کے مطابق 169 کے قریب بنتی ہے۔ 1982ء سے 1995ء کے درمیان ہونے والے دھماکوں میں 16 دھماکے یہودی انتہا پسند دہشت گرد تنظیموں نے کئے اہل مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والی عرب تنظیموں کے صرف تین حملے ریکارڈ پر آ سکے ہیں۔ امریکہ کی دائیں بازو کی تنظیموں نے 129 حملے اور بائیں بازو کی تنظیموں نے 21 تخریبی کاروائیوں میں حصہ لیا۔ 1988ء اور 1994ء کے درمیانی دور میں تخریب کاری کی 32 بڑی

وارداتیں عمل میں آئیں۔

امریکی تاریخ میں گذشتہ 57 سالوں کے دوران 11 ستمبر کے بعد تخریب کاری کا شدید ترین واقعہ 19 اپریل 1995ء کو فیڈرل بلڈنگ اوکلے ہاما سٹی میں پیش آیا دھماکہ کرنے والے ملزم ٹیوتھی میکوے کا تعلق علیحدگی پسند تنظیم مشی گن ملیشیا سے تھا اس دھماکے میں 186 افراد ہلاک اور 400 کے قریب زخمی ہوئے شروع شروع میں امریکیوں نے حسب عادت یہ دھماکہ بھی مسلمانوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی۔ تمام امریکی میڈیا مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہو چکا تھا مگر دہشت گردی کا کوئی راستہ مسلمانوں کی طرف نہیں جاتا تھا اس لئے تحقیق کا رخ امریکہ کی علیحدگی پسند اور انتہا پسند تنظیموں کی طرف موڑنا پڑا جس کے بعد مذکورہ بالا شخص کی گرفتاری عمل میں آسکی۔ فلسطین نژاد امریکی سکالر ایڈورڈ سعید نے ان حالات کے تناظر میں کہا کہ امریکی معاشرہ مزاجی لحاظ سے فکری اونچ نیچ کا مظہر ہے جسکی وجہ سے مختلف افکار کے گروپ یہاں شروع سے ہی زور آزمائی کی کیفیت میں ہیں۔ امریکہ کی سابق خاتون اول ہیلری کلنٹن نے بھی امریکہ میں ہونے والے تشدد کے ان واقعات پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس صدی کے آخر تک امریکہ دائیں اور بائیں بازو کی تنظیموں کے درمیان کشمکش کا مرکز رہے گا۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق امریکی معاشرے اور سیاست میں مذہب کا اہم کردار رہا ہے اور اب تک زور وشور سے جاری ہے یہ امریکہ کے اس دعوے کے خلاف جاتا ہے جس میں پروپیگنڈہ کی حد تک کہا جاتا ہے کہ امریکہ تمام دنیا میں آزادی کی علامت ہے امریکہ کے بنیاد پرست معاشرے میں اسلامی فکر ایک خاص انداز لئے ہوئے ہے جس کے لاکھوں ارکان اس وقت امریکی معاشرے کا اہم حصہ ہیں مگر امریکی حکومت اور میڈیا چونکہ یہودی اجارہ داری میں ہے اس لئے امریکہ کی اس بڑی مذہبی اقلیت کو معاندانہ رویے کا سامنا ہے۔ امریکہ خارجی سطح پر مذہبی فکر کا سیاست سے الگ ہونے کا کتنا ہی پرچار کیوں نہ کرے داخلی سطح پر اس کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا امریکی میڈیا پر اسے بڑی حد تک چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ باہر کی دنیا پر اس کا تاثر قائم نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر کی دنیا امریکہ میں پکنے والی اس فکری اور سیاسی کھچڑی سے بڑی حد تک ناواقف ہے اور امریکی نظام کو ایک محفوظ نظام تصور کرتی ہے مگر صورتحال اس سے بالکل مختلف ہے۔ امریکہ داخلی طور پر جتنا غیر محفوظ ہے دنیا میں کوئی اور نہیں

ہوگا۔ اس وقت مجموعی طور پر علیحدگی پسند اور انتہا پسند تنظیموں کی تعداد 274 کے قریب بتائی جاتی ہے جنہوں نے دنیا کی اس واحد سپر طاقت کا وجود خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔

تجارت کے میدان میں جاپان اور چین کے ساتھ امریکی جنگ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے مگر اس اقتصادی جنگ کا زیادہ تر تعلق حکومتی سطح پر ہے مگر امریکہ کے بڑے تجارتی ادارے امریکہ کی اس پالیسی سے متفق نہیں ہیں۔ انہیں اپنے تجارتی مفادات عزیز ہیں مگر حکومت امریکہ ان تجارت مفادات کو سیاسی شیشہ گری سے منسلک رکھتی ہے۔ امریکہ کی سرزمین پر تجارتی مفادات کی یہ جنگ کاروباری حلقوں کے نزدیک تجارتی آزادی کے خلاف ہے۔ تجارت کی یہ نوعیت اسلحے کی قسم تک جا پہنچتی ہے۔ تجارتی بنیادوں پر اسلحہ تیار کرنے والے بہت سے ممالک امریکہ کی تجارتی استعماریت کے خلاف پرائیویٹ اسلحہ ساز کمپنیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے ممالک نے اس شعبے میں ترقی کرنے کے بعد ایٹمی' کیمیاوی اور بارودی سرنگوں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ ممالک بھی امریکہ کی پرائیویٹ اسلحہ ساز کمپنیوں سے تجارتی لین دین رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سی امریکی تنظیموں کے ہاتھ کیمیائی ہتھیار بھی لگ چکے ہیں جو کسی بھی وقت امریکی معاشرے کو تباہی سے دوچار کر سکتے ہیں۔ عیسائیت کے بہت سے فرقوں کی نمائندہ جماعتیں بھی امریکہ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو عوام میں اس قسم کے خیالات پھیلاتی ہیں کہ امریکی قوم اللہ کی پسندیدہ قوم ہے۔ 1998ء کے شروع میں امریکہ میں ایک سروے کے دوران جو رپورٹ مرتب کی گئی اس کی رو سے 86 فیصد امریکیوں کا خیال ہے کہ وہ اللہ کے پسندیدہ قوم ہیں جس کی وجہ سے انہیں تمام قوموں پر برتری حاصل ہے۔ اسی قسم کے نسلی تفاخر بھی امریکی معاشرے میں تشدد کی لہر کو ہوا دیتے ہیں کیونکہ اس عقیدے کی رو سے امریکی ہر دوسری قوم اور نسل کے افراد کو کمتر سمجھتے ہیں۔

بہت سے لوگ جواب ہجرت کر کے امریکی معاشرے کا حصہ بن رہے ہیں انہیں بہت سی دقتوں سے گزرنا پڑتا ہے اب تک امریکہ میں مقیم مہاجرین کی تعداد 52 ملین سے تجاوز کر چکی ہے جو اپنے روزگار میں سے ہر سال خطیر رقم امریکہ کو ٹیکس کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ 1997ء کے دوران ان مہاجرین نے 133 بلین ڈالر ٹیکس کے طور پر ادا کئے تھے۔ یہ اعداد وشمار کانوانسٹی ٹیوٹ امریکہ کی جانب سے شائع کئے گئے تھے۔

عیسائیت کے بہت سے انتہا پسند فرقے امریکہ کی صیہونی لابی کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ ان تمام کا مطمع نظر اسرائیلی مفادات کا تحفظ ہے یہی لابی حکومت پر زیادہ اثر انداز ہے یہ وجہ ہے کہ امریکی صدر کے فیصلوں میں اسرائیلی مفادات کا خیال سب سے زیادہ رکھا جاتا ہے بصورت دیگر اسے صدر کلنٹن والی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عیسائیت کے انہی فرقوں میں ایک فرقہ ''انجیلی عیسائیت'' کا ہے اس فرقے کے اہم ارکان میں امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن بھی ہیں۔ اس فرقے کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ جب تک تمام یہودی اسرائیل میں بس نہیں جائیں گے اس وقت تک مسیح موعود کا ظہور نہیں ہوگا۔ اس لئے امریکی پالیسی میں عبرانی ریاست کی بھرپور معاونت لازمی جز ہے۔ استعماری دور کا یورپی فلسفہ کہ دنیا مفید انسان کی غلام ہے نئی شکل میں سامنے آچکا ہے جو دنیا بھر میں یہودی مفادات کی شکل لئے ہوئے ہے۔ سابق امریکی صدر ریگن کے دور میں سٹار وار پروگرام جس تیزی سے پروان چڑھایا گیا تھا اس کے پس منظر میں یہی فکر کارفرما تھی کہ دنیا کو امریکی طاقت میں جکڑ دیا جائے تاکہ اسرائیلی مفادات کو کوئی ضرب لگانے کی جرات نہ کر سکے۔

پچھلے چند برسوں سے امریکہ میں انتہا پسند اور علیحدگی پسند تنظیمیں زیادہ زور پکڑ چکی ہیں جس کی وجہ سے امریکی معاشرے میں تشدد کے واقعات میں کافی تیزی آگئی۔ ان تنظیموں میں مذہبی فرقہ واریت کی جماعتیں زیادہ شامل ہو چکی ہیں جو عیسائیت کے بہت سے فرقوں پر مشتمل ہیں۔ علیحدگی پسند تنظیم کی سب سے بڑی کاروائی **1995**ء میں اوکلے ہاماسٹی میں فیڈرل بلڈنگ میں دھماکہ تھی جس نے امریکی حکومت کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ **1996**ء میں امریکہ کے اولمپک کھیلوں کے دوران بھی دھماکہ ایسی ہی تنظیم نے کرایا تھا' اس میں متعدد امریکی تماشائی مارے گئے تھے۔ **2002**ء میں امریکہ میں ٹیکساس ریاست کے علاقے جامبر میں ایک سیاہ فام کو انتہائی بے دردی سے اس کی کار میں قتل کر دیا گیا اس فسوسناک واقعے سے افسوس ناک امریکی میڈیا کا وہ رویہ تھا جو اس نے اس خبر سے صرف نظر کر کے اختیار کیا۔ اس سے پہلے بھی ایک سیاہ فام امریکی کے قتل سے لاس اینجلس ریاست فسادات کی زد میں آچکی ہے۔ سیاہ فام امریکی کے قاتل شون بیری اور نس بریور اور جون کنگ کا تعلق سفید فام تنظیم ''کوکلکس کلان'' سے تھا' یہ تنظیم گوروں کی اتھارٹی قائم کرنے کی داعی ہے۔ اس تنظیم کے جرائم کی تاریخ خاصی طویل

ہے امریکہ کے سیاہ فام مسلمانوں کے راہنما مالکم ایکس کے قتل کے پیچھے بھی اسی انتہا پسند تنظیم کا ہاتھ تھا۔ امریکہ کی دو خطرناک تنظیمیں (انتہا پسندوں کی انجیل) اور (دائیں بازو) کے گورے اب تک امریکہ میں بہت سی خطرناک کاروائیاں کر چکے ہیں۔ 'مذاکرات ٹیریز'' کے عنوان سے انتہا پسندوں کا ایک زیر زمین اجلاس بھی ہو چکا ہے۔ جس کی رو سے ان جماعتوں نے سفید فام استعماریت کے لئے جدوجہد کے عزم کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں سفید فام لبرل حکومتی حلقوں کو کچلنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ یہ مذاکرات ایرل ٹیریز نامی امریکی کے نام سے موسوم کئے گئے تھے جو انتہا پسندی میں دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی سربراہی میں انتہا پسندوں نے زیر زمین تخریبی کاروائیاں کر کے امریکی حکومت کو مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کا ہدف امریکہ کے سفید فام لبرل حکومتی حلقے تھے تاکہ سفید فام استعماریت کی راہ کا ہر پتھر ہٹا دیا جائے۔ چاہے وہ خود بھی سفید فام ہی کیوں نہ ہو۔ ان انتہا پسند عناصر کی تخریبی کاروائیاں یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ایک مرتبہ انہوں نے واشنگٹن میں ایف بی آئی کا مرکزی دفتر دھماکہ سے تباہ کر دیا تھا۔ اوکلے ہاماسٹی میں دھماکوں کے بعد امریکیوں کی بڑی تعداد کا خیال تھا کہ یہ کاروائی دائیں بازو کی انجیل نامی جماعت کا کارنامہ ہے جبکہ ایف بی آئی کوکلکس کلان جس کا مخفف ''کے کے کے'' ہے اس میں ملوث ہے۔ جبکہ امریکی میڈیا بغیر کسی ثبوت کے مسلمانوں کو اس دہشت گردی میں ملوث کر رہا تھا جس کی وجہ سے وقتی طور پر امریکی مسلمانوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ امریکی میڈیا کی یہ مجرمانہ غفلت مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اس طرح اصل مجرم پر بھی پردہ پڑ جاتا مگر اس اقدام کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ امریکہ کی ان انتہا پسند جماعتوں کا دائرہ کار صرف امریکہ تک محدود نہیں ہے بلکہ امریکہ سے باہر امریکی مفادات کے خلاف بھی یہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ امریکہ سے باہر ان تنظیموں کو امریکہ مخالف ممالک کے تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح امریکہ نے بھی کئی مخالف ممالک کی باغی تنظیموں کو اپنے ہاں پناہ دی ہوئی ہے۔ جس میں لیبیا ایران سرفہرست ہیں۔ لیبیا کے باغی افراد پر مشتمل تنظیم کو امریکہ میں گوریلا ٹریننگ بھی دی جاتی رہی ہے۔ جس کی تفصیلات کویت سے شائع ہونے والے المجتمع اور عراقی اخبار الجمہوریہ میں آتی رہی ہیں۔ امریکہ کی اس تخریبانہ سوچ نے آج خود اسے اس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں وہ خود اپنے ہی دہشت گردوں کے ہاتھوں لرزاں ہے۔

فروری 2001ء میں امریکہ میں ایف بی آئی نے نیوادا میں دو امریکیوں کو گرفتار کر کے جب تفتیش کی تو معلوم ہو کہ ان کا تعلق ایرین پیپل نامی دہشت گرد تنظیم سے ہے اور وہ نیویارک میں چلنے والی زیر زمین مسافر ٹرین میں کیمیاوی ہتھیار سے حملے کا منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ تخریبی کاروائی میں انہوں نے انتھراکس گیس استعمال کرنی تھی جس کا شمار انسانی جان کے سلسلے میں انتہائی مہلک گیسوں میں ہوتا ہے مگر انتہائی پراسرار انداز میں انہیں رہا کر دیا گیا۔
اس کے علاوہ امریکن ایف بی آئی کے بیان کے مطابق امریکی ریاست لاس ویگاس سے ملحق کیمیائی مواد بڑی مقدار میں قبضے میں لیا گیا مگر امریکی میڈیا میں خاموشی کے ساتھ اس پر بھی پردہ ڈال دیا گیا تاکہ امریکی عوام میں خوف و ہراس نہ پھیل سکے۔ اس کاروائی میں ملوث پہلا مجرم لاری واین ہاریس 64 سال اوہایو ریاست میں جراثیمی ہتھیاروں کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔
جس کا تعلق امریکی جریدے (جنرل) کے مطابق Arian People نامی دہشت گرد تنظیم سے ہے اس کے علاوہ ''کرسچن ایڈنٹی'' نامی انتہا پسند جماعت جو امریکہ کے سیاہ فام اور نئے مہاجرین کے خلاف کاروائیاں کرتی ہے کچھ عرصہ پہلے ڈاک کے لفافوں کے ذریعے اس نے جراثیمی مواد لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔ انکشاف ہونے پر امریکی میڈیا نے حسب عادت مسلمانوں کو ملزم ٹھہرانا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ کہا گیا کہ عراق اپنے کیمیائی ہتھیاروں کے ذریعے امریکہ سے بدلہ لے رہا ہے۔ مگر جب مزید تحقیق کی گئی تو اس سازش کے تانے بانے مذکورہ تنظیم سے جا ملے ان مختصر مثالوں سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کی علیحدگی پسند اور انتہا پسند تنظیموں نے کس حد تک اس سپر طاقت کا وجود خطرے سے دوچار کر دیا ہے

شمالی افریقہ اور مغربی ایجنسیاں

14 جون 1987ء کو اٹلی کے دارالحکومت روم کے مضافات میں واقع ایک قدیم طرز کی پرشکوہ عمارت مکمل طور پر سخت سیکورٹی کے گھیرے میں تھی عام طور پر اس عمارت کی طرف جانے والے راستے سنسان ہوتے ہیں مگر نہ نظر آنے والا ایک حفاظتی حصار ہمیشہ اس کے گرد قائم رہتا ہے یہ اٹلی کی ملٹری انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر ہے اس روز یہاں فرانسیسی انٹیلی جنس اور امریکن سی آئی اے کے بڑے نمائندے اٹلی کی ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ ایڈمرل فرانکو مارٹینی کی قیادت میں نائبین کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ جنوبی یورپ اور اس کے بالکل سامنے واقع شمالی افریقہ کی صورتحال کو سامنے رکھ کر آئندہ کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔ اس اہم ترین میٹنگ کا ایجنڈہ شمالی افریقہ میں نئی اٹھنے والی اسلامی لہر کا تدارک کرنا اور مغرب زدہ سیاسی خاندانوں کو یورپی خفیہ اداروں کی معاونت سے مسند اقتدار پر بٹھانا یا برقرار رکھنا تھا جو طاقت کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے اسلامی عناصر کو کچل کر رکھ دیں تاکہ شمالی افریقہ کے اسلامی عناصر جن کے اور یورپ کے درمیان صرف بحیرہ روم کی ناقابل دشوار پٹی رہ جاتی ہے جنوبی یورپ کو اپنے حلقہ اثر میں نہ لے سکیں۔ اس کے تدارک کے لئے فرانس اور اٹلی کو کلیدی کردار ادا کرنا تھا کیونکہ یہ دونوں ملک استعماریت کے دور میں یہاں کے اہم علاقوں لیبیا، الجزائر اور مراکش میں اپنی اپنی استعماریت قائم کر چکے تھے۔ فرانسیسی خفیہ ایجنسی کے نمائندے موزارٹ شیلر کے مطابق

الجزائر میں اسلامی عناصر تیزی کے ساتھ مسلمان نوجوانوں میں کام کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نوجوان مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر تیزی کے ساتھ اسے اپنی زندگیوں پر نافذ کر رہی ہے جو نہ صرف شمالی افریقہ میں مغربی مفادات کے لئے بلکہ خود یورپ کے اندر خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں شیلر کے مطابق اس وقت تمام شمالی افریقہ جو الجزائر، مراکش، تیونس، لیبیا اور مصر پر مشتمل ہے کی مجموعی آبادی کا ستر فیصد حصہ اٹھارہ سے لے کر ستائیس سال کی عمر کے مسلمانوں پر مشتمل ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی بھی اقدام کے خلاف یہاں سے اٹھنے والے ردعمل میں زبردست جوانی پائی جاتی ہے۔ سی آئی اے کے نمائندے سائمن روک کے مطابق آزادی کے بعد لیبیا کے علاوہ یہاں کے دوسرے ممالک کی افواج کے افسران اعلیٰ عسکری تربیت کے لئے یورپی ممالک کی ملٹری اکیڈمیوں میں تربیت حاصل کرتے رہے ہیں جن کی وجہ سے سویلین کی نسبت فوج میں مغربی ذہن کے افراد کی تعداد زیادہ ہے جنہیں استعمال کر کے شمالی افریقہ میں اٹھنے والی اسلامی لہر کو قابو کیا جاسکتا ہے سائمن کے مطابق مراکش کے علاوہ یہاں کے تمام ممالک میں جمہوریت اور فوجی حکومتوں کے درمیان سیاسی کشمکش رہی ہے مگر ابھی تک فوج کا ہی پلہ بھاری رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ملک جمہوری ہی کہلاتے ہیں آئندہ کسی بھی جمہوری عمل کے نتیجے میں یہاں کی اسلامی جماعتیں بھاری اکثریت کے ساتھ حکومت میں آسکتی ہیں۔ یہ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ امریکہ کے لئے بھی انتہائی تشویش ناک امر ہوگا اس لئے امریکہ یہاں کسی بھی جمہوری عمل کو برداشت نہیں کرے گا بلکہ اس کی نسبت فوجی حکمران اس کے مفاد میں ہیں۔ اٹلی کی ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ ایڈمرل فرانکو مارٹینی کے تجزیئے کے مطابق ''مراکش میں بادشاہت قائم ہے شاہ کی موجودگی میں مراکش کے اسلامی عناصر کا سر اٹھانا فی الوقت ناممکن ہے جبکہ تیونس میں حبیب بورقیبہ کی تمام تر مغرب پرستی کے باوجود وہاں کی اسلامی تحریکیں اندر خانے اپنے آپ کو تیزی کے ساتھ مستحکم کر رہی ہیں جو کسی بھی اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں جو تیونس بلکہ آس پاس کے اسلامی ممالک کو اپنے حلقہ اثر میں لئے بغیر نہیں چھوڑے گا اس لئے حبیب بورقیبہ کی موت سے پہلے ہی مستقبل میں اس اچانک پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنا پڑے گا اس سلسلے میں اٹلی کی نظر انتخاب تیونس کے جنرل زین العابدین بن علی پر ہیں۔۔۔۔'' سی آئی اے

KURF

کے نمائندے سائمن نے ایڈمرل فرانکو مارٹینی کے اس ''انتخاب'' کی توثیق کر دی جس کا مطلب تھا اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا اب اٹلی کی فوج اور خفیہ ایجنسی کی ذمہ داری ہے۔۔۔!

روم کے مضافات میں واقع اطالوی انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں دنیا کی مختلف خفیہ ایجنسیوں کے درمیان ہونے والا یہ اجتماع نو روز تک جاری رہا جس میں نہ صرف شمالی افریقہ میں جمہوریت کی ہر قسم کی بساط لپیٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا بلکہ فوجی جنرلوں اور مغرب زدہ بیوروکریسی کو ہر طرح سے نوازنے اور ان کے اقتدار کو دوام دینے کے لئے ہر قسم کے اقدام کا پختہ ارادہ کر لیا گیا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب افغانستان کی جنگ اپنے فیصلہ کن موڑ پر آ گئی تھی سوویت یونین مردہ لاش کی مانند ہو چلا تھا اور امریکہ اور یورپی ممالک مردار خور گدھوں کی طرح اس پر منڈلانے کی تیاریاں کر رہے تھے عرب مجاہدین کی بڑی تعداد شمالی افریقہ سے جہاد میں حصہ لینے افغانستان گئی تھی جسے اب واپس اپنے اپنے وطن پلٹنا تھا جہاں یہ بات امریکہ اور یورپ کو بری طرح کھٹک رہی تھی وہاں مقامی جنرلوں اور بادشاہوں کو اپنے اقتدار کے سنگھاسن ڈولتے نظر آ رہے تھے۔

مندرجہ بالا حقائق سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ اور یورپی ممالک جس ہمہ گیری کے ساتھ اسلامی ممالک میں نہ صرف ڈھٹائی کے ساتھ دخل اندازی کرتے ہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مقامی حکومتوں کی تشکیل میں اپنی خفیہ ایجنسیاں بھی بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہیں اس وقت امریکہ اور مغربی ممالک افریقی ممالک کی مشترکہ کونسل کی وجہ سے سخت پریشان ہیں دو ماہ قبل لیبیا میں ہونے والی افریقی ممالک کے نمائندہ اجلاس میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ افریقی ممالک اپنے مسائل کے مشترکہ حل کے لئے ایک کونسل تشکیل دیں اس کونسل کا قیام لیبیا پر لاکربی کے طیارے کی تباہی کے الزام کے بعد تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ بہت سے افریقی ممالک کا موقف تھا کہ اس سلسلے میں لیبیا پر لگائے جانے والی بین الاقوامی پابندیاں غیر منصفانہ ہیں اس قسم کی پابندیوں کی زد میں کوئی بھی ملک دوبارہ آسکتا ہے اس کے بعد مشترکہ موقف اپنانے کے لئے اس کونسل کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے بھی مغربی ممالک میں خاصی بے چینی پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود مغربی ممالک اور ان

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

کی خفیہ ایجنسیاں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تا حال شمالی افریقہ میں پوری طرح فعال ہیں اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے مغربی ایجنسیوں کی آشیر باد سے برپا ہونے والے تیونس کے انقلاب کا جائزہ لیں گے

تیونس میں مغربی ایجنسیوں کا کردار

ایک ایسے وقت میں جبکہ تیونس میں صدارتی انتخابات کا غلغلہ تھا اچانک اٹلی کی پارلیمنٹ میں تیونس کے سابق صدر حبیب بورقیبہ کی معزولی اور صدر جنرل زین العابدین بن علی کا صدر بننا بحث کا حصہ بن گیا اس کے بارے میں تفصیلات سب سے پہلے اٹلی کے اخبارات میں آئیں اس کے فوراً بعد مغربی ایجنسیوں کا یہ رسوا کن کردار فرانسیسی اخبارات کا موضوع بن گیا جس میں امریکن سی آئی اے کو یورپی ایجنسیوں کے ساتھ تیونس کے معاملے میں رسوا کن کردار میں ملوث دکھایا گیا ہے۔ مگر اس پر طرہ یہ ہوا اسی ماہ پیرس سے ایک کتاب شائع ہو گئی جس نے اس معاملے میں ان کی رسوائی کو دو چند کر دیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام واقعات ایک ایسے وقت میں رونما ہوئے جب تیونس میں صدارتی انتخابات کا وقت قریب تھا۔ اطالوی پارلیمنٹ کی غلام گردشوں میں کیا ہوا؟ پیرس سے شائع ہونے والی کتاب میں کس قسم کے حقائق سے پردہ اٹھایا گیا؟ تیونس کے سیاسی گماشتے جو ان واقعات کے قریب تصور کئے جاتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟

اٹلی سے شائع ہونے والا کثیر الاشاعت روزنامہ ''لاریبوبلیکا'' اپنی ایک اشاعت میں لکھتا ہے کہ ''اٹلی کی خفیہ ایجنسی کا سابق سربراہ فرانکو مارٹینی نے اکتوبر کی سات تاریخ کو پارلیمنٹ کی جرائم سے متعلق تحقیقی کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اٹلی کے خفیہ ادارے نے سوشلسٹ راہنما کراکسی کے دور صدارت میں تیونس میں صدر حبیب بورقیبہ کے خلاف انقلاب برپا کرایا تھا جس کے نتیجے میں جنرل زین العابدین بن علی کو مسند صدارت پر بٹھایا گیا تھا'' ایڈمرل مارٹینی نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے کہا کہ ''اس وقت اٹلی یہ محسوس کر رہا تھا کہ حبیب بورقیبہ خرابی صحت اور زیادہ عمر ہو جانے کے باعث معاملات پر زیادہ گرفت نہیں رکھ سکیں گے اس لئے وہ کسی وقت بھی ملک کو اسلامی ذہن کے لوگوں کے حوالے کرنے کا سبب بن سکتے تھے جس کے اثرات تمام شمالی افریقہ میں پھیل جاتے۔ اس لئے کراکسی

کی حکومت کے دوران جب اندریوتی اٹلی کے وزیر خارجہ تھے یہ فیصلہ کیا گیا کہ تیونس میں تبدیلی لائی جائے جس کے بعد حکومت کی جانب سے بحیثیت ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ کے مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس سلسلے میں جامع منصوبہ ترتیب دوں'' فرانکو مارٹینی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''حکومت کی جانب سے حکم ملنے کے بعد ہم نے تیونس میں حبیب بورقیبہ کے خلاف انقلاب کا پروگرام وضع کیا اور آخر کار خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اسے کامیابی سے ہمکنار کر دیا سب سے پہلے حبیب بورقیبہ کو اقتدار سے الگ کیا گیا اس کے بعد ایک میڈیکل رپورٹ کے مطابق انہیں سخت علیل قرار دیا گیا جس کی بنیاد پر وہ اب ذہنی اور جسمانی طور پر اس قابل نہیں تھے کہ حکومت کی ذمہ داریاں نبھا سکیں اس لئے ان کی جگہ نیا صدر مقرر کیا جا رہا ہے۔

ایڈمرل فرانکو مارٹینی کے بیان کے مطابق یہ انقلاب چھ اور سات نومبر 1987ء کی درمیانی شب برپا کیا گیا مگر ہم 1985ء۔1987ء کے درمیان جنرل بن علی کو اقتدار میں لانے کا منصوبہ ترتیب دے چکے تھے۔''

اطالوی خفیہ ادارے کے سابق سربراہ کے مطابق یہ انقلاب خوش آئند تھا کیونکہ اس کے دوران کسی قسم کی خونریزی عمل میں نہیں آئی سوائے ایک یورپی ملک کے خفیہ ادارے کے کارندے کے جسے اٹلی کے طے شدہ منصوبے کے طریق کار سے اختلاف تھا اطالوی اخبار ''لاریبوبلیکا'' کے مطابق یہ یورپی ملک فرانس تھا۔ اٹلی کی سرکاری نیوز ایجنسی ''انسا'' نے ایڈمرل فرانکو مارٹینی کے بیانات کی اطالوی پارلیمنٹ کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے تصدیق کی ہے۔

اطالوی اخبارات میں اس قسم کی خبریں آنے کے بعد کئی قسم کے ردعمل بھی سامنے آئے جن میں سابق صدر کراکسی کا ردعمل بھی شامل ہے جو ایک طویل عرصے سے تیونس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کراکسی پر سیاسی کرپشن اور رشوت کے الزامات تھے جس کی بنا پر وہ فرار ہو کر تیونس آ گئے تھے کراکسی نے ایسے کسی بھی انقلاب کی صحت سے انکار کیا ہے انہوں نے اپنے ایک پیغام میں جو فیکس کے ذریعے تیونس سے اطالوی نیوز ایجنسی کو بھیجا گیا کہا کہ ان کی حکومت تیونس میں کسی انقلاب کو لانے میں ملوث نہیں رہی ہے۔۔۔!

مگر خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ نے اطالوی اخبار میں ایک بیان دے کر اس بات کا

اعادہ کیا کہ اٹلی تیونس میں حکومت کی تبدیلی میں کلیدی کردار ادا کر رہا تھا بلکہ یہاں انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''تیونس میں انقلاب کی راہ 1984ء میں ہی ہموار کرنا شروع کردی گئی تھی جب وزیر اعظم کراکسی نے الجزائر کا دورہ کیا تھا جس میں الجزائری حکام نے تیونس کے حالات پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے وہاں مداخلت کا اشارہ دیا تھا 1985ء میں کراکسی نے مجھے وزیر اعظم ہاؤس طلب کیا اور حکم دیا کہ میں الجزائر جا کر الجزائری خفیہ ایجنسی کے سربراہ کو تیونس میں مداخلت جیسے اقدامات سے باز رہنے کی ہدایت کروں اس کے بعد میں نے شمالی افریقہ کے سیاسی تناظر میں ایک طویل منصوبہ بندی تشکیل دی جس میں اطالوی وزارت خارجہ اور خفیہ ادارے نے اہم رول ادا کیا کافی تگ ودو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جنرل بن علی حبیب بورقیبہ کی جگہ تیونس میں زیادہ فعال کردار ادا کر سکتے ہیں یہ بات ہم نے خفیہ طریقے سے الجزائریوں کے کان میں بھی ڈال دی تھی جو اس سلسلے میں لیبیا کے حکام کے ساتھ مشاورت کرنا چاہتے تھے میں خود شخصی طور پر فرانسیسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ ''رینیہ ابنو'' سے ملا جو ہمارے ساتھ مل کر متعدد مشترکہ منصوبوں پر کام کر چکا تھا اسے تمام منصوبے سے آگاہ کیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فرانسیسی حکام اطالوی طریقہ عمل سے مطمئن نہیں بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اٹلی کو تیونس کے ان معاملات سے فی الحال دور رہنا چاہیے۔''

اٹلی کے سابق وزیر اعظم نے اطالوی عدالتوں میں مقدمات سے بچنے کے لئے تیونس کی جانب راہ فرار اختیار کی۔ ان پر رشوت اور مالی کرپشن کے سنگین الزامات عائد تھے ان کی غیر موجودگی میں انہیں اطالوی عدالت نے 25 سال قید کی سزا سنائی تھی تیونس میں اپنے قیام کے دوران کراکسی شوگر کے مرض میں مبتلا ہو گئے جس کی پیچیدگیوں کی بنا پر وہاں ان کے چار آپریشن بھی کئے گئے۔

14 اکتوبر 1999ء کو فرانس سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''ہمارا دوست بن علی'' یہ کتاب فرانسیسی اخبار ''لی مونڈے'' کے ''جان بیار توکوا'' اور اخبار ''لوکنار انشنہ'' کے صحافی نیکولا بو کی مشترکہ کاوش ہے۔ اس کتاب کا انتساب مشہور فرانسیسی ادیب جیل پیرو کے نام ہے جس نے ''ہمارا دوست بادشاہ'' کے عنوان سے ایک کتاب مراکش کے بادشاہ الحسن ثانی سے متعلق تصنیف کی تھی۔ فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والی اس کتاب کو لا دیکوفرٹ

نامی پبلیشنگ ادارے نے شائع کیا۔ اس کے کچھ مندرجات قارئین کی نذر ہیں۔

کتاب کے صفحہ 33 پر مصنفین رقم طراز ہیں کہ ''جس وقت بورقیبہ نے اپنے وزیر داخلہ کو ملک میں معاشی استحکام کے نام پر انقلاب برپا کرنے والوں کی اعانت کے الزام میں برطرف کیا اس وقت سے امریکی اور فرانسیسی حکام کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں اور انہوں نے بن علی کے نام پر غور کرنا شروع کردیا فرانسیسی صدر کے مشیر فرانسوا ڈوغروسر جو ان دنوں شمالی تیونس میں سوروں کے شکار کے لئے آئے ہوئے تھے کے ساتھ بورقیبہ نے ایک ملاقات کے دوران کہا تھا ''فرانسوا میرے لئے کسی اعتماد والے شخص کا نام تجویز کرو'' اس سے پہلے یہی بات بورقیبہ اس وقت کے امریکی صدر ریگن کے مشیر خاص فرنون والٹرز جو سی آئی اے کے سابق نائب سربراہ بھی رہ چکے تھے سے کہہ چکے تھے یوں عملی طور پر 29 جنوری 1984ء میں جنرل زین العابدین بن علی کو نیشنل سیکورٹی کونسل کا ڈائریکٹر بنادیا گیا 1985ء کے آخر میں بن علی وزیر مملکت بنادیئے گئے جبکہ ان کے دوست الحبیب عمار کو نیشنل گارڈ کا سربراہ نامزد کردیا گیا جس نے تین سال بعد داخلی سطح پر بن علی کو صدر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔''

کتاب کے صفحہ 40 پر لکھا ہے کہ

''5 مئی 1987 کو جب حبیب بورقیبہ نے بن علی کو وزیر مملکت مقرر کیا تو ان کا خیال تھا کہ وہ ملک میں داخلی امن وامان کی صورتحال پر اچھی طرح قابو رکھیں گے مگر انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ تیونس میں امریکن سی آئی اے کے حکام سے ملاقاتیں کرنا شروع کردیں جس کی شکایت جب فرانسیسی سفارتخانے کے ملٹری اتاشی نے کی تو انہوں نے اس فرانسیسی اعتراض کو ماننے سے انکار کردیا مگر پھر بھی فرانسیسی وزارت خارجہ نے ''مستقبل کے صدر'' کے امریکن سی آئی اے سے روابط پر غم وغصے کا اظہار بھی کیا۔

مئی 1987ء کو سی آئی اے کا نائب سربراہ فرنون والٹرز شمالی افریقہ میں جب قیام کے بعد واپس امریکہ لوٹا تو اس کے پاس ایک خفیہ رپورٹ بھی تھی جس کے مطابق جنرل زین العابدین بن علی حبیب بورقیبہ کے بعد جمہوریہ تیونس کا اقتدار سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں کیونکہ انہیں تیونس کے تقریبا تمام بڑے مغرب زدہ خاندانوں کی حمایت حاصل ہے اس رپورٹ کا امریکہ میں یہ اثر ہوا کہ تیونس کے اس مغرب پسند جنرل (بن علی) کو امریکی نیشنل

سیکورٹی کونسل کی حمایت حاصل ہوگئی جس کے بعد واشنگٹن سے امریکن کانگریس کا ایک مختصر وفد بورقیبہ کے اس متوقع جانشین سے خفیہ ملاقات کے لئے تیونس بھی آیا۔''

کتاب کے صفحہ 43 پر رقم ہے کہ

''6 نومبر 1987ء کو بورقیبہ نے اپنی بہن کی بیٹی اور وزیر اطلاعات عبدالوہاب عبداللہ کے سامنے بن علی کو وزارت عظمیٰ سے معزول کرنے کا اور اس کی جگہ الصیاح کو مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا اس لئے یہ بات ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے ایک نے بن علی کو بورقیبہ کے ارادوں سے خبردار کردیا جس پر بن علی نے انقلاب کے طے شدہ منصوبے کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔ بن علی اور اس کے حواریوں کا منصوبہ تھا کہ انقلاب اس انداز میں برپا کیا جائے کہ ایسا محسوس ہو اس میں فوج ملوث نہیں اس لئے عام فوج کی بجائے نیشنل گارڈ کے دستوں نے سرکاری عمارتوں، قصر صدارت اور ٹیلی ویژن کو عمارت کا محاصرے میں لے لیا جنرل بن علی کے دوست الحبیب عمار نے صدارتی محل قرتاج پر قبضہ کرکے اس میں ٹیلی فون اور دوسرے مواصلاتی روابط کاٹ دیئے اسے شک تھا کہ کہیں اسلامی تحریکوں کے لوگ قصر صدارت پر ہلہ نہ بول دیں فجر کے وقت وزیر دفاع اور دوسرے جنرلوں سے درخواست کی گئی کہ وہ باری باری جنرل زین العابدین سے ملاقات کریں اور نئی ہدایات حاصل کریں ہر شخص اپنی باری سے اندر جاتا رہا باہر اگر ایک مرتبہ گھنٹی بجتی تو مہمان کے لئے اندر قہوہ بھیجا جاتا اور اگر دو مرتبہ بجتی تو ملاقاتی کو باہر نکلتے ہی گرفتار کرلیا جاتا۔ حبیب بورقیبہ کے سرکاری معالج ہاشمی الزمال کو سات دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ ایسے سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ بورقیبہ طبی طور پر حکومت چلانے کے قابل نہیں رہے تھے اس میں سے ایک ڈاکٹر نے جب احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے بورقیبہ کو دو سال سے نہیں دیکھا پھر کیسے اس پر دستخط کردیئے جائیں اس پر جنرل نے ڈاکٹر کو ڈانٹ دیا اور دستخط کرالئے گئے۔

شام کے وقت الھادی البکوش جو بعد میں وزیر مملکت بنے نے الجزائری سفیر سے ملاقات کے بعد انہیں تمام صورتحال سے آگاہ کیا الجزائریوں کو ہی سب سے پہلے اس انقلاب کی خبر ملی تھی۔ اگلی صبح منہ اندھیرے الجزائری وزیر خارجہ احمد طالب الابراہیمی نے اس وقت کے فرانسیسی وزیر مملکت جاک شیراک سے فون پر بات کرتے ہوئے حالات کے بارے میں تبادلہ

خیال کرتے ہوئے کہا کہ تیونس کے حالات پوری طرح قابو میں ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فرانس کو خبردار بھی کیا کہ وہ فی الحال تیونس کے معاملات سے دور رہے حقیقت یہ ہے کہ تیونس میں برپا ہونے والے انقلاب کی سن گن الجزائر کو اپنی خفیہ ایجنسی کے ذریعے دو ماہ پہلے ہی مل چکی تھی الجزائر کی خفیہ ایجنسی کے لوگ اس دوران تیونس میں کافی فعال رہے تھے۔''

اس مقام پر ہم بن علی سے متعلق کتاب کا ترجمہ ختم کرتے ہیں مگر لندن سے موصول ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق تیونس کی سیکورٹی کونسل کے ایک رکن ''المنصف بن قبیلہ'' کو انقلاب کی رات اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب اس نے ضروری کاغذات کے ساتھ اپنے آفس سے فرار ہونے کا ارادہ کیا تھا المنصف کے مطابق انقلاب کی رات امریکہ کا چھٹا بحری بیڑا تیونس کی سمندری حدود کے قریب آچکا تھا امریکیوں کو خدشہ تھا کہ کہیں اقتدار پر قبضے کے دوران اسلامی عناصر فوج کے ساتھ نہ الجھ جائیں یا لیبیا کی جانب سے کوئی مداخلت نہ ہو اس مقصد کے لئے جمہوریت پسند امریکہ کا چھٹا بحری بیڑا جنرلوں کی متوقع اعانت کے لئے تیونس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس بات میں بھی شک نہیں کہ اٹلی جغرافیائی طور پر تیونس کے قریب ترین یورپی ملک ہے بلکہ اٹلی کے بعض جزیروں سے رات کے وقت شمالی تیونس کی روشنیاں دیکھی جاسکتی ہیں اس نسبت سے اطالوی کبھی بھی تیونس کے اس تاریخی کردار کو نہ بھلا سکے جو اس نے مجاہدین اسلام کی اعانت کے لئے ادا کیا تھا جب شمالی تیونس کی جانب سے مسلمان جنرل اسد بن الفرات کی قیادت میں مسلمانوں نے حملہ کرکے جنوبی اٹلی پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی جو تین سو سال تک قائم رہی اس نسبت سے اٹلی اور تیونس کا تعلق خاصہ پرانا اور تاریخی نوعیت کا ہے اٹلی فرانس کے بعد دوسرا یورپی ملک ہے جو تیونس کے ساتھ بڑے تجارتی معاہدوں سے منسلک ہے۔ یہاں کی اسلامی تحریکوں کو بن علی نے اقتدار میں آنے کے بعد سختی سے کچلنے کی پالیسی جاری رکھی یہ سلسلہ ان کے پیش رو حبیب بورقیبہ کے دور میں بھی اسی طرح تھا تیونس میں جب بھی پارلیمانی انتخابات کرائے گئے اسلامی جماعتوں نے ہمیشہ اکثریت حاصل کی اور مضبوط اپوزیشن کے طور پر حکومت کی مغرب نواز پالیسیوں کی کھل کر مزاحمت کی حبیب بورقیبہ نے ہمیشہ یہاں مغربی فکر کو ترویج دی فرانسیسیوں کے کندھوں پر سوار ہوکر اقتدار میں آنے والے بورقیبہ نے 5 فروری

1960ء کو ایک بڑے مجمع میں خطاب کیا یہ رمضان کا مہینہ تھا تقریر کے بعد اس نے بھرے مجمعے کے سامنے جن میں بھاری تعداد روزے داروں کی تھی پانی کا گلاس علی الاعلان پیا جو اس کی جانب سے شعائر اسلام کو ختم کرنے کا اظہار تھا۔اس کے بعد سے لے کر بورقیبہ کے زوال تک متعدد بار اسلامی تحریکوں نے اس کا تختہ الٹنے کی کوشش کی مگر مغربی طاقتوں کی تائید نے ہمیشہ اسے بروقت بچالیا۔جنرل زین العابدین کے دور میں اسلامی جماعت سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں کو طرح طرح کی مصیبتوں سے گذرنا پڑا ان جماعتوں کے بہت سے ارکان تا حال روپوش ہیں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے اہل خانہ کو بھی ان کی خبر نہیں مگر عالمی انسانی حقوق کے علمبرداروں کی ہمدردیاں حکومت اور ان کے مغربی نظام کے ساتھ ہیں۔

اس لئے یہاں کی اسلامی تحریکوں سے ہمیشہ یہ یورپی ممالک خوفزدہ رہے اور یہاں کی سیکولر حکومتوں کو اپنا سیکورٹی نظام بہتر بنانے کے لئے اٹلی، فرانس، بیلجیم اور جرمنی مفت اعلیٰ تکنیکی تربیت اور کروڑوں ڈالر کی امداد دیتے رہے ہیں تا کہ یہاں کی حکومت اسلام پسند عناصر کے سامنے ڈٹے رہے۔یورپی دانشوروں کے مطابق شمالی افریقہ میں اسلامی عناصر کا سر نہ اٹھانا یورپی امن کی دلیل ہے۔اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شمالی افریقہ میں کس طرح مغربی خفیہ ایجنسیاں مقامی سیاستدانوں کو ہاتھوں میں لے کر اپنے مقاصد پورے کرتی ہیں اور مغرب نواز طبقے کو نوازا جاتا ہے کس طرح اسلامی تحریکوں کا راستہ روکنے کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی ہے اس منصوبہ بندی میں تمام یورپ بغیر کسی اختلاف کے شریک ہوتا ہے۔ بن علی کا اقتدار ہو یا مراکش کی بادشاہت یا پھر مصر اس وقت امریکہ شمالی افریقہ میں سب سے زیادہ لیبیا کے ہاتھوں زچ ہوا ہے مصر میں حسنی مبارک کی حکومت دلجمعی کے ساتھ امریکی مقاصد کو مکمل کرنے میں منہمک ہے یہی وجہ ہے کہ صدارتی انتخابات کے دوران کسی سیاست دان کو حسنی مبارک کے خلاف الیکشن نہیں لڑنے دیا گیا اسلامی تحریک اخوان المسلمون پر پہلے ہی پابندی ہے مگر جمہوریت کے عالمی چیمپئن امریکہ اور یورپ نے کبھی یہاں حکومت کے اس غیر منصفانہ رویے پر آواز نہیں اٹھائی ،الجزائر کے الیکشن میں اسلامی فرنٹ بھاری اکثریت سے جیت چکا تھا مگر ان کی حلف برداری سے پہلے ہی یہاں جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی اور جمہوریت پسند مغرب کی آشیر باد سے جنرلوں نے یہاں اقتدار سنبھالا ، اسی طرح مراکش میں شاہ حسن ثانی

کے انتقال کے بعد محمد کو بادشاہ بنا دیا گیا اس وقت اردن اور مراکش کے دونوں شاہ عالمی سیاست کے بادشاہ گروں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے ہوئے ہیں۔اس باب میں ہم نے صرف تیونس کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے ورنہ تمام شمالی افریقہ میں صورتحال ایک جیسی ہے۔

دوسری طرف اسی امریکہ اور یورپ کا یہ حال ہے کہ جب پاکستان جیسے اسلامی ملک میں فوج ملک کی جغرافیائی اور فکری سرحدوں کی حفاظت کے نام پر اقتدار سنبھالنے پر مجبور ہوتی ہے تو امریکیوں اور یورپین کو جمہوریت کا دورہ پڑ جاتا ہے اور عسکری قائدین سے جمہوریت کی بحالی کے ٹائم ٹیبل مانگے جاتے ہیں سویلین سیاست دانوں کی بے پناہ کرپشن اور عوامی ردعمل سے اس عالمی ''جمہوریت'' کے محافظوں کو کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ ان کے مالیاتی ادارے ہی قرضوں کی لت لگا کر انہیں کرپشن کے راستے دکھاتے ہیں تا کہ بعد میں بلیک میلنگ کے ذریعے اپنے بڑے مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔

Ω Ω Ω

بلڈر برج

عالمی حکومتوں پر حکومت کرنے والی خفیہ تنظیم

14 مئی 1998ء میں سکاٹ لینڈ کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں سیاہ لیموزین کاروں کا ایک بیڑا آکر رکتا ہے جس میں مغربی دنیا کی انتہائی طاقتور ترین شخصیات سوار ہیں اطلاعات کے مطابق اس ہوٹل میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا تھا جس میں شرکت کے لئے مغربی دنیا کی 120 سیاسی واقتصادی شخصیات نے شرکت کرنا تھی۔ بائیس سو کمروں پر مشتمل اس ہوٹل کو اجلاس سے ایک ہفتہ قبل ہی خالی کرالیا گیا تھا تین دن تک جاری رہنے والے اس اجلاس کے دوران کسی رکن کو ہوٹل سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی سخت ترین سیکورٹی کے انتظامات امریکن سی آئی اے کے خصوصی اسکواڈ اور برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی۔ 6 کے ذمہ تھے۔ غیر سرکاری ذرائع کے مطابق تین دن تک جاری رہنے والے اس خفیہ اور اہم اجلاس کے ایجنڈے میں کئی عالمی امور زیر بحث آئے جس میں نیٹو، یورپی یونین، ایشیا کی اقتصادی صورتحال، دنیا میں سر اٹھانے والی نئی طاقتیں، ترکی اور جاپان کے مسائل، خلیج کی صورتحال، عالمی سطح پر تیل کی پیداوار اور اس کی نقل وحمل اور وسطی ایشیائی ریاستوں سے متعلق امور شامل تھے۔ ان امور کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شائد یہ عالمی سیاسی زعماء یا سربراہان مملکت کا اجلاس ہو مگر ایسا نہیں ہے! بلکہ اس اجلاس میں شامل بیشتر ارکان عام دنیا کے لئے غیر معروف ہیں۔! جی ہاں یہ دنیا کی

طاقتور ترین اور خفیہ عالمی تنظیم بلڈر برج **BILDERBERG** کا چھیالیسواں سالانہ اجلاس تھا۔ ایک ایسی تنظیم جو عالمی حکومتوں پر حکومت کرتی ہے جس کا ذیلی رکن بنے بغیر آج امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم بننے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا ایک ایسا خفیہ اور آہنی ہاتھ جو گذشتہ ایک صدی سے تمام دنیا کے گرم سرد پر حاوی ہے۔

یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ عالم اسلام کی صحافت میں اس خطرناک تنظیم کے بارے میں بھی کوئی تفصیل آئی ہو مگر پاکستان جیسے اسلامی ملک میں جہاں غیر اسلامی طاقتیں اس کے اسلامی تشخص کو ختم کر دینے کے درپے ہیں اس عالمی تنظیم کا تعارف ضروری ہے۔ اس تنظیم کا باقاعدہ قیام 1954ء میں عمل میں آیا تھا اس کے بعد سے اب تک اس کے سالانہ اجلاس عموماً یورپ میں ہی منعقد کئے جاتے ہیں عام طور پر اس کے مستقل ارکان کی تعداد 120 سے 150 تک ہوتی ہے اس تنظیم کے اجلاس کو انتہائی خفیہ رکھا جاتا ہے کسی صحافی یا الیکٹرانک میڈیا سے متعلق شخص کو اس اجلاس والے علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اجلاس کے دوران کسی رکن کو نوٹس تحریر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ کوئی رکن اجلاس کے بعد کسی صحافی سے ملاقات کرسکتا ہے اور اگر اجلاس کی کچھ تفصیلات کسی صحافی کے ہاتھ لگ بھی جائیں تو اس کو شائع ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے اجلاس کی انتظامیہ اسے اچھی طرح جانتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس خفیہ تنظیم کا مکمل ڈھانچہ آج تک واضح نہیں ہوسکا ہے طویل عرصے تک اس کے متعلق اشاروں اور قیاس آرائیوں کے ذریعے ہی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی مگر پھر بھی اصل حقیقت آہنی پردوں کے پیچھے ہی رہی کیونکہ اس تنظیم کی قراردادیں اور کارروائیاں کبھی بھی کھل کر بیان نہیں کی جاتیں۔ عالمی سطح پر اس تنظیم کے حمایتی بھی ہیں یہ ایک قدرتی امر ہے جبکہ مخالفین کی بھی تعداد کم نہیں ہم آگے چل کر دونوں کی آراء کو سامنے رکھ کر حقیقت سے موازنے کی کوشش کریں گے۔

اس خفیہ تنظیم کے بہت سے طرف داروں کے مطابق اس کی تاریخ سیاہ معاملات سے بری ہے جوزف ریٹنگر **Joseph H.Retinger** نامی شخص اس تنظیم کا بانی تھا سویڈن سے تعلق رکھنے والے اس بڑے کاروباری شخص کے عالمی سیاسی میدان میں خاصے تعلقات تھے اس کی سیاسی زندگی کو بہت ہی زیادہ کامیاب تصور کیا جاتا ہے اس کی ان بڑی کامیابیوں میں

سے ہی ایک کامیابی یورپ کو متحد کرنے کی تحریک کو منظم کرنا تھا اس کام کا آغاز اس نے 5 مارچ 1949ء کو اوسٹر بیک شہر میں کیا تھا یورپ کو امن وامان، اقتصادیات اور عسکری لحاظ سے متحد کرنے کا تصور اس کے دماغ میں اس وقت سے موجود تھا جب وہ پیرس میں سوربون یونیورسٹی میں اپنا زمانہ طالب علمی گذار رہا تھا۔

جوزف ریٹینگر نے اپنا یہ نظریہ اس وقت کے فرانسیسی وزیر اعظم جارج کلیمنصو (1841-1929) کے سامنے پیش کیا تھا کہ اسقف اغناطیوس لیولا کی 1534ء میں قائم کردہ مذہبی تنظیم Jesus Organization کے تحت مشرقی یورپ میں آسٹریا، پولینڈ اور ہنگری کو پہلے متحد کردیا جائے مگر کلیمنصو نے ویٹی کن کی جانب سے خاموشی کی وجہ سے اس نظریئے کو مسترد کردیا تھا جبکہ اس وقت فرانس میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جوزف ریٹنگر ویٹی کن چرچ کے ایجنٹ کے طور پر کام کررہا ہے۔

فرانسیسی وزیر اعظم کے اس فیصلے کے باوجود جوزف ریٹینگر نے ہمت نہ ہاری اور سوربون میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے میکسیکو کے کئی دورے کئے تا کہ یورپ کے ساتھ تجارتی اشتراک قائم کیا جاسکے اس سلسلے میں اسے بڑی کامیابی نصیب ہوئی وہ بڑی حد تک یہاں کی حکومت کو اس سلسلے میں قائل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ پچاس کی دہائی میں اس نے مغربی دنیا کے بڑے سیاسی اور حکومتی عہدیداروں میں خاصا رسوخ پیدا کرلیا تھا۔ جوزف ریٹینگر کے حمایتیوں کا دعوی ہے کہ اس نے امن کی بنیاد پر دنیا کو متحد کرنے کا عزم کررکھا تھا جس کے لئے وہ عالمی سطح پر طاقتور تنظیمیں تشکیل دے رہا تھا اس نے اس سلسلے میں ممالک کے درمیان چھوٹے چھوٹے اختلافات ختم کرنے کی کوشش بھی کی تا کہ اپنے مقاصد کی تکمیل کرسکے اقتصادی اور عسکری لحاظ سے اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے طاقت ور تنظیموں کے ذریعے ان ملکوں سے نمٹنے کا منصوبہ بھی وضع کیا تھا جو ان مقاصد کے حصول میں حائل تھے یا رکاوٹیں کھڑی کررہے تھے۔!!

جوزف ریٹینگر کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ موجودہ صورتحال میں امریکہ کی شرکت کے بغیر عالمی امور پر گرفت مضبوط کرنا تقریباً ناممکن ہے اس امر کا ادراک ہوجانے کے بعد اس نے Atlantic Community کی تشکیل کے لئے سعی شروع کردی تا کہ جنگ عظیم

دوم کے بعد یورپ کی کھوئی ہوئی عالمی سیادت کو ازسرنو بحال کیا جاسکے اور بڑھتے ہوئے امریکی سیاسی رسوخ کے سامنے یورپ کی پوزیشن کو متوازن کیا جاسکے۔ جوزف ریٹینگر کی اس فکر کو اس کے قریبی دوست اور ہالینڈ کے شہزادے برنہارڈ Brenhard نے خاصی تقویت عطا کی برنہارڈ کا نام اپنے وقت میں یورپ کے سیاسی حلقوں اور عالمی پیٹرول کی صنعت میں بااثر تصور کیا جاتا تھا اس سلسلے میں ہالینڈ کی تیل کمپنی شیل Shell کلیدی کردار ادا کررہی تھی۔

1952ء میں جوزف ریٹینگر نے شہزادہ برنہارڈ کو تجویز پیش کی کہ نئی تنظیم ''نیٹو'' کے ممبر ممالک کا بند کمرے میں اجلاس بلایا جائے جس میں عالمی امور پر غوروخوض کیا جائے یعنی ایسا اجلاس جس کے بعد کوئی پالیسی بیان نہ دیا جائے اور نہ کسی قسم کی خبر اخبارات میں شائع ہو۔ اسی سال ہالینڈ کے شہزادے برنہارڈ نے امریکی صدر ٹرومین سے رابطہ کر کے انہیں اس قسم کے اجلاس کے منصوبے سے آگاہ کیا امریکی انتظامیہ نے اس منصوبے کو پسند کرتے ہوئے اس کی توثیق کردی یہ سلسلہ امریکی صدر ایزن ہاور کے دور حکومت تک جاری رہا اس سلسلے میں امریکہ کی جانب سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے کرتادھرتاوں نے جوزف ریٹینگر کی اس فکر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اس کمیٹی کے دوارکان اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتے تھے ان میں سے ایک اس وقت کے سی آئی اے ڈائریکٹر جنرل والٹر بیڈل سمتھ Walter Bedell Smith اور سی ڈی جیکسن C.D.Jackson شامل تھے۔ جنہوں نے اس منصوبے سے متعلق یورپین دانشوروں کے ساتھ مل کر کام کیا۔

آخر ان عالمی سیسہ گروں کی محنت رنگ لائی اور اس تنظیم کا پہلا اجلاس مئی 1954ء کو ہالینڈ کے شہر اوسٹربیک Oosterbeek میں ایک فائیو سٹار ہوٹل ''بلڈر برج'' جو ایک قدیم عالی نواب کے محل میں بنایا گیا تھا منعقد کیا گیا جس کی صدارت ہالینڈ کے شہزادے برنہارڈ نے کی اس کے بعد وہ بائیس سال تک اس تنظیم کے خفیہ اجلاسوں کی سربراہی کرتا رہا اسی اجلاس میں اس خفیہ عالمی تنظیم کا نام ہوٹل کے نام پر ''بلڈر برج'' Bilderberg تجویز کیا گیا۔

اس زمانے میں امریکہ میں میکارتھی فکر عروج پر تھی جس کی وجہ سے بلڈر برج کے امریکی ارکان اس بات سے خوفزدہ تھے کہ دائیں بازو کی یہ فکر اگر سیاسی طور پر زور پکڑ گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خفیہ تنظیم میں امریکہ کی نمائندگی کرنے کوئی میکارتھی مقرر ہوجائے، مگر اس

صورتحال پر بھی طریقے سے قابو پالیا گیا اور سی ڈی جیکسن کو نمائندگی کے لئے مقرر کر دیا گیا جس پر یورپی ارکان نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''آئندہ تنظیم میں کسی میکارتھی کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے''۔

بلڈر برج کے ابتدائی اجلاس میں ہی فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ اس خفیہ تنظیم کا اجلاس ہمیشہ کسی نہ کسی یورپی ملک میں ہی کیا جائے گا اس کے اجلاس میں عام طور پر 115 مستقل ارکان ہوتے ہیں بسا اوقات یہ تعداد 120 تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ یورپی ممالک کے ارکان کی تعداد اس میں اسی کے قریب ہوتی ہے باقی پینتیس ارکان شمالی امریکہ یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا سے تعلق رکھتے ہیں مجموعی ارکان کے تین حصے کئے جائیں تو ایک حصہ عالمی سطح پر سیاسی شخصیات پر مبنی ہوتا ہے جبکہ باقی دو حصے بین الاقوامی سطح پر اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اس کے ارکان کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم مستقل ارکان کی ہے جن میں امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر بھی شامل ہے جبکہ دوسری قسم غیر مستقل ارکان کی ہے جنہیں یہ تنظیم ہر سال اپنے خفیہ اجلاس میں شمولیت کی دعوت دیتی ہے۔ 2000ء میں اس تنظیم کے سربراہ نیٹو کے سابق سیکریٹری جنرل لارڈ کیرنگٹن تھے اس کے سالانہ اجلاس سے پہلے چند بڑے مستقل ارکان کے درمیان ایجنڈا تیار کیا جاتا ہے کسی بھی رکن کو اس سے اختلاف یا اس میں ترمیم کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اس کے اجلاس کے لئے عام لوگوں کی نظروں سے دور عالی شان ہوٹل بک کرلیا جاتا ہے جس میں اس کا اجلاس تین ایام تک جاری رہتا ہے اس دوران کوئی رکن ہوٹل سے باہر نہیں آسکتا سیکورٹی کے انتظامات امریکن سی آئی اے کے علاوہ یورپی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں کرتی ہیں یہاں تک کہ ہوٹل کی طرف جانے والے راستے بھی بسا اوقات مسدود کردئے جاتے ہیں اس کا اجلاس ہر سال کے نصف یا پانچویں مہینے کے آخر میں منعقد کیا جاتا ہے۔

ترکی واحد اسلامی ملک ہے جس میں اس تنظیم کا ایک سالانہ اجلاس 1959ء میں ہوا تھا یہ اجلاس استنبول کے ہوٹل ''جنار'' میں منعقد ہوا تھا جبکہ دوسرا اجلاس ترکی کے سیاحتی علاقے ''جشمہ'' میں ''التن یونس'' کے گاؤں میں 1975ء کو منعقد ہوا تھا اس اجلاس میں ترکی کی معروف سیاسی و اقتصادی شخصیات نے شرکت کی تھی جن میں مشہور ترک صنعتکار ''صلاح الدین

ایزید'' جو ترکی کی جانب سے اس تنظیم کے مستقل رکن تھے نے شرکت کی تھی اس کے علاوہ ترکی کی بڑی اخباری ایمپائر اور ٹی وی چینل AVT کے مالک ''ڈنج بیلکن'' کے علاوہ ''غازی ارجل'' صدر سنٹرل بنک ترکی، ''امرہ کونانصوی'' اقتصادی شعبے کے پروفیسر اور سابق وزیر، ''حکمت چتین'' ترکی پارلیمنٹ کے سابق سربراہ اور سابق ترک وزیر خارجہ ''اسماعیل جم'' بھی شامل تھے۔

ان تفصیلات کے ساتھ ساتھ اس خفیہ تنظیم پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق بین الاقوامی میسونی تحریک سے ہے کیونکہ اس کا اپنے آپ کو انتہائی پردہ اخفاء میں رکھنا میسونی طرز عمل سے میل کھاتا ہے چاہے اپنے طور پر اس تنظیم نے کوئی خیر کا کام ہی کیوں نہ کرنا ہو مگر اسے ہمیشہ سو پردوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ کی بنیاد پر بھی یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ آخر کون اس تنظیم کے بے پناہ اخراجات برداشت کرتا ہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلے امریکہ میں یہودیوں کی سب سے بڑی تجارتی کمپنی راک فیلر کا نام آتا ہے اس کے بعد ارب پتی یہودی بینکار روتھ شیلڈ کے بینک کا پتا ملتا ہے۔ آخری چیز جو اس شک کو مزید پختہ کردیتی ہے کہ یہ خفیہ اور انتہائی خطرناک تنظیم میسونیوں کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے ان میسونی شخصیات کا پتا چلتا ہے جو اب تک اس تنظیم کی ادارت کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں۔ مثلاً خود جوزف رٹینگیر جس کا انتقال 1960ء میں ہوا تھا اپنے حلقہ احباب میں معروف میسونی شمار کیا جاتا تھا۔

بلڈر برج کی تشکیل کے تقریباً بیس برس بعد اس کی کچھ ذیلی شاخیں بنائی گئیں تا کہ بلڈر برج سے متعلق مستقل ارکان کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی امور پر اثر انداز ہوا جاسکے کیونکہ اس کے بہت سے ارکان دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہاں کے عوام اور مصلحتوں کی بھی پروا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر اس مقام پر جمہوریت، عوامی رائے اور دانشوروں کی فکر ان کے ارادوں میں مزاحم ہوتی تو یہ آمریت پر اتر آتے اور دہشت گردی کی بنیاد پر عوام اور حکومتوں کو خوفزدہ کر کے مقاصد حاصل کئے جانے لگے۔ یہ اسلوب اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں کے نزدیک انتہائی مرغوب ہے۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ گذشتہ بیس سالوں کے دوران امریکہ اور برطانیہ میں سیاسی طور

پر کامیابی کے لئے اس خفیہ تنظیم سے وابستگی لازم ہو چکی ہے امریکہ کے بہت سے صدر اس تنظیم کی رکنیت کے بعد ہی کرسی صدارت تک پہنچ سکے ہیں ان میں رونالڈ ریگن، جیمی کارٹر، جارج بش اور بل کلنٹن شامل ہیں۔!! برطانیہ کی سابقہ وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے 1975ء میں اس کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی تھی ٹھیک چند سالوں بعد وہ وزیر اعظم بنا دیکئیں۔اسی طرح اشتراکی خیالات کا حامل ایک نوجوان برطانوی سیاست دان ٹونی بلیر گمنامی کے اسفل درجات میں پڑا تھا برطانیہ جیسے سرمایہ دار ملک میں اشتراکی نظریات کا اخذ کرنا اپنے آپ کو سیاسی موت سے ہمکنار کرنے کے مترادف ہوتا ہے مگر جلد ہی یہ نوجوان اپنی فکر سے تائب ہو کر وزیر اعظم بننے سے چار سال قبل بلڈر برج کے سالانہ اجلاس میں شریک کیا گیا جس کے بعد یکدم اسے شہرت کی بلندی تک پہنچا دیا گیا اور یوں وہ اپنے سابقہ نظریات سے متصادم نظام رکھنے والے ملک کا وزیر اعظم بن گیا۔

پچھلے سال اس تنظیم کا ایک اجلاس ''ٹورنبری ہوٹل'' میں ہو رہا تھا جس میں چند مغربی صحافیوں نے داخل ہونے کی کوشش کی تھی مگر انہیں اس سلسلے میں مکمل طور پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی مگر پھر بھی جس حد تک انہیں اس اجلاس کا ایجنڈا سمجھ میں آ سکا اسے انہوں نے The New World Order Intelligence Update کے نام سے شائع کیا تھا جس میں انہوں نے انکشاف کیا کہ ''اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ کوسوفا کے بحران کو ابھی ختم نہ ہونے دیا جائے بلکہ اسی نوعیت کی خانہ جنگی قبرص میں بھی کرانے کا منصوبہ زیر غور آیا جبکہ یورپ کو نیٹو کی بنیاد پر جلد از جلد منظم کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔''

اس پر اسرار تنظیم سے متعلق Bilderberg Group Global Manipulators کے نام سے کتاب لکھنے کے لئے ایک امریکی صحافی ''رابرٹ ارکینز'' نے فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا جس کے دوران اس نے امریکی وزارت خارجہ اور سی آئی اے کے ان ارکان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جن کے متعلق اسے علم تھا کہ یہ حضرات بلڈر برج کے اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے ہیں جب اس نے بلڈر برج کے متعلق ان سے چند سوالات کئے تو حیرت انگیز طور پر انہوں نے اس خفیہ تنظیم کے وجود سے انکار کر دیا!!

ترکی سے شائع ہونے والے ایک جریدے ''الزمان'' میں مقامی سیاست دانوں کے چند بیانات شائع کئے گئے تھے کہ اس تنظیم نے ابھی تک اپنے آپ کو اتنا کیوں خفیہ رکھا ہوا ہے؟ جریدے نے اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ ''دنیا میں مختلف مقامات میں کارفرما خفیہ اور اعلانیہ دہشت گرد تنظیموں کے آخری سرے اسی بین الاقوامی خفیہ تنظیم سے جا ملتے ہیں۔اس تنظیم کا صدر مقام کہاں ہے؟ اس کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ اس کے خفیہ اجلاسوں میں، عالمی امور سے متعلق کس طرح فیصلے کئے جاتے ہیں اور کون ان فیصلوں کو نافذ کرتا ہے؟ اس کے متعلق آج تک کوئی نہیں جان سکا ہے۔مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی نئی مصلحتوں اور مفادات کے تحت یہ تنظیم اب دنیا کے پیشتر نقشے کو بدلنا چاہتی ہے لیکن اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کوئی نہیں جانتا کہ یہ دنیا والوں کے حق میں کیا جائے گا یا اس سے ان کی مصیبتوں میں اضافہ ہوگا مگر خیر کے کام تو علی الاعلان کئے جاتے ہیں پھر اس سلسلے میں اتنی رازداری کیوں؟''

ترک صحافی ''حکمت بیلا'' کا بیان ہے کہ ''بلڈر برج دنیا میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے زبردست طاقت اور قوت کے ساتھ دنیا کے حالات بدل دینے کی قوت رکھتی ہے اور ہر اس بات کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کے نفاذ میں وہ کوئی رغبت محسوس نہ کرے۔''

ترکی کے سابق سفیر ''اسماعیل برودک'' کے مطابق ''میں اس خفیہ تنظیم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان دہشت گرد تنظیموں کا منبع ہے جنہوں نے پچاس کی دہائی کے بعد تمام یورپ میں سرمایہ داری نظام کے تحفظ کی خاطر دہشت گردی کا بازار گرم کیا ہوا تھا اٹلی سے تعلق رکھنے والی خفیہ دہشت گرد تنظیم ''گلاڈیو'' کا قیام بھی بلڈر برج کا ہی کارنامہ لگتا ہے۔اس لئے میں اس خفیہ تنظیم کو دنیا کی پراسرار ترین تنظیم کہہ سکتا ہوں جس کے بارے میں بھی ٹھیک طرح سے کوئی دعوی نہیں کیا جا سکتا اس سے متعلق جو معلومات اب تک دنیا کے سامنے آئی ہیں اس کے ذرائع بھی چند افراد سے زیادہ ہے اب تک کی حاصل کردہ معلومات سے بلڈر برج اور اس کے ہونے والے خفیہ اجتماعات کا جو طریقہ کار سامنے آیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عالمی میسونی تحریک ہی کا ایک طاقتور حصہ ہے۔''

جریدہ Matrix کے مینیجنگ ایڈیٹر چارلس اور بیک Charles

Overbeck نے **1998**ء میں اسکاٹ لینڈ میں ہونے والے بلڈر برج کے اجلاس کے بارے میں لکھا تھا کہ ''اس اجلاس میں دنیا کے اہم اور حساس علاقوں کے بارے میں اہم فیصلے کئے گئے تھے اس سلسلے میں سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر جان ڈوئیچ اور امریکی ریاست نیوجرسی کے حالیہ گورنر کریسٹن ٹیڈ وائٹ مین کے ذمے جو اسائنمنٹ لگائی گئی ہے اس کے مطابق اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے زیر سایہ کس طرح دنیا میں یورپ کی سیادت قائم کی جاسکتی ہے۔'' چارلیس اوربیک اپنے مقالے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''بلڈر برج کے اجلاس میں فیصلوں کو تسلیم کرنا سب پر لازم ہے مگر اس سلسلے میں بھرپور بحث کی اجازت سب کو ہے!! اس میں شرکت کرنے والے بہت سے ارکان کی قومیت تک کا پتا نہیں چل سکتا مگر اس کے اجلاس میں منظور کردہ قراردادوں کا اطلاق دنیا کی بہت سی حکومتوں، سیاسی نظاموں، عالمی تجارت اور دنیا میں پھیلے ہوئے دولت کے ذخائر پر ہوتا ہے۔''

ذرائع کے مطابق سرد جنگ کے دوران سابق سوویت یونین کے خلاف زیر زمین اصل جنگ بلڈر برج نے لڑی مگر اس کی ابتداء اس نے مغربی یورپ میں سوشلسٹ نظریات کے سامنے بند باندھنے سے کی جس کا پہلا معرکہ اٹلی اور اس کے بعد فرانس میں لڑا گیا۔ مغربی یورپ میں سرمایہ داری نظام کے تحفظ کے لئے بلڈر برج نے انتہائی دہشت کی علامت دہشت گرد تنظیم ''گلاڈیو'' کو قائم کیا جس کے ذریعے مغربی یورپ خاص طور پر اٹلی میں دہشت گردی کی وارداتیں کرائی گئیں کیونکہ فرانس کے بعد یورپ میں جس ملک کی سوشلسٹ پارٹی سب سے زیادہ عوام میں رسوخ رکھتی تھی وہ اٹلی تھا اس لئے فرانس کے بعد اٹلی میں اس بات کے امکانات سب سے زیادہ روشن ہو چکے تھے کہ اٹلی میں سوشلسٹ پارٹی انتخابات کے ذریعے حکومت تک پہنچ سکتی ہے جو سراسر سرمایہ داری نظام کے خلاف جاتا تھا۔ اس کے سدباب کے لئے اٹلی میں بڑے پیمانے پر قتل وغارت کرائی گئی تاکہ لوگوں کو کمیونزم یا سوشلزم سے بدظن کیا جاسکے **1976**ء میں بلڈر برج کا اجلاس سوئٹزرلینڈ میں برن کے مقام پر ہوا جس کا ایجنڈا سرمایہ داری نظام کے تحفظ کے لئے زیر زمین کارروائیوں کے لئے نیٹو کو براہ راست ملوث کرنا تھا اس مقصد کے لئے سب سے پہلے ''تورینو'' کے مقام پر گلاڈیو کا خفیہ مرکز قائم کیا گیا اٹلی کا یہ علاقہ فرانسیسی سرحد سے تقریباً بتیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا شروع شروع میں گلاڈیو کے ارکان

اٹلی میں دہشت گردی کی وارداتوں کے بعد اٹلی میں ''سوسا'' کے مقام سے سرحد پار کر کے فرانس کے سرحدی علاقے ''موڈانے'' میں داخل ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد ان کی کارروائیوں کا دائرہ روم کے علاوہ ''میلانو'' تک پھیل گیا۔ آخر میں گلاڈیو کا اثر رسوخ تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا جس میں بڑے بڑے سیاستدان، فوجی افسران، صحافی اور اقتصادی شعبے کے ماہر بھی خفیہ طریقے سے شامل کئے جانے لگے۔ ان طاقتور عناصر کے ذریعے اٹلی میں خونریزی کا ایسا بازار گرم ہوا جس نے آخر کار کمیونسٹوں کا قلع قمع کردیا۔ گلاڈیو کے تخریب کاروں کی زیادہ تر تربیت اٹلی کے جزیرے ''گیگلیو'' میں نیٹو کے اڈے پر ہوتی تھی اور یہیں سے اٹلی میں تخریب کاری کے لئے خفیہ طریقے سے اسلحہ بھی سپلائی ہوتا تھا۔ ذرائع کے مطابق سوشلسٹوں کے خلاف اس دہشت گرد تنظیم کو ''ویٹی کن چرچ'' کی خاموش تائید بھی حاصل تھی۔ **1987**ء میں امریکن سی آئی اے نے اس تنظیم کے ساتھ باقاعدہ الحاق کرلیا تھا مگر بلڈر برج کی طرح اس کی اس ذیلی تنظیم گلاڈیو کے مکمل کوائف بھی کبھی سامنے نہ آسکے۔

اس وقت تیل کی صنعت سے وابستہ تمام مشینری پر امریکہ اور یورپ کے کھرب پتی صنعت کاروں کی اجارہ داری ہے جو یہ ٹیکنالوجی تیسری دنیا خصوصاً تیل پیدا کرنے والے اسلامی ممالک کو دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہالینڈ کی شیل کمپنی کے ساتھ ساتھ امریکہ کی آرامکو کمپنی کے سربراہان بھی بلڈر برج کے رکن رہے ہیں اسی طرح یونانی کھرب پتی اوناسس نے بھی دنیا پر حکومت کرنے والے اس طاقتور خفیہ ہاتھ کے ذریعے تیل کی نقل وحمل میں اجارہ داری قائم رکھی ہوئی ہے یعنی اگر اوناسس دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے تیل کے ٹینکروں کے ذریعے تیل پیدا کرنے والے ممالک کا تیل اٹھانے سے انکار کردے تو اس کی قیمت پانی کے برابر آجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پچاس کی دہائی میں ایران میں ڈاکٹر مصدق نے تیل کی صنعت کو قومیانے کا اعلان کیا جس نے مغربی مفادات پر کاری ضرب لگائی تھی تو ڈاکٹر مصدق کے خلاف ہونے والی سازشوں میں اوناسس کمپنی کے ذریعے تیل کی نقل وحمل کا بائیکاٹ کرادیا گیا تھا جس نے ایرانی اقتصادیات کی کمر توڑ دی تھی۔ آج اسی طرح کے کام بلڈر برج کے ذیلی اداروں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سے لیا جارہا ہے جبکہ سیاسی سطح پر مقاصد کے حصول کے لئے ''دولت مشترکہ'' سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

موجودہ عالمی صورتحال کے تناظر میں بلڈر برج کا سب سے اہم خفیہ اجلاس 1989ء میں لکسمبرگ میں ہوا تھا اس میں سابق امریکی صدر بش کی جانب سے ان کے وزیر خارجہ جیمس بیکر نے شرکت کی تھی۔ اس اجلاس کو سویت یونین کے تابوت میں آخری کیل بھی کہا جاتا ہے۔ اس اجلاس کے فوراً بعد سوویت یونین کی تحلیل کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس اجلاس میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد کے حالات پر قابو پانے اور دنیا پر اس کے پڑنے والے اثرات سے نمٹنے کا لائحہ عمل تیار کیا گیا تھا۔ ذرائع کے مطابق اس ایجنڈے کی اہم شقیں یہ تھیں:

1۔ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد وسطی ایشیا کی آزاد ہونے والی ریاستوں کے امور اور ان کے وسائل پر کنٹرول حاصل کرنا۔

2۔ امریکہ کے علاوہ افغان جنگ میں بڑا کردار ادا کرنے والے ممالک کو بے اثر کرنا۔

3۔ افغان جنگ کے دوران پروان چڑھنے والی اسلامی فکر کو دہشت گردی کا نام دے کر پہلے بدنام کرنا اور پھر اس کا قلع قمع کرنا۔

4۔ اقتصادی استعماریت کے دائرے کو پھیلانے کی غرض سے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے کردار کو وسعت دینا۔

5۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تیل کے ذرائع پر امریکہ کے ذریعے براہ راست کنٹرول حاصل کرنا۔

6۔ سرکش ممالک کے فوجی جنرلوں کو خریدنا اور ان کے ذریعے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنا۔

مندرجہ بالا ایجنڈے پر اگر غور کیا جائے تو واضح طور پر انکشاف ہوگا کہ 1989ء کے بعد کے عالمی حالات انہی خطوط پر چلتے نظر آتے ہیں۔ سوویت یونین جیسی بڑی طاقت صرف ایک زاویے سے نقصان اٹھا کر ختم نہیں کی جاسکتی تھی اس کے لئے متعدد اطراف سے نقب لگائی گئی تھی ایک طرف عالمی مالیاتی ادارے اقتصادی طور پر اسے کھوکھلا کر رہے تھے دوسری طرف سوویت فوج اور کے جی بی میں میسونی عناصر گھسا کر اسے اندر سے غیر مستحکم کیا جارہا تھا سوویت جنرلوں کی بڑی بڑی رقمیں مغربی یورپ کے بنکوں میں جمع کرائی گئیں KGB کے ڈائریکٹروں نے مغربی دولت سے خوب ہاتھ رنگے یہی وجہ ہے کہ جب میخائل گورباچوف نے سوویت

یونین کی تحلیل کے پروانے پر دستخط کئے تو سوویت جنرلوں اور کے جی بی کی جانب سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کی گئی بلکہ روسی فیڈریشن کا نظم ونسق سنبھالنے کے لئے نئی انتظامیہ تیار بیٹھی تھی۔ اس کے فوراً بعد امریکی وزیر خارجہ جیمس بیکر نے وسطی ایشیائی ریاستوں کے طویل اور متعدد دورے شروع کر دیئے تاکہ انہیں بدستور اسلامی تشخص سے دور رکھا جاسکے اس کے علاوہ ان علاقوں میں سابق سوویت یونین کے مہلک ہتھیار موجود تھے انہیں بھی ٹھکانے لگانے کے منصوبے زیر غور تھے۔

دوسری طرف عالمی مالیاتی اداروں کو مغربی ممالک کی سیاسی مصلحتوں سے اعلانیہ طور پر براہ راست منسلک کر دیا گیا۔ جنہوں نے صرف قرضوں کی بنیاد پر تیسری دنیا کے ممالک کو سیاسی طور پر بلیک میل کرنا شروع کر دیا یہ سلسلہ تا حال پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

دنیا پر حکومت کرنے والی خفیہ تنظیم ''بلڈر برج'' کا یہ مختصر سا جائزہ ہے جس سے کسی حد تک یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امریکہ، برطانیہ، دولت مشترکہ، عالمی مالیاتی ادارے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف، مغربی ممالک کا سب سے بڑا عسکری اتحاد نیٹو اس کے مقاصد کی تکمیل میں جتے ہوئے ہیں شاید یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے کہا تھا کہ دنیا پر ایک ان دیکھا ہاتھ Invisible Hand حکومت کر رہا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا تمام عالم اسلام میں کوئی اسلامی ملک اتنی صلاحیت کا حامل ہے جو باقی اسلامی ممالک کو ساتھ لے کر مشترکہ مفادات کی خاطر اس ٹکر کی کوئی تنظیم منظم کر سکے؟ کیا اسلامی ممالک اپنی ٹیکنالوجی اور بے بہا قدرتی وسائل اور تیل کی دولت کو صرف اپنے لئے ہی استعمال کر سکیں گے؟ بلڈر برج کے پلیٹ فارم کو عالمی صہیونیت اور چند بڑی شخصیات کے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مسلمان عالمی اسلامی اخوت کی بنیاد پر اس قسم کا طاقتور پلیٹ فارم وضع کر سکتے ہیں۔

خفیہ میسونی تنظیم P-2
اور سی آئی اے

تاریخ عالم میں اٹھنے والے بڑے فتنوں کی آماجگاہ ہمیشہ یہودی اذہان ہی رہے ہیں۔ میسونی تحریک کے بڑے بڑے مراکز یورپ اور امریکہ کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ بہت سی ذیلی تنظیمیں ہیں جنھوں نے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے یہودی مفادات کی خاطر فتنہ انگیزیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ میسونی تحریک سے وابستہ ان تنظیموں کے متعلق مختلف ادوار میں انکشاف ہوتا رہا ہے۔ میسونی تحریک سے وابستہ خطرناک ترین تنظیم P-2 کا نام سب سے پہلے 1981ء میں اٹلی کے اخبارات کی زینت بنا جب مارچ کے مہینے میں دو پولیس کے سراغرساں اہلکاروں نے میلانو میں تحقیقات کی غرض سے قدم اٹھایا۔ یہ تحقیقات اٹلی سے تعلق رکھنے والے بین الاقوامی سرمایہ دار میشل سینڈونا سے متعلق تھیں۔ جو 1979ء میں اٹلی کی جیل سے فرار ہو چکا تھا۔ ابتدائی تحقیقات سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص فرار ہو کر پہلے اٹلی کے شہر برموٴ اس کے بعد اس کے 600 کلومیٹر شمال میں قصبہ ارزو میں کپڑے کے ایک بڑے تاجر لیشو جالّی کے ہاں پناہ گزین ہے تمام تر تحقیق کے بعد جب پولیس نے 17 مارچ کو لیشو جالّی کے دفتر میں چھاپہ مارا تو وہاں سے انتہائی خطرناک خفیہ کاغذات ہاتھ لگے یہ کاغذات عالمی میسونی تحریک کی ذیلی تنظیم Lagruppa Gelli Propaganda

Due سے متعلق تھے جس کا مختصر مخفف اور کوڈ P-2 ہے۔ اس تنظیم کا گرینڈ ماسٹر لیشو جالّی یہودی تھا ان کاغذات میں سب سے زیادہ انکشاف انگیز دستاویز وہ لسٹ ہے جس نے اٹلی کے اخبارات میں بجلی گرادی۔ یہ لسٹ اس خطرناک تنظیم کے حکومتی ارکان سے متعلق تھی جس میں وزیر عدل کے ساتھ دیگر وفاقی وزراء بھی شامل تھے۔ باقیوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

43 ارکان پارلیمنٹ۔

183 فوجی افسران

43 جنرل حضرات

8 بحریہ کے بڑے افسران

19 سپریم کورٹ کے جج

3 انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہ

4 اٹلی کے بڑے شہروں کے انسپکٹر جنرل

24 قومی اخبارات کے بڑے صحافی

اس نوع کی خبروں نے نہ صرف اٹلی بلکہ تمام یورپ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جتنی تیزی سے یہ مسئلہ یورپین صحافت میں اٹھا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ اسے ''پراسرار ہاتھوں'' نے دبا دیا۔ بعد میں اس سلسلے میں تحقیق کرنے والوں کو سخت ترین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ایک فرانسیسی صحافی نے اخبار لیمونڈے میں یہاں تک لکھا کہ ''جس بات کی پشت پر امریکن سی آئی اے اور نیٹو ہوں اس کا کھوج لگانا ناممکن ہے''۔ مگر اس سلسلے میں مصری محقق انور الجندي اور راقم کے استاد عین الشمس یونیورسٹی قاہرہ میں شعبہ انگریزی ادب کے سابق سربراہ ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری نے کافی تحقیقی کام کیا۔ اس موضوع پر بعد میں کچھ کام کویت کے بین الاقوامی جریدے ''المجتمع'' کے سابق منیجنگ ایڈیٹر احمد منصور نے بھی کیا۔ دسمبر 1997ء میں جب راقم ایک تحقیقی کام کی غرض سے ہالینڈ کی مشہور زمانہ لائڈن یونیورسٹی کے شعبہ اسلامی اور عربی ادب میں مصروفِ عمل تھا تو وہاں ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات بعد میں کئی ملاقاتوں پر محیط رہی جس کے دوران ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے لائڈن یونیورسٹی سے ملحقہ ایک قدیم عمارت کی جانب

اشارہ کر کے راقم کو بتایا کہ ان کی معلومات کے مطابق یہ عمارت جو بظارہ شرق الاوسط کے علوم سے متعلق ایک مرکز ہے درحقیقت میسونی تنظیم **P-2** کا ذیلی دفتر ہے جس کا مرکز اٹلی کے شہر میلانو میں واقع ہے۔ میسونی تنظیم **P-2** سے متعلق ہے۔ آگے آنے والی زیادہ تر معلومات مندرجہ بالا تینوں شخصیات کی تحقیق پر مبنی ہیں۔

P-2 کا قیام **1966**ء میں بین الاقوامی میسونی تحریک کی ہدایت پر اٹلی میں عمل میں آیا۔ اس تنظیم کے ابتدائی اہداف میں اٹلی کی بااثر شخصیات کو اپنے حلقہ ارادت میں لینا تھا تاکہ یہودی مقاصد کی آسانی سے بارآوری ہو سکے۔ اٹلی میں اس کی سربراہی ایک مالدار تاجر یشو جالّلی کے سپرد کی گئی۔ اس ذمہ داری سے دو سال قبل یہ شخص میسونی تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل ہوا تھا اسکا ماضی بڑی حد تک اندھیرے میں چھپا ہوا ہے۔ یشو جالّلی **21** اپریل **1919**ء کو بیسٹویا شہر میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے سپین کا رخ کیا جہاں اس نے سپینی فوج کی کمپنی نمبر **735** میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس نے سپین کی خانہ جنگی میں بھی حصہ لیا۔ اس کا شمار جنرل فرانکو کے حمایتیوں میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹلی واپس آ گیا جہاں اس نے میسولینی کی حمایت شروع کر دی۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے اور میسولینی کی شکست کے بعد اس نے ارجنٹائن راہ فرار اختیار کی کیونکہ اٹلی میں اس نے دہشت گردی کی کئی وارداتوں میں شرکت کی تھی۔ ارجنٹائن میں پناہ کے دوران اس کی ملاقات بیرون نامی مالدار یہودی سے ہوئی جس نے یشو کو اٹلی اور ارجنٹائن کے درمیان تجارت کی غرض سے تعاون کا یقین دلایا یوں قلیل مدت میں ہی یشو جالّلی کروڑپتی بن گیا۔ چند سالوں بعد اس نے اپنے آبائی وطن اٹلی واپس آنے کا اردہ کیا جہاں اس نے کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی سے وابستگی اختیار کر لی۔ بعد میں اس نے خاموشی کے ساتھ میسونی تحریک کی باقاعدہ رکنیت حاصل کر لی جو بعد میں **P-2** کے قیام کا سبب بنی۔

یہ شخص اٹلی کی طاقتور اور مشہور شخصیات کو **P-2** کی چھت تلے لانے میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ نئے میسونی ارکان سے سخت قسم کا عہد لیا جاتا تھا۔ ان کی تمام کمزوریاں گرینڈ ماسٹر یشو جالّلی کے ہاتھ میں ہوتی تھیں، جن کی بنیاد پر اس نے اٹلی حکومت سے متعلق انتہائی حساس رازوں تک رسائی حاصل رکھی تھی۔ اپنی شاطرانہ چالوں اور بااثر شخصیات کے ذریعے

اس تنظیم نے اٹلی میں ریاست کے اندر ریاست کا تصور قائم کر دیا تھا۔ اٹلی کا مشہور جنرل **G. Allavena** جو ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ بھی تھا۔ اس تنظیم کے باقاعدہ رکن کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیتا رہا۔ اس نے حکومت اور سیاسی معاملات سے متعلق حساس تربیتی دستاویزات اپنے آقا گرینڈ ماسٹر یشو جالّلی کے سپرد کر رکھی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص نہ صرف حکومت پر بلکہ عیسائیت کے سب سے بڑے مرکز ویٹی کن سٹی میں بھی بھرپور اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس نے کارڈینال سطح کے عیسائی علماء جو میسونی تحریک کے باقاعدہ رکن تھے ویٹی کن انتظامیہ میں داخل کر دیئے تھے۔ حالانکہ ویٹی کن میں اعلیٰ سطح پر میسونی سرگرمیوں کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور کئی مرتبہ اس بات کا اعلان بھی کیا گیا کہ ویٹی کن کے کسی بھی رکن پر میسونیت ثابت ہونے پر اسے کیتھولک مسلک سے خارج کیا جا سکتا ہے مگر دوسری طرف کیتھولک مسلک کی خفیہ جماعت **DEIOUS** جسے پوپ یوحنا پولس ثانی کی حمایت حاصل تھی میسونیت سے روابط استوار کئے ہوئے تھی۔ **1976**ء میں وزارتِ داخلہ کے چند افسران نے حکومت کو یہ رپورٹ پیش کی کہ "یہ میسونی شخص یشو جالّلی ملک میں اپنی مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے طاقت پکڑتا جا رہا ہے جو داخلی امن کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں"۔ **1981**ء میں **P-2** کو **17** انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر حصے کا سربراہ الگ ہوتا تھا اور ان سب کا گرینڈ ماسٹر یشو جالّلی تھا، مزے کی بات یہ ہے کہ ہر حصے کے سربراہ کو دوسرے کے متعلق لاعلم رکھا جاتا تھا۔ بعد میں اس تنظیم نے ملک میں دھماکوں اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس سلسلے میں **P-2** دوسری دہشت گرد تنظیموں کی اعانت بھی کرتی تھی۔ ان تخریبی کاروائیوں نے اتنا زور پکڑا کہ وزیراعظم "فورلانی" کو حکومت سے معزول ہونا پڑا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ **P-2** نے ایک خفیہ عسکری تنظیم گلاڈیو **(Gladio)** کو اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔

عسکری تنظیم گلاڈیو کو اٹلی میں نیٹو کے ایماء پر قائم کیا گیا تھا جس کی لگامیں براہ راست امریکن سی آئی اے کے ہاتھ میں تھیں۔ اس تنظیم کا بڑا ہدف اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کو حکومت میں آنے سے روکنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس تنظیم کو قتل و غارت، بم دھماکوں اور دوسری تخریبی کاروائیوں کی کھلی چھٹی تھی۔ امریکن سی آئی اے کے سابق ایجنٹ برنکے **(Brenneke)** نے اعتراف کیا ہے کہ میسونی تنظیم **P-2** سی آئی اے سے بھاری

فنڈ حاصل کرتی تھی۔ بسا اوقات یہ تنظیم سی آئی اے سے ایک ایک مہینے میں دس ملین ڈالر تک وصول کرتی رہی ہے۔ اطالوی محقق کاسون Casson نے میسونیوں اور سی آئی اے کے درمیان تعلق پر قلم اٹھایا تھا مگر سی آئی اے کی کوششوں کی وجہ سے یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ نیٹو نے صرف اٹلی میں ہی ایسی خفیہ تنظیم قائم نہیں کی بلکہ ہر ملک میں قائم تنظیم کا نام دوسرے سے مختلف ہوتا تھا۔ اٹلی میں یہ گلاڈیو (Gladio) کے نام سے کام کرتی تھی جس کا مطلب ''کاٹ دینے والا خنجر'' ہے۔ مختلف ممالک میں اس کا نام مندرجہ ذیل ہیں۔

بیلجیم	Sdra-8
فرانس	Rose air
یونان	Sheepskin
ترکی	Kontgerilla
جرمنی	Silant trap
ہالینڈ	Nato Command
برطانیہ	Secret British Network
آسٹریلیا	Schwert
سپین	STAY Behind

ان تمام ذیلی تنظیموں کا مرکزی ہیڈ کوارٹر برسلز میں واقع ہے۔ یاد رہے یہیں نیٹو کا ہیڈ کوارٹر برونکس میں واقع ہے۔ نیٹو کے سالانہ اجتماعات کے موقع پر ہی اس تنظیم کے ذیلی سربراہوں کا اجلاس ہوتا ہے تاکہ نیٹو میں ہونے والے فیصلے اس تنظیم کی معلومات میں رہیں اور آئندہ منصوبہ بندی کے سلسلے میں باہمی تعاون کے امکانات پر بھی غور ہو سکے۔ راقم اپنی تعلیم کے دوران ہالینڈ کے جس علاقے لیمبرگ میں مقیم تھا وہ جرمن بارڈر سے متصل علاقہ ہے۔ صرف ساڑھے تین کلومیٹر فاصلے پر نیٹو کا زبردست فضائی اڈا موجود ہے اس اڈے کے فوجی افسران کی تفریح طبع کے لئے جتنے بھی پب اور نائٹ کلب وہاں موجود ہیں تمام اس خفیہ تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد کی ملکیت ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ میں اس قسم کی خفیہ تنظیموں کو اتنا فعال کرنے کے کیا

مقاصد ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اٹلی کو مثال کے طور پر ہم لے سکتے ہیں۔ اگر یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس خفیہ تنظیم کے مقاصد کی بحث میں پڑ گئے تو اس کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہوگی۔ یہاں اٹلی کو مثال بنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اٹلی میں ان خفیہ میسونی تنظیموں نے زیادہ طاقت اور خونریزی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی یورپ کے دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں سے زیادہ مضبوط تھی' اور اس کے حکومت میں پہنچ جانے کے زیادہ امکانات تھے۔ انہی امکانات نے امریکہ اور نیٹو کے دوسرے یورپی ممبر ممالک کی نیندیں حرام کردی تھیں۔ اس لئے وہ اس پارٹی کا راستہ روکنے کے لئے ہر قسم کی خونی دیوار کھڑی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اٹلی جغرافیائی طور پر نیٹو کے نقطہ نظر سے انتہائی حساس علاقے میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف بحیرۂ روم اور دوسری طرف بلقان کا حساس علاقہ ہے۔ اس لئے اس پر برسراقتدار آنے والی حکومت جبل طارق اور نہر سویز پر اثر انداز ہو سکتی ہے' یعنی اگر یہاں کمیونسٹ پارٹی اقتدار میں آجاتی تو اس علاقے میں پھیلے ہوئے امریکہ اور یورپ کے تمام مفادات سابق سوویت یونین کی براہ راست زد میں آجاتے۔ 10 فروری 1948ء کو امریکہ کی کمیٹی برائے امن نے امریکی حکومت کو سفارش کی تھی ''امریکہ کا فرض بنتا ہے کہ وہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے امریکی سیاسی' اقتصادی اور عسکری مفادات کا ڈٹ کر تحفظ کرے۔ اس سلسلے میں یورپ میں سب سے زیادہ اٹلی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جہاں سوویت اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں''۔ (Foreign relation of United States - 1948 P-765-769) ان مفادات کے تحت ہی امریکہ نے اٹلی کے جزیرہ صقلیہ اور سرڈینیا میں اٹلی کی خانہ جنگی کے دوران اپنی فوجیں اتار دیں تھیں جو تا حال وہیں پر مضبوط عسکری مراکز قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان فوجی اڈوں پر سرد جنگ کے دوران زبردست قسم کی فوجی سرگرمیاں رہی ہیں۔ ان ہی امریکی تخریبانہ کارروائیوں کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی حکومت میں آنے سے ناکام رہی۔ ایس نیوز اور ہفتہ وار ورلڈ رپورٹ کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ نے اٹلی کی نیشنل کرسچن پارٹی کو لگاتار بھاری فنڈز مہیا کئے۔ اس کے علاوہ اس نے اٹلی میں کمیونسٹوں اور سوشلسٹ کے درمیان بعد پیدا کرنے کے لئے خفیہ میسونی تحریک میں شامل سرمایہ داروں کو استعمال کرنا شروع کیا۔ کیونکہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اٹلی [illegible]

کارکن شامل ہو چکے تھے جبکہ لاکھوں کی تعداد میں عوامی تائید اسے حاصل تھی' اسی لئے امریکہ نے نیٹو کا پلیٹ فارم استعمال کرتے ہوئے خطرناک میسونی تنظیم P-2 کا سہارا لیا۔ دوسری طرف خارجی سطح سے وائس آف امریکہ اٹلی کی نشریات میں آزاد معاشرے کی خوبیاں بیان کر رہا تھا اور ایک طرف سوویت نظام کے تحت چلنے والی حکومتوں کی خوفناک شکل سے انہیں ڈرا بھی رہا تھا۔ ان تمام کاروائیوں میں مسیحی دنیا کا مرکز ویٹی کن بھی خاموش نہیں تھا۔ وہ بھی کمیونسٹوں کی مخالفت کی آڑ میں مقاصد پورے کر رہا تھا۔ اٹلی کی فوجی خفیہ ایجنسی (Sifar) کا قیام یکم ستمبر 1949ء کو عمل میں آیا اس کے روحِ رواں اٹلی کے وزیر دفاع برونزو تھے جو بعد میں نیٹو کے جنرل سیکرٹری بھی مقرر ہوئے وہ امریکی ہدایات پر عمل پیرا تھے۔ نیٹو کے اہلکار Carmel Offie کے تحت کام کرتے تھے وہ سی آئی اے کا نمائندہ تھا۔ 1953 میں نیٹو نے پہلی مرتبہ اٹلی کی خفیہ ایجنسی سے اٹلی اور فرانس میں کمیونسٹ عناصر کا قلع قمع کرنے کی خدمات طلب کیں۔ اس آپریشن کا نام (Demanyetize) رکھا گیا۔ اٹلی کی عسکری خفیہ ایجنسی نے میسونیت کی رہنمائی میں فرانس اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹیوں کے خلاف سب سے پہلا قدم ان کے مالی وسائل کی ترسیل پر ضرب لگا کر اٹھایا جس وقت جنرل ڈیگال نے فرانس کی قیادت سنبھالی اور ملک کو نیٹو معاہدے سے الگ کیا تو امریکہ اور فرانس کے درمیان متعدد خفیہ مگر خطرناک معاہدے منظر عام پر آئے جسے بعد میں فرانسیسی صحافت میں بہت اچھالا گیا۔

26 نومبر 1959ء کو نیٹو اور اٹلی کی خفیہ ایجنسی کی کوششوں سے مؤخرالذکر میسونیت سے وابستہ خفیہ تخریبی تنظیم گلاڈیو (Gladio) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جنرل ڈی لورنزو (DeLorenzo) کا کردار اس میں نمایاں رہا۔ یہ جنرل بعد میں روم میں متعین خاتون امریکی سفیر کی سفارش پر انٹیلی جنس ایجنسی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اٹلی کے محقق Casso Devenise کے مطابق ایک خفیہ دستاویز' جو جنرل ڈی لورنزو کے دستخط کے ساتھ محقق کے ہاتھ آئی میں گلاڈیو کے مقاصد مرقوم ہیں کہ ''نیٹو کے ممبران ممالک میں ہونے والی ہر خونریز واردات کے پیچھے اس تنظیم کا ہاتھ ہوتا ہے''۔ حقیقت میں یہ خفیہ تنظیم 45 برس تک پردۂ اخفا میں رہی ہے۔ اٹلی کی حکومت بھی بڑی حد تک ثبوت ہونے کے باوجود اس کا کھل کر اعلان نہ کر سکی۔ 3 اگست 1990ء کو پہلی مرتبہ سرکاری طور پر اس تنظیم کا نام منظر عام پر آیا جب اٹلی

پارلیمنٹ کی جانب سے مقرر کردہ جرائم کی تحقیقی کمیٹی کے سامنے سابق وزیراعظم جولیو اندریوتی نے اس خفیہ تنظیم کے وجود کا اعتراف کیا۔ اندریوتی نے کمیٹی کے سامنے اعتراف کیا کہ یہ تخریبی تنظیم نیٹو کی سفارش پر وجود میں لائی گئی تھی تاکہ کمیونسٹ عناصر کا قلع قمع کیا جاسکے مگر پارلیمنٹ کی تحقیقی کمیٹی نے اندریوتی سے مزید ثبوت طلب کر لئے۔ 17 اکتوبر 1990ء کو اندریوتی نے 22 صفحات پر مشتمل ایک دستاویز تحقیقاتی کمیٹی کو پیش کی۔ اٹلی کے مشہور جریدے ''پینوراما'' نے 11 نومبر 1990ء کو پہلی مرتبہ عوام کے سامنے اس خفیہ دستاویز کو کھول دیا۔ عوام کو اس رپورٹ پر زبردست صدمہ ہوا کہ ایک شخص جس نے اپنی زندگی کے پچاس سال سیاست کے میدان میں گزار دیئے 33 مرتبہ وزیر اور سات مرتبہ وزیراعظم بنا اس قسم کے خطرناک سیاسی پس منظر سے تعلق رکھتا تھا۔ جس نے ملک کو جرائم اور دہشت گردی کی وارداتوں میں غرق کر دیا۔ مگر اس کے باوجود آج بھی یہ تنظیم پوری طرح حکومتی اہلکاروں پر چھائی ہوئی ہے۔ 27 اکتوبر 1990ء کو جب اٹلی کے وزیراعظم فرانسسکو کوسیجا نے سکاٹ لینڈ کا دورہ کیا تو ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ''میں اس تنظیم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں وزارت دفاع میں مشیر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس کے انتظامی کاموں میں خاصی معاونت بھی کی اور مجھے فخر ہے کہ اس خفیہ تنظیم نے 45 برس تک اپنا راز افشا نہ ہونے دیا''۔

اس میسونی تنظیم کا مرکزی دفتر برسلز جبکہ تربیتی مراکز جزیرہ سرڈینیا میں نیٹو کے فضائی مستقر کے قریب واقع ہے جہاں نیٹو کے فوجی ماہرین اس تنظیم کے ارکان کو جدید اسلحہ کا استعمال اور تخریبی کاروائیوں کے طریقے سکھاتے تھے۔ بعد میں نیٹو کا یہ مرکز اسلحے کی سپلائی کا بڑا اڈا بن گیا۔ اٹلی میں اس تنظیم نے نیٹو کی مدد سے اسلحے کے متعدد خفیہ سٹور بھی بنا رکھے تھے۔ سو کے قریب سٹور فلینیسا شہر میں تھے جبکہ 39 سٹور مختلف علاقوں میں تھے۔ یہ سٹور زیادہ تر زیر زمین ہوتے تھے یا قبرستانوں اور گرجوں کے نزدیک بنائے جاتے تھے۔ 28 فروری 1986ء کو سویڈن کے وزیراعظم اولف پالمے کے قتل کے پیچھے بھی گلاڈیو کا ہی ہاتھ تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ اولف کا زیادہ رجحان ماسکو کی طرف تھا اس لئے امریکہ کو بحیرہ بالٹک میں سوویت جنگی جہاز پھرتے نظر آنے لگے۔

گلاڈیو کی سرگرمیاں Kontgrilla کے نام سے ترکی میں زیادہ سرگرم عمل ہیں

سابق سوویت یونین نے بحیرۂ فاسفورس کی اسٹریٹیجک اہمیت کو مدنظر رکھے ہوئے یہاں کے جی بی کا ایک منظم نیٹ ورک قائم کر رکھا تھا جبکہ سیکولر ترک کی خفیہ ایجنسی میں میسونی تنظیم کے بہت سے نمائندے داخل کر دیئے گئے تھے تاکہ سوویت کارروائیوں سے زیادہ سے زیادہ باخبر رہا جائے۔ ترکی سوویت یونین کی گرم پانیوں کی خواہش سے خوفزدہ تھا اس لئے اس کی ایجنسیاں گلاڈیو سے خفیہ تعاون پر مجبور تھیں۔ بعد میں اس تنظیم نے ترکی کی باا ثر کمیونسٹ یا کمیونزم نواز شخصیات کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان میں بڑی تعداد صحافیوں کی تھی۔ مثلاً ترکی کے مشہور اخبار مللیت کے چیف ایڈیٹر عبدال ایکب جی کو سوویت یونین کی جانب جھکاؤ رکھنے پر قتل کیا گیا۔ گلاڈیو نے سرمایہ پیدا کرنے کے لئے ترکی کے اعلیٰ حکام جن میں زیادہ تر تعداد فوجی جنرلوں کی ہے کے ساتھ مل کر منشیات اور ناجائز اسلحے کی تجارت کا بازار بھی گرم کیا مگر اس کا وجود یہاں بھی پردۂ اخفا میں ہی رہا۔

3 نومبر **1996**ء کو ایک عجیب وغریب حادثہ پیش آیا اس حادثے میں ایک مرسڈیز کار جس میں ممبر پارلیمنٹ چند دوسرے افراد کے ساتھ آ رہے تھے بڑے ٹرالے کی زد میں آ کر تباہ ہوگئی۔ اس حادثے میں دو افراد اور ایک خاتون ہلاک ہوئے جبکہ ایک چوتھا شخص معمولی زخمی ہوا۔ ہلاک ہونے والا شخص عبداللہ چاتلی انٹرپول کو مطلوب تھا جبکہ اس کے ساتھ دوسرا ہلاک ہونے والا شخص ترکی کا اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس تھا جبکہ خاتون عبداللہ چاتلی کی دوست تھی۔ معمولی زخمی ہونے والا واحد شخص رکن پارلیمنٹ تھا' ایک جگہ رکن پارلیمنٹ اور پولیس کے بڑے افسر کا مجرم شخص کے ساتھ سفر کرنا کئی قسم کے سوالات اٹھا گیا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ عبداللہ چاتلی گلاڈیو کا رکن تھا جس کے ترکی میں بہت سے دہشت گردوں اور سمگلروں سے روابط تھے۔ کار کا یہ حادثہ نجم الدین اربکان کے دور حکومت مں پیش آیا تھا مگر سرتوڑ کوشش کے باوجود اس سازش کا سرانہیں مل سکا۔ اس وقت کے اپوزیشن لیڈر اور بعد کے وزیراعظم مسعود یلماز نے اعلان کیا تھا کہ اگر میں حکومت میں ہوتا تو بیس روز میں حقیقت کھل کر سامنے آ چکی ہوتی۔ وزیراعظم بننے کے بعد صحافیوں کے زور دینے پر انہوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی بٹھائی مگر ایک سال کی مدت گزرنے کے باوجود یہ کمیٹی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

اصل سوال یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے دنیا پر کون حکومت کر رہا ہے؟ یہ ایک

طویل موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میسونی تحریک اور اس کی خطرناک خفیہ ذیلی تنظیم **P-2** گلاڈیو جیسی دہشت گرد تنظیموں کے ساتھ مل کر دنیا کے ایک بڑے حصے پر تباہی مسلط کئے ہوئے ہیں اور ہر ملک کی حکومتی مشینری کے کارندے ان کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں میسونیت عالمی صیہونیت کا ایک بڑا شعبہ ہے اسی لئے اٹلی کی میسونی تنظیم **P-2** کے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ اٹلی کا ارب پتی یہودی تاجر کارلوڈی بنٹ **P-2** کا اہم ممبر ہے۔ اس کا ذکر موساد کے سابق ایجنٹ وکٹر اسٹروسکی نے اپنی یادداشتوں **The other side of deception.** میں کیا جو **1994**ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ تعلق ایک مثلث کی مانند ہے یعنی موساد **P-2** اور گلاڈیو........ یہ خطرناک مثلث تمام دنیا میں اسلحے کی تجارت باہم تعاون سے کرتی ہے۔ **P-2** کا اعلیٰ اختیاراتی بورڈ بلڈر برج کے نام سے امریکہ میں موجود ہے جو آگے چل کر مونٹ کارلو کی میسونی شاخ سے منسلک ہو جاتا ہے۔ بلڈر برج کے بورڈ کے ارکان میں سابق یہودی مریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر' یہودی ارب پتی ایڈمونڈ روتھ شیلڈ اور ڈیوڈ راک فیلر شامل ہیں۔

عالمی میسونیت اور ترکی

7 جولائی 2000ء کی شام ایمسٹرڈیم کے بین الاقوامی شیخپول ائیر پورٹ سے چار کیلومیٹر شمال کی جانب ایک پرشکوہ عمارت میں بیلجیم اور ہالینڈ سے تعلق رکھنے والی میسونی جماعت کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں نیویارک ہیڈ آفس بلڈر برج اور لندن کے رابطہ آفس کی ہدایات کی روشنی میں دنیا کی اس قدیم ترین اور خطرناک تحریک کو تاریخ میں پہلی مرتبہ زیر زمین سے سطح زمین پر لانے کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جا رہا تھا۔ اس اجلاس میں ملک اور تاریخ کا تعین ہونا تھا اجلاس کے شرکاء میں یورپی ممالک کے سابق پارلیمانی ارکان، بڑے کاروباری افراد اور فوج کے بڑے عہدیدار شریک تھے۔ یہ اجلاس رات کے دس بجے تک جاری رہا جس کے آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ مطلوبہ اجلاس ترکی کے شہر استنبول میں 28 جولائی کو منعقد کیا جائے۔ تاریخ اور جگہ پر اتفاق رائے کے بعد میسونیت کی بلقان کے علاقے میں نئی منصوبہ بندی، اور علاقے میں پرانے عہدیداروں کے غلط فیصلوں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی سربیا کے صدر سولوبودان میلوسوفیتش پر تنقید عروج پر تھی۔ مگر امریکہ کے سابق وزیر خارجہ اور بلڈر برج بورڈ آف ڈائریکٹرز کے اہم رکن ہنری کسنجر سے خصوصی قربت کی وجہ سے ان کی متعدد سنگین غلطیوں سے صرف نظر بھی کیا گیا۔

یورپی یونین کے قیام کے بعد سے یہاں کی میسونی تحریک میں چند انتظامی تبدیلیاں بھی

وقوع پذیر ہوئی ہیں پہلے یورپ کے ہر ملک میں میسونی لاج کے طرز پر ان کے الگ الگ مراکز تھے۔ جن کا ہیڈ آفس لندن اور پیرس ہوا کرتا تھا مگر اب اسے برسلز منتقل کیا جا رہا تھا۔ جہاں اس کے بہت سے نئے شعبے نئے ناموں کے ساتھ دنیا میں خصوصا اسلامی ممالک کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں کا کھیل کھیلا کریں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میسونیت کے کھلے اجلاس کے لئے صرف ترکی کا ہی انتخاب کیوں کیا گیا؟ کیا آج بھی میسونی سرگرمیوں کے لئے ترکی کی سرزمین سازگار حالات کی حامل ہے؟ اپنی سرگرمیوں کو صرف ترکی میں کھلے عام متعارف کرانے کے لئے کیوں منتخب کیا گیا؟

میسونی تحریک کی تاریخ سیاہ اوراق سے بھری پڑی ہے جس کے کریڈٹ پر عالمی سطح پر کئی اعلانیہ اور غیر اعلانیہ سازشیں شامل ہیں۔ میسونیت کا تمام اوڑھنا بچھونا یہودیت سے اخذ کردہ ہے جس کے بارے میں مشرق و مغرب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر 28 جولائی کو ترکی میں ہونے والی ''اوپن'' کانفرنس نے صورتحال کو یکسر تبدیل کر دیا۔ میسونیت اور ترکی کا پرانا تعلق رہا ہے دنیا میں دو بڑے انقلابوں کے پیچھے اس تحریک کا ہاتھ تھا ایک انقلاب فرانس اور دوسرا جمعیت اتحاد و ترقی کا انقلاب جو ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خلاف برپا کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف اس تنظیم کے تحت خفیہ تحریک چلائی گئی تھی جس کے نتیجے میں اسلامی خلافت کی قباء چاک کی گئی تھی۔

موجودہ صورتحال میں سب سے پہلے ترکی کی میسونی تحریک اور اس کے بعد اردن میں اس تحریک نے کھلے عام اجلاس کا اعلان کیا اور یہ سلسلہ کہاں تک چلے گا وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میسونی تحریک چونکہ یہودیوں کی خفیہ عالمی تنظیم ہے جس میں دنیا کے تمام ممالک کی علاقائی طور پر با اثر شخصیات شامل کی جاتی ہیں۔ ترکی چونکہ اسرائیل کے ساتھ دفاعی اور دوسرے معاہدوں میں منسلک ہے اس لئے ترکی میں میسونی تحریک کے پہلے کھلے اجلاس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ موجودہ صورتحال کو سمجھنے کے لئے ترکی میں میسونی تحریک کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔

ترکی میں میسونی تحریک کی بنیاد ''عثمانوی عالی مجلس شوریٰ'' کے نام سے 1861ء میں ہی مگر یہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی حکومتی ردعمل کے بعد اپنے قیام کے تھوڑے عرصے بعد ہی

اسے بند کرنا پڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے بڑے بھائی سلطان مراد خامس پہلے سلطان تھے جو اس تحریک سے متاثر ہوئے مگران کی حکومت تین ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی تھی جنون کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انہیں تخت سے الگ کر دیا گیا تھا۔ سلطان مراد ثانی اپنے زمانہ ولی عہدی میں ہی اسکاٹ لینڈ کے میسونی لاج سے وابستہ تھے مورخین کے مطابق اس کا سب سے بڑا سبب سلطان مراد ثانی کا قریبی دوست اور برطانوی ولی عہد شہزادہ ایڈورڈ تھا جو بعد میں برطانیہ کا بادشاہ بنا مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سلطان مراد خامس ایڈورڈ سے تعارف ہونے سے پہلے ہی میسونیت میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے میسونیت کو سلطنت عثمانیہ کی حدود میں اپنی ''محافل'' قائم کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ جس نے بعد میں سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف فلسطین میں اسرائیلی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لئے مضبوط محاذ آرائی کی شروع کی۔ اس وقت میسونیت ''جمعیت اتحاد وترقی'' کی شکل میں سامنے آئی تھی جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عثمانی خلافت کے سامنے مضبوط اپوزیشن کے طور پر سامنے آرہی تھی۔ جسے مغربی ممالک کی بھرپور تائید حاصل تھی۔ اس نے ترکی کے طول وعرض میں مواصلات کا مربوط نظام وضع کر رکھا تھا ایسا ہی سلسلہ موجودہ ترکی میں کیا جارہا ہے ترکی کے میسونی لاج نے انٹرنیٹ پر باقاعدہ ویب سائٹ حاصل کی ہوئی ہے جس کا ایڈریس **http:/www.mason-mahfili.org.tr./99-10turkiye.html** ہے۔ آجکل انٹرنیٹ کی اس ویب سائٹ کے ذریعے ترکی میسونی لاج اپنے افکار کی ترویج اور سازشوں کے نئے جال بننے میں مصروف ہے۔

جمعیت اتحاد وترقی اور مغرب کی میسونی تحریک کے درمیان روابط کا کام استنبول میں سلطنت عثمانیہ کی بیوروکریسی میں شامل میسونیت سے تعلق رکھنے والے افراد کیا کرتے تھے۔ انہی روابط کی بنیاد پر مقروض ترکی کے سلطان کو یورپ کی جانب سے میسونیوں کے ساتھ مشروط معاملات طے کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ امریکی مورخ ڈاکٹر ارنسٹ رامزور اپنی کتاب **''Young Turky & Revolution of 1908''** کے صفحہ 126 پر رقمطراز ہے کہ مشرقی یورپ میں سلانیک کا علاقہ سب سے پہلے جمعیت اتحاد وترقی کی سرگرمیوں کا مرکز ناتھا۔ ڈاکٹر ارنسٹ لکھتا ہے کہ ''زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ سلانیک میں اتحاد وترقی کے بارے

میں انکشاف ہوا کہ یہ میسونی تحریک کی ایک ذیلی شاخ ہے جس نے سلانیک کی تمام انتظامیہ کو اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا تھا یہیں سے ترکی کی جمعیت اتحاد وترقی کو سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف ہدایات جاری ہوتی تھیں۔ فرانس میں میسونی لاج ''عظیم مشرق'' کے نام سے کام کرتا تھا تقریباً 1900ء میں اس نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت ترکی کی جمعیت اتحاد وترقی کو انقلاب فرانس کے نمونے پر ترکی میں انقلاب کے لئے راہ ہموار کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں تاکہ سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف موثر اقدامات کئے جاسکیں۔ اس لئے میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ جمعیت اتحاد وترقی سراسر یہودی سازش کا شاخسانہ ہے۔''

سٹیفن واٹسن اپنی کتاب **''The Rise of Nationality in Balkans''** میں لکھتا ہے کہ ''ترکی میں اتحاد وترقی کے ارکان زیادہ تر مغرب سے تعلق رکھتے تھے ترکی کی معاشرتی زندگی سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا یہ لوگ انقلاب فرانس کی فکر سے متاثر تھے اور ان میں صرف ایک وجہ مشترک تھی اور وہ تھی ''سلانیک'' اتحاد وترقی کسی حقیقی انقلاب کی غرض سے معرض وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کے قیام کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی بیخ کنی کرنا تھی اس لئے اس جماعت سے تعلق رکھنے تمام لوگ سازشی تھے جنہیں میسونیوں کی تائید حاصل تھی اس خفیہ تنظیم نے سلطان عبدالحمید ثانی کی حکومت کا تختہ الٹ کر ترکی میں نیا نظام متعارف کرایا تھا۔''

ترکی میں جمعیت اتحاد وترقی کا دور یہودیوں کے لئے سنہرا دور کہلاتا ہے خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی ترکی کے طول وعرض میں میسونی لاج کھل گئے تمام دنیا سے یہودیوں کی مقبوضہ فلسطین کی جانب ہجرت کا کام آسان ہوگیا۔ دمشق سے تعلق رکھنے والا مشہور مصنف فخر الہارودی اپنی یادداشتوں میں رقمطراز ہے کہ ''جمعیت اتحاد وترقی نے اقتدار میں آتے ہی ان مقامات پر میسونی لاج کھولے جہاں اس سے پہلے عثمانوی دستور کے مطابق ان کی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کئے جاچکے تھے ترکی کے ساتھ ساتھ دمشق میں بھی ''نور دمشق'' کے نام سے میسونی لاج قائم کیا گیا جو اسکندریہ کے میسونی لاج سے منسلک تھا۔ ترکی کی جمعیت اتحاد وترقی کی اہمیت اس کے ارکان کی آرا کی روشنی میں دیکھی جاسکتی ہے کیونکہ اس وقت اس کے تمام ارکان کھلے عام میسونیت سے وابستگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

جمعیت میں ارکان کی نوعیت دو طرح کی ہے ایک قسم کو برادر اور دوسری قسم کو فادر کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ترکی میں ایک کتاب ''ترکی اور دنیا میں میسونیت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے جس میں بڑی حد تک ترکی اور دنیا کے دوسرے خطوں میں میسونی سرگرمیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے اس کتاب کے مطابق ''بلقان میں میسونیت کی سرگرمیوں کا بڑا مرکز سلانیک کا علاقہ رہا ہے سلطان عبدالحمید نے اس علاقے میں میسونیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی تھی وہ اسے اس علاقے میں ہی محدود کرکے اس کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے مگر یہ تحریک کسی خطرناک بیماری کی طرح پھیلتی ہی رہی یہاں اس نے اپنے دو لاج ''ریزورتا'' اور ''فاریتاس'' کے نام سے قائم کئے جنہوں نے بعد میں ترکی کی جمعیت اتحاد وترقی کی تاسیس میں کلیدی کردار ادا کیا اس نے 1908ء میں آزادی کا اعلان کر دیا۔''

1909ء میں سلطان عبدالحمید کے معزول ہوجانے کے بعد جمعیت اتحاد وترقی حکومت میں پہنچ چکی تھی اسی دور میں ترکی میں میسونی لاج کی تاریخ کی ابتداء ہوتی ہے۔ ترکی میں باقاعدہ قیام کے بعد اس لاج کا نام ''مشرق کا عظیم عثمانوی لاج'' رکھا جدید ترکی حکومت کی تین طاقت ور شخصیات طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا اس کے اہم رکن تھے۔ 29 مئی 1910ء یعنی سلطان عبدالحمید کی معزولی کے چند ماہ بعد برطانیہ نے سر جیرالڈ لاویز کو استنبول میں اپنا سفیر مقرر کیا جس نے حکومت برطانیہ کو ایک طویل خفیہ رپورٹ میں اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ نئی حکومت میں میسونی خاصہ اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔

ترک مورخ نظام الدین نظیف نے اپنی مشہور کتاب ''سلطان عبدالحمید اور اعلان آزادی'' میں بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، کہ کس طرح جمعیت اتحاد وترقی کو حکومت تک پہنچانے میں میسونی لاج نے کردار ادا کیا۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ ''میسونیوں نے عالمی صحافت پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد سلطان عبدالحمید کے خلاف بڑا محاذ کھول دیا تمام یورپ میں مختلف مراکز اس کام میں جت گئے اس کے بڑے بڑے مراکز لندن، پیرس، ویانا، برلن، قاہرہ، ممبئی، دہلی اور دمشق میں قائم ہو چکے تھے جہاں پر خلافت کو ایک متروک اور استعماری نظام کے طور پر متعارف کرایا جاتا تھا استنبول میں ایک تنظیم ''کاسموپولیٹیا'' کے نام سے معرض وجود میں آچکی تھی جس کا کام عثمانیوی دور کے بچے کھچے سرکاری عہدیدار اور شخصیات کو

میسونی لاج میں ضم کرنا تھا۔ استنبول میں ہونے کی وجہ سے یہ تنظیم مرکز خلافت سے قریب تصور کی جاتی تھی اس کی سرگرمیوں کو مقدونیا کا میسونی لاج Macedonia Risorta اور اٹلی کا لاج Labos Lux عملی طور پر مانیٹر کرتا تھا جبکہ اس کے لئے فیصلہ کن ہدایات سلانیک کے میسونی لاج ریزورتا سے آتی تھیں۔

عثانوی میسونی لاج اتحادیوں کے دور حکومت میں 1909ء میں ''عالی عثانوی شوریٰ'' کے نام سے قائم کیا گیا تھوڑے عرصے کے بعد مختلف ناموں سے کام کرنے والی سات میسونی لاجوں کو ایک لاج میں ''عظیم عثانوی مشرقی لاج'' کے نام سے ضم کرنے کے بعد International masonic lage سے منسلک کر دیا گیا۔ میسونیوں کے مطابق اس کام کے مکمل ہونے کے فوراً بعد عالمی سطح پر میسونیت کی سرگرمیاں تیز کر دی گئیں جس میں سب سے پہلے بلقان کی جنگ کی ابتداء اس کے بعد پہلی عالمگیر جنگ اور آخر میں ''آزادی'' کی جنگ۔

ترک جمہوریہ کا اعلان ہوتے ہی ترکی میں میسونی لاج کے نام تبدیل کر دیئے گئے تھے ''Great Othoman East'' کی جگہ ''Grand Turkish East'' رکھ دیا گیا ''Othoman Great Assembly'' کی جگہ Great Turkish Assembly'' رکھ دیا گیا۔

Grand International Masonic Alliance کا ترکی میں باقاعدہ قیام 1921ء میں ہوا اور استنبول میں پہلا اجلاس 1932ء میں کیا گیا یہ ترکی میں ایک طرح سے پہلا کھلا اجلاس تھا جس پر ترک اخبارات میں بڑی لے دے ہوئی اور میسونیوں اور ان لاجوں کے خلاف مقالات شائع ہوئے جس پر تین سال بعد 1935ء کے خفیہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترکی میں کھلے عام میسونی لاج قائم نہ کئے جائیں۔ اس لئے شروع میں بہت سے لاج توڑ دیئے گئے۔

ترکی میں میسونیوں کی کامیابی کے بعد اس کے لاجوں کو بند کیوں کیا گیا؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں سب سے پہلے یہ کہ مصطفیٰ کمال جو خود میسونیوں کی پیداوار تھا اقتدار حاصل کرنے کے بعد شخصی اقتدار مضبوط کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی جماعت پیپل ڈیموکریٹک

نے اقتدار حاصل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا جبکہ گرینڈ میسونی تحریک اس سلسلے میں اس کی کابینہ میں شامل دوسرے میسونی وزراء کو زیادہ با اختیار دیکھنا چاہتی تھی اس لئے اس بات کا احتمال ہے کہ ''کمالیوں'' نے ترک اخبارات میں ان کے خلاف شور وغل شروع کروادیا ہو تا کہ ان کی سرگرمیاں محدود کر کے انہیں کمال اتاترک کے زیر اثر کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ترک میسونی لاج کے مطابق جو معلومات انٹرنیٹ کی ویب سائٹ کے ذریعے حاصل کی گئی ہیں اس کے مطابق پیپل ڈیموکریٹک کے تین وزراء ان لاجوں کو بند کرانے میں پیش پیش تھے جماعت میں ان کی صدارت کے امکان کو میسونی لاج نے مسترد کر دیا تھا جس پر انہوں نے حکومت میں یہ قرارداد منظور کروائی کہ ترکی میں میسونی لاج بند کئے جائیں۔

ترکی میں میسونی لاج پر کھلے عام کام کرنے پر پابندی 1948ء تک رہی مگر عصمت انونو کے صدر بننے کے ساتھ ہی میسونیوں کی سرگرمیاں ترکی میں پھر تیز ہوگئیں اور ان کے لاج دوبارہ کھلنا شروع ہو گئے اپنے بند ہونے کے تیرہ سال بعد میسونیت کی سرگرمیاں تیزی کے ساتھ ترکی کے طول وعرض میں پھیلنا شروع ہوگئیں دوبارہ کھلنے کے بعد تین میسونی لاج ''G-ranloj'' کے نام سے قائم کئے گئے اس دوران میسونی اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ دوبارہ ترکی میں میسونیت کے بڑے لاج منظم کئے جائیں مگر اس سلسلے میں انہیں کامیابی 1957ء میں ہوئی اس دور میں ''Grand Turkish Masonic Loge for Free People'' اور ''Turkish masonic organization'' قائم کی گئی۔

ساٹھ کی دہائی میں ترکی کی میسونی تنظیم میں اختلافات پیدا ہو گئے جس کی بڑی وجہ سلمان ڈیمرل تھے جو سیاسی جماعت ''عدالت'' سے الگ ہو گئے تھے۔ میسونیوں میں اختلافات کیوں ابھرے اس کا جواب بھی میسونیوں کی انٹرنیٹ پر ویب سائٹ سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو قاری ترکی زبان جانتے ہیں ان کے لئے ویب سائٹ پر میسونیوں کے نقطہ نظر سے مہیا کردہ مواد موجود ہے۔ جس کے مطابق 1964ء میں سلمان ڈیمرل نے ''عدالت'' پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ اس جماعت پر میسونی نواز ہونے کے الزامات لگنا شروع ہو گئے تھے۔ 1956ء میں سلمان ڈیمرل میسونی لاج میں شامل ہوئے تھے مگر تھوڑے عرصے بعد انہوں نے

میسونی لاج سے تعلق ختم کر لیا'' Grand Turkish Masonic Loge For Free people'' کے اسسٹنٹ گرینڈ ماسٹر انور نجدت اکران نے میسونیوں کی ''آفیشل بک'' میں لکھا تھا کہ ڈیمرل کا کبھی بھی واضح تعلق نہیں رہا۔

اس قسم کی افواہیں میسونیوں کی جانب سے اس لئے اڑائی جاتی ہیں تا کہ متعلقہ شخصیات کا سیاسی کیریئر خراب نہ ہو سکے۔ کیونکہ میسونیوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کی اصل وجوہات کبھی سامنے نہیں آتیں مگر اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ میسونی گرینڈ لاج میں یہ موضوع تقریباً چھ ماہ تک چلا اس کے بعد بہت سے لاج توڑ دیئے گئے اور اس کے بدلے چھ نئے لاج تشکیل دیئے گئے ازمیر کا میسونی لاج تقریبا تمام ارکان کے ساتھ فارغ کر دیا گیا۔

1966ء میں ان نئے چھ لاجوں کو گرینڈ لاج میں ضم کرنے کے بعد '' Turkish Grand loge'' کا نام دیئے دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود یہ دعویٰ کیا جاتا رہا کہ ترکی کی میسونی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے یعنی '' Grand Turkish masonic loge for Free people'' اور ''Grand Turkish Masonic loge'' ثانی الذکر نے ترکی کے لبرل حلقوں میں تیزی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا نئے ارکان بھرتی کئے گئے اور استنبول کے علاوہ ترکی کے دوسرے شہروں میں مختلف ناموں سے اپنی شاخیں قائم کیں جبکہ اول الذکر نے اپنے آپ کو میسونیت کے انگلو سیکسن لاج سے منسلک کر لیا جو 1970ء میں برطانیہ کی ''British Grand Masonic Loge'' سے منسلک کر دی گئی۔ اس طرح وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ترکی میں میسونیوں کے دو پلیٹ فارم وجود میں آگئے ایک ''Liberal Masonic Loge'' دوسرے ''AnglosaxonMasonic'' 1973ء میں قانونی سطح پر کچھ تغیر رونما ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ میسونیوں کی تنظیموں سے ترکی کا لفظ مصلحتاً ہٹا دیا جائے۔

1991ء میں میسونیوں کے گرینڈ لاج نے ترکی کی کابینہ میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ مقامی لاج کو بین الاقوامی میسونی لاج جس کا مختصر نام ***CLIP SAS*** ہے میں ضم کر دیا جائے جسے منظور کر لیا گیا۔ اس وقت ترکی میں میسونیوں کی تین بڑی جماعتیں کام کر رہی ہیں مگر ان کی مجلس مشاورت ایک پینل پر مشتمل ہے۔

1989ء میں آسٹریا میں بین الاقوامی میسونی تحریک کا ایک عالمی اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں مختلف قسم کی قراردادیں پاس کی گئی تھیں جن میں سب سے اہم قراردادیں دنیا کے مستقبل سے متعلق تھیں۔اس کے بعد ان قراردادوں کا مسودہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مختلف ناموں کے میسونی لاجوں کی سربراہ کمیٹیوں کو ارسال کر دی گئیں ان قراردادوں میں ترکی سے متعلق جو قراردادیں تھیں ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

قرارداد نمبر 1۔میسونی اور یہودی مفاد کے خلاف کام کرنے والے عناصر کا سدباب کرنا۔

2۔مخالف عناصر کے خلاف مختلف شکلوں میں مقدمات قائم کرانا۔میسونیت کے خلاف کام کرنے والوں کا مکمل ریکارڈ رکھنا۔

3۔صحافتی حلقوں کو اپنے دائرہ اثر میں لینا تاکہ میسونیت سے متعلق سرگرمیوں کو منکشف نہ ہونے دیا جائے۔میسونیت کے حساس اداروں کی حتی الوسع پردہ پوشی کرنا۔

4۔ترکی میں جتنی بھی سیاسی جماعتیں ہیں ان کے زیادہ سے زیادہ ارکان کو میسونی لاج کا ممبر بنایا جائے۔اس کے لئے یورپ میں قائم میسونی لاجوں سے مالی امداد بھی حاصل کی جائے تاکہ ان مشکلات پر تیزی سے قابو پایا جاسکے۔

5۔صحافتی حلقوں میں اپنے ذرائع کے ذریعے میسونی افکار کی ترویج کرنا۔مختلف قسم کے معاشرتی کلب قائم کرنا اس جیسے پہلے ہی ہمارے کلب روٹری، لائنز اور ڈیبز کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ان کلبوں کے ذریعے رفاہی کاموں کی وجہ سے ہم عوامی ہمدردیاں حاصل کرتے ہیں۔

6۔اناطولیہ کے گرینڈ لاج G A P میں ترکی کے دوسرے چھوٹے لاجوں کو ضم کیا جائے۔مشرقی یورپ میں اپنے متمول ارکان کے ذریعے سرمایہ کاری کی جائے۔

7۔لوگوں کو ایسے معاملات کا عادی بنانا جن کی وجہ سے وہ مذہبی قباحتوں سے دور ہو سکیں۔اس سلسلے میں صحافتی حلقوں کو بھرپور انداز میں استعمال کیا جائے۔

8۔ترکی میں ایسے حالات کا پیدا کرنا کہ یہ کبھی بھی اسلامی دنیا کا حصہ نہ بن سکے۔بلکہ اسے اس مغالطے میں ہی مبتلا رکھا جائے کہ یہ یورپ کا حصہ ہے۔

9۔ترکی میں قائم اسلامی جماعتوں کو ناکام کرانے کی کوشش کرنا اور لوگوں کے درمیان ان کے خلاف ابہام پیدا کرنا۔

10۔نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو روٹری اور لائنز کلب کا ممبر بنانا تاکہ اسلامی جماعتوں سے انہیں بچایا جاسکے۔

11۔اسلامی جماعتوں کو وحشی مشہور کرنا تاکہ نوجوان نسل خاص طور پر خواتین کو اس سے متنفر کیا جائے۔

12۔ایسے تعلیمی اداروں کو بھرپور مالی امداد بہم پہنچانا جہاں سیکولر تعلیم دی جاتی ہو۔

13۔اسلامی جماعتوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کرنا تاکہ میسونی سرگرمیوں سے نظر ہٹائی جاسکے۔

ان قراردادوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میسونیوں نے ترکی معاشرے میں کس طرح پنجے گاڑنے کے لئے نئی صف بندی شروع کر رکھی ہے۔26 اپریل 1999ء کو میسونیوں نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اعلان کیا کہ ''ہم صحافیوں پر اپنے دروازے کھولنا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں کو ہماری رفاہی سرگرمیوں کا علم ہوسکے'' اس سلسلے میں ترک صحافیوں کی جانب سے بہت سے سوالات بھی کئے گئے ایک ترک صحافی اس اجلاس کی روداد لکھتے ہوئے چند چیزیں سامنے لے کر آیا ہے۔ایک سوال کیا گیا کہ:

س۔میسونیوں کا مذہب سے کیا تعلق ہے پوپ کی جانب سے ہمیشہ عیسائیوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ میسونیت سے کوئی تعلق نہ رکھیں؟

ج۔ہم مذاہب کے خلاف نہیں! اور نہ ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں ہم اس عقیدہ توحید کے علمبردار ہیں جو صلیبی عالم اسلام سے صلیبی جنگوں کے دوران مغرب میں لے کر آئے تھے۔اس وجہ سے پوپ ہماری مخالفت کرتا ہے۔کیونکہ مسیحت تثلیث پر قائم ہے نا کہ توحید پر۔

س۔عورتوں کو میسونی لاج میں باقاعدہ رکنیت کیوں نہیں دی جاتی؟

ج۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عورتیں کسی بات کو راز نہیں رکھ سکتیں اور ہمارے تمام امور کا تعلق رازداری پر ہے۔

اس قسم کے کئی سوالات اٹھائے گئے جن میں اٹلی کے میسونی لاج P-2 کے بارے میں
بھی سوالات کئے [illegible]
اُن کے ساتھ تعلقات اور اسلحہ کی بلیک مارکٹنگ سے متعلق سوالات تھے مگر ان کے تسلی بخش
جوابات نہیں دیئے گئے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ان سوالات کے جوابات نہیں دیئے جاسکتے
کیونکہ نہ صرف ترک فوج بلکہ سول انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے نام اسلحے اور
منشیات کی غیر قانونی تجارت میں ملوث ہیں یہ تمام کام مختلف ناموں سے میسونیت کے جھنڈے
تلے جاری ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں ''میسونیت''

پراسرار میسونی تحریک کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اس کے باوجود وثوق سے کبھی بھی نہیں کہا گیا کہ اس تحریک کا آغاز کن مقاصد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہودیوں نے اس تحریک کا آغاز صیہونیت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے کیا تھا' جدید دور میں برطانیہ اس تحریک کا گڑھ رہا ہے جہاں بڑے بڑے سیاستدان ارکان پارلیمنٹ حتیٰ کہ شاہی خاندان کے کچھ افراد بھی اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ برطانیہ میں اس تحریک کے سربراہ کو ''گرینڈ ماسٹر'' کہا جاتا ہے۔ تمام دنیا میں یہ خفیہ یہودی تحریک مختلف ناموں کے ساتھ وابستہ ذیلی تنظیموں کے ساتھ کام کر رہی ہے' جس کا دائرہ مشرق وسطیٰ سے لے کر افریقہ اور ایشیاء تک پھیلا ہوا ہے۔ یورپ اور امریکہ اس کے مرکزی گڑھ ہیں۔ افریقہ اور ایشیا میں اس کے ذیلی ادارے مختلف رفاہی کاموں کی آڑ میں اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں پاکستان بھی اس تحریک کی جکڑ بندیوں میں کسا ہوا تھا یہاں میسونی لاج بھی قائم تھے۔ آج بھی اس کے کچھ ذیلی ادارے مختلف رفاہی کاموں میں مشغول ہیں۔ حال ہی میں برطانیہ میں اس تحریک اور برطانوی وزارت داخلہ کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو چکا تھا۔ برطانوی پولیس سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ حکام کی بڑی تعداد اس خفیہ تحریک [illegible] جو بے شمار [illegible] کو اپنے [illegible] ہوئے [illegible] کی ابتداء

www.facebook.com/kurfku.blogspot.com
KURF کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

برطانوی پولیس کے بہت سے اعلیٰ حکام کے نام افشاء کرنے سے ہوئی جو اس تحریک سے وابستہ برائیوں میں شامل ہیں۔ میسونی تحریک کو برطانیہ کے داخلی اور دوسرے اہم معاملات میں کافی رسوخ حاصل ہے۔ مگر برطانیہ میں بڑھتے ہوئے جرائم اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کے پیش نظر وزارت داخلہ کے حکام نے میسونیوں پر زور دیا تھا کہ وہ اپنے ارکان کے نام صیغہ راز سے نکال کر حکام کے سامنے پیش کریں کیونکہ ایک اندازے کے مطابق صرف برطانیہ میں اس سفلی تحریک سے وابستہ ارکان کی تعداد چھ لاکھ کے قریب ہے۔

یہ اعتراض وسطی لندن میں ڈیوک سٹریٹ میں واقع تحریک کے مرکزی دفتر میں سابق برطانوی وزیر داخلہ جاک سٹرو اور کمیٹی برائے امور داخلہ کی جانب سے کیا گیا۔ مگر میسونی تحریک کی جانب سے مؤقف اختیار کیا گیا کہ چونکہ یہ تنظیم زیر زمین ''سرگرمیوں'' میں ملوث نہیں ہے اس لئے اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ارکان کے ناموں کو صیغہ راز میں رکھ سکے۔ اس تحریک کے دعویٰ کے مطابق چونکہ اس تنظیم کا اثر و رسوخ برطانیہ میں **17** ویں صدی کے آخر سے قائم ہے اس لئے برطانوی معاشرے میں اسے معتبر مقام حاصل ہے۔ برطانیہ میں ایک حلقے کی جانب سے اس تحریک کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کے خلاف ایک مرتبہ پھر آواز اٹھائی گئی میسونی تحریک یا جسے وطن عزیز میں ''فری میسن'' کے نام سے جانا جاتا ہے اپنے اکابرین کے دعویٰ کے مطابق اس کا سلسلہ آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے اور اس کا پہلا باقاعدہ اجلاس صحرائے سینا میں موسیٰ علیہ السلام کے خیمہ میں ہوا تھا۔ میسونی یا فری میسن تحریک خالصتاً دنیا میں یہودی عزائم کی تکمیل کے لئے معرض وجود میں لائی گئی تھی۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ اس کا سلسلہ آدم علیہ السلام سے جاملتا ہے سراسر کذب بیانی ہے کیونکہ یہودی آج تک دلائل کی بنیاد پر اسے ثابت نہیں کر سکے صرف مقبوضہ فلسطین میں عرب عمالقہ کے دور میں یہودیوں کا دنیا میں وجود تک نہیں تھا؟ پھر کیسے ممکن ہے کہ خالصتاً یہودیوں کی اس تحریک کا فکری سلسلہ بنی آدم علیہ السلام سے جاملتا ہو مگر اپنی اس کذب بیانی کو مدلل بنانے کے لئے میسونیوں نے گزشتہ تین صدیوں کے دوران بے شمار کتابیں شائع کرائی ہیں جن میں تاریخی حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔

17 ویں اور **18** ویں صدی کے دوران میسونیوں نے کچھ کتابیں محض اس لئے

تالیف کروائیں کہ دنیا میں یہ ثابت کر سکیں کہ ان کا وجود ایک متواصل اور منظم تنظیم کے طور پر برقرار ہے کچھ میسونی مصنفین نے اس تحریک کی کڑیاں یورپ میں ''ڈورڈز تحریک'' سے جاملائی ہیں جو قدیم زمانے میں برطانیہ اور آئرلینڈ میں عیسائیت سے قبل موجود تھی بعض طالع آزماؤں نے اسے دوسری صدی قبل مسیح میں فلسطین میں یہودی تحریک سے وابستہ کر دیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ دوسری صدی عیسوی کی تحریک ''ایسنیز'' سے میسونیت کا تعلق ہے جبکہ میسونیوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اسے مصر کے قدیم ادیان سے جاملاتا ہے۔ ان کے خیال میں اس تحریک میسونیت کے افکار فراعنہ اخناتون اور ایرئس کے نظریات سے اخذ کردہ ہیں۔

تحقیق کے مطابق **1789**ء میں انقلابِ فرانس کا بڑا سبب میسونیوں کی شاہی خاندان کے خلاف منظم سازش تھی جو فرانسیسی شاہی خاندان کے خلاف ان کی سالوں کی عرق ریزی کا شاخسانہ تھی۔ مگر میسونیوں کے جدید محقق اس بات کو اختراع سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ان کے خیال میں اس تحریک کا پس منظر گزشتہ تین صدیوں تک محدود ہے۔ ہر سال اس موضوع پر کئی کتابیں تالیف کی جاتی ہیں۔ تالیف کرنے والے میسونی بھی ہوتے ہیں اور دوسرے مصنفین بھی جو اس تحریک کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں اور اس کے پس منظر کے اسرار و رموز سے پردہ بھی اٹھاتے ہیں بعض مصنفین نے جن کی بڑی تعداد یورپ سے تعلق رکھتی ہے اپنے اپنے ملک کی سیاسی شخصیات کے حوالے سے اس تحریک کے تعلق کو بھی بیان کرتے ہیں اگر ہم پچھلے پچاس سال کے دوران میسونیت پر لکھی گئی کتابوں کا شمار کریں تو مختلف موضوعات کے حوالے سے ان کی تعداد پچاس ہزار کے قریب بنے گی۔ ان مختلف النوع موضوعات نے ہی اس کے پس منظر کو مشکوک بنایا ہوا ہے اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے منشور میں بہت سے قدیم ادیان کی رسومات شامل ہیں جن میں خطرناک یہودی فرقہ ''قبالاہ'' کے علاوہ نصرانیت اور قدیم یونانی فلسفہ شامل ہے۔

مختصر تعارف کے لئے ہم میسونیت کو تین درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اس میں ادنیٰ ممبروں کا درجہ ہے اس کے بعد باقاعدہ ارکان کا درجہ آتا ہے اور تیسرا درجہ گرینڈ ماسٹر کا ہے۔ اپنے اجتماعات میں یہ لوگ مختلف قسم کی رسومات کے مطابق عمل کرتے ہیں' ان کا منشور سو قدیم ملفوظات پر مشتمل ہے جسے یہ ''قدیم تعلیم'' کا نام دیتے ہیں جو **1290**ء کے قریب تالیف کئے

گئے تھے۔تمام معاملات میں انتہائی رازداری برتی جاتی ہے۔ جتنا بڑا عہدیدار ہوگا اسے غلطی پر اتنی ہی بڑی سزا ملے گی جو زبان کاٹنے سے لے کر زندہ جلا دینے تک ہے۔میسونیت میں درجہ بندی کے حساب سے ذمہ داریاں تقسیم ہیں اور یہ اتنی خفیہ ہوتی ہیں کہ اس تنظیم کے دوسرے شعبے کے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ چند سال قبل لندن کے پبلشنگ ادارے ہارفیل پریس نے محقق الیگزینڈ. بیٹا گورسکی کی کتاب ''فری میسن کا خوف'' شائع کی ہے اس کتاب میں مؤلف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اپنے پس منظر اور رسومات کے لحاظ سے یہ خطرناک تنظیم دنیا کی قدیم تحریکوں میں شمار کی جاتی ہے جس کا ہر پہلو صیغہ راز میں چھپا ہوا ہے' بیٹا گورسکی کے مطابق کئی صدیوں پہلے یہ جماعت بکھرے ہوئے چند تاجروں اور متفق قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے اسے اجتماعی مفادات کی خاطر منظم کیا تھا۔میسونیوں کی سازش کا آغاز سلمان علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا جب آپؑ نے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا آج بھی میسونی اجتماعات کی ترکیب ہیکل سلیمانی سے مشابہت رکھتی ہے۔ بیٹو گورسکی کے مطابق اس نسبت سے میسونیت اپنا سلسلہ نسب سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت سے جوڑ دیتی ہے اس نسبت کی بنیاد پر میسونیت نے برطانوی شاہی خاندان سے روابط استوار رکھے ہیں یہ سلسلہ 16ویں صدی سے جاری ہے۔آج بھی برطانیہ میں اس تنظیم کے کرتا دھرتا ''ڈیوک اور کاؤنٹ'' ہیں۔

عالم عرب کے حوالے سے بھی انکشافات سامنے آئے ہیں مشرقِ وسطیٰ کی کئی بڑی سیاسی شخصیات کا تعلق اس تنظیم سے ہے میسونیت کے حوالے سے مشرق وسطیٰ میں قاہرہ' دمشق' عمان' بیروت اس تحریک کا گڑھ تصور کئے جاتے ہیں جبکہ ترکی کے سارے کے سارے سیکولر عناصر اس تحریک سے وابستہ تھے جس کا سلسلہ کمال اتاترک تک جا پہنچتا ہے۔میسونیوں نے اپنے متعلق میڈیا کے ذریعے کافی دیومالائی قسم کی روایات بھی عوام میں پھیلا رکھی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ برطانیہ میں اس تنظیم نے بڑی بڑی عمارتیں بنا رکھی ہیں جہاں دنیا جہان کی آسائشیں میسر ہیں' کیونکہ میسونیت کے منشور میں ہے کہ کسی بھی ملک کے اشرافیہ طبقے کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے طرز حیات اتنا اونچا اور عالیشان ہو کہ ہر بڑی اور اپنے میدان کی مؤثر شخصیت اس کا حصہ بننے کے لئے بے چین ہو جائے یہی وجہ ہے کہ ترکی اور عالم عرب کی سیکولر حکومتوں میں فوجی جرنیلوں کا ایک بڑا طبقہ اس تنظیم کے زیر اثر ہے۔تقریباً دنیا

کے بہت سے ملکوں میں اس نے معاشرے میں اجتماعی سرگرمیوں کے لئے کلب قائم کر رکھے ہیں جس کے ممبران میں اس ملک کے سیکولر نظریات کے حامل مغربی وضع قطع کے ''اشرافیہ'' شامل ہوتے ہیں جو غیر محسوس طریقے سے میسونیت کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے ہیں۔ان کلبوں کا اجلاس فائیوسٹار ہوٹلوں میں ہوتا ہے ہر ممبر اپنی اپنی فیلڈ میں بااثر تصور کیا جاتا ہے۔ان میں بڑے بڑے کاروباری افراد' ڈاکٹر پروفیسرز اور صحافی بھی شامل ہوتے ہیں۔

میسونیت کا بڑا اجلاس جسے ان کی اصطلاع میں ''گرینڈ میٹنگ'' کہا جاتا ہے برطانیہ میں واقع مرکز میں ہوتا ہے۔ **1717**ء میں اس تنظیم کی پہلی گرینڈ میٹنگ برطانیہ میں ہوئی تھی جس کی صدارت اس تحریک سے وابستہ اس وقت کے برطانوی پالیمانی وزیر ولیم کاؤبری نے کی تھی۔ **1723**ء میں میسونیت برطانوی شاہی خاندان کے ایک فرد کو اچکنے میں کامیاب ہوگئی جب پرنس آف ویلز فیڈریکا شاہی فرمان کے ذریعے اس تنظیم کا نگران مقرر ہوا اس وقت سے لے کر آج تک برطانوی شاہی خاندان برطانیہ میں میسونیت کا نگران اور سرپرست ہے۔سٹیفن نائٹ نامی برطانوی مصنف نے اپنی کتاب **Brother Hood** میں انکشاف کیا ہے کہ **18**ویں صدی کے آخر تک برطانیہ میں اس تنظیم کی **320** شاخیں معرض وجود میں آچکی تھیں اور اب ان کا تناسب **9003** کے قریب ہے جبکہ **900** کے قریب دولت مشترکہ کے دوسرے ملکوں میں قائم ہیں۔اس کے علاوہ یورپ میں فرینکفرٹ' پیرس' بروسلز' ایمسٹرڈیم' اوسلو' ماسکو اس تنظیم کے بڑے ٹھکانے تصور کئے جاتے ہیں جبکہ امریکہ میں اس کا حال اس سے بھی برا ہے۔ وہاں وائٹ ہاؤس سے لے کر پینٹا گون اور سی آئی اے کے ادارے بھی اس تنظیم کے دائرہ اثر میں شمار کئے جاتے ہیں۔شاید اسی کا اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے سابق امریکی صدر نکسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا پر ایک **Invisible Power** حکومت کر رہی ہے۔

امریکہ میں میسونیت کے اثرات برطانوی راج کے ذریعے ہی پہنچے۔ **18**ویں صدی کے وسط تک کئی امریکی ریاستیں ابھی برطانیہ کے زیر اثر تھیں جس کی وجہ سے اس تنظیم کا دائرہ اثر دوسری ریاستوں تک پہنچ گیا۔ **1752**ء میں امریکی صدر جارج واشنگٹن اس تنظیم سے وابستہ ہو گئے' یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ پر جارج واشنگٹن کی تصویر کے علاوہ اہرام مصر پر نصب ایک آنکھ بھی دکھائی جاتی ہے جو تمام دنیا کو دیکھ رہی ہے' یہی آنکھ اصل میں

میسونیت کا شعار ہے۔جارج واشنگٹن نے امریکہ میں میسونیت کا گرینڈ ماسٹر بننے سے انکار کردیا تھا۔اس لئے امریکہ کی ہر ریاست میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ 1753ء میں ریاست ورجینیا میں میسونیت کی پہلی گرینڈ میٹنگ منعقد کی گئی۔ برطانیہ کے ذریعے دوسرے ملکوں میں بھی اس تحریک کے اجتماعات منعقد کئے گئے۔سٹیفن نائٹ کے مطابق دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے اس کے اجتماعات چین میں بھی کرائے گئے' امریکہ کے ذریعے اس تنظیم نے کینیڈا میں بھی اپنی شاخیں قائم کرلیں۔ 1749ء میں کینیڈا میں اس کا پہلا اجتماع منعقد کیا گیا۔امریکہ کی میثاق استقلال پر جن آٹھ افراد نے دستخط کئے تھے ان میں سے ایک بنجامن فرینکلن میسونی تھا۔

میسونیت کے اس مختصر سے جائزہ سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ تمام دنیا میں اس خطرناک تنظیم کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں۔امریکہ یورپ مشرق وسطی افریقہ اور ایشیاء اس تنظیم کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں۔رفاہی کاموں کی آڑ میں یہ تنظیم دنیا کی ہر قوم کے معاشرے میں زہر کی طرح سرایت کرچکی ہے۔اس وقت تک اس تنظیم کا رفاہی کاموں کے ضمن میں سالانہ بجٹ 23 ملین آسٹریلوی پونڈ ہے۔دنیا کی بااثر شخصیات اس کی رکن ہیں۔ایک حوالے سے اس تنظیم کو ہم صیہونیت کا ذیلی ادارہ کہہ سکتے ہیں جس نے بالعموم تمام دنیا اور بالخصوص عالم اسلام کو اپنے مکروہ شکنجے میں لے رکھا ہے جہاں یہ تعلیم کے شعبے' رفاہی کاموں اور انسانی حقوق کی شکل میں اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔اس کے بڑے مقاصد میں اسلام کو ایک فرسودہ مذہب قرار دلوانا ہے۔اس کام کے لئے مسلمانوں میں مغرب زدہ طبقہ آلہ کار بنا ہوا ہے۔ایسے طبقے کی پاکستان میں بھی کمی نہیں ہے جو مختلف طریقوں سے اس تنظیم کے مقاصد کو بھرپور انداز میں پاکستانی معاشرے میں رائج کررہا ہے۔وطن عزیز کی اخلاقی قدروں کو قائم رکھنے کے لئے اس طبقے پر کڑی نگاہ رکھنا اشد ضروری ہے.........

کردستان اور سی آئی اے

جغرافیائی طور پر کردستان ہمیشہ سے ایک متنازعہ علاقہ رہا ہے جو عراق' ایران اور ترکی کے مابین تقسیم ہے۔اسے ہمیشہ سے اسٹریٹیجک علاقہ تصور کیا گیا ہے۔عراق امریکہ تنازعے کے بعد اسے عالمی سطح پر اس علاقے کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے خاص طور پر جب سے وسطی ایشیائی ریاستیں آزاد ہوئی ہیں۔ افغانستان اور ایران کے بعد کردستان وسطی ایشیاء کی جانب ایسی راہ داری ہے جس پر مغربی ممالک خاص طور پر امریکہ نظریں جمائے بیٹھا ہے بحیرۂ کیپین کے گرد واقع قدرتی دولت سے مالا مال اس علاقے کی جانب مغرب کے لئے محفوظ راستہ صرف کردستان ہی رہ جاتا ہے۔

شمالی عراق میں جو کردستان آتا ہے وہ پچھلی کئی صدیوں سے عیسائی مبلغین کی زد میں رہا ہے' مغرب سے آنے والی کئی عیسائی تنظیموں نے یہاں اپنی سرگرمیوں کے مرکز بنائے مگر برطانیہ' فرانس اور امریکہ سے تعلق رکھنے والی ان تنظیموں کے سامنے ہمیشہ مقامی عرب اور کرد مسلمانوں نے بند باندھا۔ان تنظیموں نے ہمیشہ سے عرب اور کرد مسلمانوں کے درمیان قومیت کی دیوار کھڑی کرنے کی کوششیں کیں مگر وہ اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرسکیں۔ ایسی ہی ایک مکروہ کوشش چالیس کی دہائی میں برطانوی عیسائی تنظیم کے سربراہ کمبلان نے برطانوی انٹیلی جنس کی مدد سے کی تھی یہ کوشش مسلمانوں کو مرتد بنانے کے لئے کی گئی تھی تاکہ علاقے میں

برطانوی استعماری مقاصد پورے کئے جاسکیں۔ بعد میں یہ حقیقت پوری طرح کھل گئی تھی کہ کمبلان برطانوی انٹیلی جنس کا جاسوس تھا جو عیسائی مبلغ کے بھیس میں مسلمانوں کو ان کے دین سے متنفر کرنے کردستان وارد ہوا تھا۔ جب کوئی کرد مسلمان اس سے ملاقات کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو اسے سخت قسم کی تلاشی کے مرحلے سے گزرنا پڑتا کہ کہیں کوئی اسلحے سمیت اس کے سامنے نہ جاسکے مگر ایک مرتبہ کردستان کے علاقے بادیان سے تعلق رکھنے والا ایک کرد مسلمان سلیم مصطفیٰ اپنے لباس میں چھوٹا سا ریوالور چھپا کر اس کے سامنے چلا گیا اس نے ایک پستول اوپر رکھا ہوا تھا تاکہ تلاشی کے دوران صرف یہ ہی برآمد ہو اور ایسا ہی ہوا۔ کمرے میں جاکر سلیم مصطفیٰ نے اس مبلغ نما برطانوی جاسوس سے بات چیت شروع کردی جس وقت گفتگو کا رخ دینی اور وطنی حمیت کی طرف مڑا سلیم مصطفیٰ نے اپنے لباس کے خفیہ خانے سے چھوٹا سا پستول نکال کر کمبلان کے سر میں گولی ماردی اور کھڑکی کے راستے فرار ہوکر پہاڑوں میں روپوش ہوگیا اس واقعہ کی وجہ سے **1947**ء میں برطانوی حکومت اور عراقی بادشاہت کے درمیان بڑا جھگڑا کھڑا ہوگیا تھا' چند سالوں بعد عراقی حکومت نے بڑی جدوجہد کے بعد سلیم مصطفیٰ کو گرفتار کرنے کے بعد برطانوی حکومت کے مطالبے پر سزائے موت دے دی۔

1990ء میں عراق کے کویت پر قبضے کے بعد یہ علاقہ ایک مرتبہ پھر ایسی ہی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا گیا۔ امریکہ نے اپنے پلان کے مطابق عراق کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا' شمالی عراق جو کردستان کے بڑے علاقے پر مشتمل ہے جنوبی عراق جہاں شیعہ کثرت سے آباد ہیں اور وسطی عراق۔ امریکہ چاہتا تھا کہ عراق کو انتظامی طور پر ان تین حصوں میں تقسیم کرکے صدام حسین کو اقتدار میں رکھتے ہوئے اس کا زور توڑ دیا جائے مگر وہ اس میں بری طرح ناکام رہا اس کے بعد **1992**ء میں کردستان کے پارلیمانی انتخابات کرائے گئے جہاں کردستان جمہوری پارٹی مسعود البارزانی اور الاتحاد الوطنی الکردستان جلال الطالبانی کی زیر قیادت انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں بعد میں ان جماعتوں کو مسلح ملیشیا میں تبدیل کردیا گیا۔ جنہوں نے عراق کے خلاف مسلح کارروائیوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا مگر عراق کے نیشنل گارڈ نے اسے بھی سختی سے کچل دیا اس وقت سے لے کر اب تک کردستان کا علاقہ بین الاقوامی خفیہ ایجنسیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ عیسائی تبلیغی تنظیمیں پوری طرح فعال کردار ادا کررہی ہیں۔ ڈالروں کے ذریعے کرد قیادت

اور عوام کے ضمیر خریدنے کی کوششیں زوروں پر ہیں۔ امریکہ کی یہودی اور عیسائی تنظیمیں سی آئی اے کی قیادت میں ایک مرتبہ پھر تاریخ کو دوہرا رہی ہیں جیسا کہ برطانوی استعمار نے اپنے دور میں کیا تھا۔ ایسی ہی کارروائیاں گذشتہ چند برسوں کے دوران بوسنیا میں بھی کی گئی تھیں جب مغربی امدادی تنظیمیں رفاہ عامہ کے کام کی آڑ میں عیسائیت کی تبلیغ اور مغربی استعماریت کی تکمیل میں مصروف تھیں ان کارروائیوں کی تفاصیل ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری اور کویتی رسالے المجتمع کے ایڈیٹر احمد منصور پچھلے سال اپنی رپورٹوں میں دے چکے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عراقی کردستان میں نیا صلیبی اور یہودی استعماری حملہ کیسے شروع ہوا.........؟ کون سے مقامی لوگ اس کے پیچھے ہیں؟ آج کل مقامی سطح پر ہاشم شوشی نامی ایک کرد عیسائیت کے لبادے میں سی آئی اے کے لئے کام کررہا ہے۔ ہاشم شوشی ایک کرد مسلمان تھا جس نے عیسائی عورت سے شادی کررکھی تھی ہاشم شوشی کردستان کی خفیہ ایجنسی میں ملازم تھا' **1977**ء میں یہ شخص اپنے خاندان کے ساتھ امریکہ ہجرت کرگیا جہاں وہ مرتد ہوکر عیسائی بن گیا اس کے بعد اس نے **Evidance of Jehova** ''خدا کی شہادت'' نامی امریکی تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی یہاں بہت سے مراحل سے گزرنے کے بعد وہ اس جماعت میں اہم شخصیت کی حیثیت اختیار کرگیا کچھ عرصے کے بعد ہاشم شوشی دوبارہ **1985**ء کے بعد عراقی کردستان واپس آیا یہاں اس نے ''خدا کی شہادت'' نامی جماعت کی تاسیس مکمل کی اور ایک کرد لڑکی سے شادی کرنے کے بعد واپس امریکہ آگیا۔ امریکی ایجنسی کی جانب سے ایک اور شخص یوسف متی کی ڈیوٹی ہاشم شوشی کے ساتھ لگائی گئی جس کی بنیاد پر کردستان کے علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کردستان میں ''دھوک'' کا علاقہ یوسف متی کی زیر نگرانی ہے جبکہ دوسرا حصہ ''سوران'' کے علاقے پر مشتمل ہے' یہ حصہ ہاشم شوشی کی سرگرمیوں کا مرکز ہے یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ سی آئی اے کے مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی کام ہوتا ہے۔

تھوڑے عرصے کے بعد دھوک کے علاقہ سے تعلق رکھنے والی عیسائی تنظیم کی جانب سے کردستان کی اعلیٰ قیادت کو تنظیم کے علاقہ میں واقع مرکزی دفتر کے دورے کی دعوت بھی دی گئی یہ دفتر سید علی شعبان کے گھر میں واقع تھا۔ کردستان کے انتظامی امور کے سربراہ کی جانب سے تنظیم کے دفتر کا دورہ کیا گیا جہاں بہت سی ''تفصیلات'' طے کی گئیں اس کے ساتھ ساتھ اس

تنظیم کو تبلیغ کے حوالے سے علاقے میں اپنی کاروائیاں جاری رکھنے کی اجازت بھی مل گئی۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا جو اس تنظیم کی جانب سے عمل میں آیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب کرد انتظامیہ کا نمائندہ ترکی میں واقع اس تنظیم کے ذیلی دفتر کے انچارج کے ساتھ امریکہ گیا تو اس کا استقبال ایک ہیرو کی طرح کیا گیا جو ''جمہوریت'' کے لئے کام کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ کرد انتظامیہ کی جانب سے عیسائیوں کو سرکاری سرپرستی میں کارروائیوں کی اجازت مل چکی تھی۔ یہ اس لئے بھی اہم تھا کہ پچھلے کئی سالوں سے آس پاس کے علاقوں سے اس تنظیم کی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کے لئے زور لگایا جا رہا تھا۔ لیکن اب یہ سب کچھ سرکاری سرپرستی اور پولیس کی نگرانی میں ہوتا رہا تا کہ یہاں کے نوجوانوں کے دماغوں کو مغرب کے زہریلے پراپیگنڈے سے مسموم کیا جا سکے۔

یوسف متی نے ''خدا کی شہادت'' کے تحت کام کرتے ہوئے اپنے زیر انتظام علاقے دھوک میں انگریزی زبان کے انسٹی ٹیوٹ اور تعلیمی ادارے قائم کرنے شروع کر دیئے جن میں مسلمانوں کو دین اسلام سے انحراف کی تعلیم دی جانے لگی۔ اس ادارے میں بہت سے مسلمان اور عیسائی ملازمت کرتے' ماہوار کے علاوہ انہیں ایک ہزار امریکی ڈالر عطیے کی شکل میں موصول ہوتے۔ ان گھناؤنی سرگرمیوں کے تھوڑے عرصے بعد ہی کردستان کے مسلمانوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا۔ انہوں نے انتظامیہ کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوششیں شروع کر دیں کہ انگریزی مدارس کے نام پر یہ ادارے امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں مگر انتظامیہ نے ان گزارشات پر کان نہیں دھرا۔ دوسری طرف آئمہ مساجد نے اسے اپنا فرض سمجھتے ہوئے جمعہ کے خطبے کے دوران لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا شروع کر دیا' علماء کرام کی جانب سے احتجاج کی آواز بلند کی گئی تا کہ انتظامیہ اس کے خلاف قرار واقعی اقدامات کرے۔ اس سلسلے میں کردستان کے علماء کرام کی جانب سے کردستان جمہوری پارٹی کے صدر مسعود البارزانی کو خطوط ارسال کیئے گئے تا کہ اس خطرے کا سد باب کیا جا سکے۔ علماء کرام کی مساعی سے لوگ کافی حد تک ان سرگرمیوں سے آگاہ ہوئے۔

''خدا کی شہادت'' نامی اس تنظیم کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف اول میں اس کا ظہور امریکہ میں ہوا ظاہراً یہ عیسائیت کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتی ہے

مگر حقیقت میں اس تنظیم کی باگ ڈور یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اس تنظیم کی بنیاد **1874**ء میں راہب چارلس رسل نے ڈالی اس زمانے میں اسے ''مذہب رسالت'' کے نام سے جانا جاتا تھا اس کے علاوہ اسے ''انجیل کے نئے قاری'' بھی کہا جاتا تھا اس کے بعد اس تنظیم کی باگ ڈور فرینکلین روز فورڈ کے ہاتھ میں آ گئی۔ **1905**ء میں ہرمرکثور اس تنظیم کا صدر بن گیا مگر بعد کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ یہ تنظیم سی آئی اے کے مقاصد کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بعض عیسائی مصنفین نے اس تنظیم کو انسانیت کے لئے خطرہ قرار دیا ہے ''کیونکہ یہ تنظیم اسرائیلی مقاصد کی توسیع کے لئے خدمات انجام دیتی ہے''۔ اس حوالے سے اسے کردستان کے لئے بھی خطرناک ترین تنظیم قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ قضیہ کردستان اسلام دشمن طاقتوں کے لئے بہت اہم ہے۔ ایسی تنظیم جو خود مغربی استعماریت کی خدمات انجام دے رہی ہو کرد عوام کی کیا خدمت کر سکتی ہے۔

امریکی سی آئی اے کردستان پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے کیونکہ امریکہ کے لئے وسطی ایشیاء تک پہنچنے کا محفوظ ترین زمینی راستہ کردستان ہی رہ جاتا ہے۔ بحیرۂ کیسپین کے گرد واقع وسطی ایشیاء قدرتی گیس اور تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ توانائی کی اس دولت تک پہنچنے کے لئے امریکہ کو ترکی کی حمایت بھی درکار تھی اس لئے اربکان حکومت کا جلد خاتمہ امریکی مصلحت کے عین مطابق تھا کیونکہ ترکی میں کوئی بھی امریکہ مخالف حکومت کردستان میں سی آئی اے کی سرگرمیوں کے سامنے رکاوٹ بن سکتی تھی۔ صدام حسین کی شکل میں شرق الاوسط میں عراقی بحران کو برقرار رکھنا بھی امریکی ضرورت کے عین مطابق ہے اس لئے یہ کہا جائے کہ امریکہ شرق الاوسط کو پوری طرح اپنے شکنجے میں کسنے کا منصوبہ ترتیب دے رہا ہے۔ کردستان امریکہ کے لئے ایسا ہی علاقہ ہے جو نہ صرف مشرقی وسطی ایشیاء کی جانب محفوظ راہداری ہے بلکہ ایران اور عراق کے خلاف کسی بھی ممکنہ کاروائی کے لئے بہترین فوجی مستقر بھی ہے یہی وجہ ہے کہ سی آئی اے نے جنوب کے بجائے زیادہ توجہ شمالی عراق کی طرف مبذول کر رکھی ہے۔

سی آئی اے کا سابق ایجنٹ' اسرائیل کا وزیر اعظم کیسے بنا؟

سابق اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو سیاسی افق پر اتنا اچانک اور تیزی سے نمودار ہوا کہ ایک دنیا کے سیاسی حلقے ورطہ حیرت میں آ گئے۔ 1982ء تک نیتن یاہو فرنیچر کا کاروبار کرتا تھا۔ 1982ء کے بعد وہ اچانک واشنگٹن میں اسرائیلی سفارت خانے میں سیاسی امور کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ 1991ء میں میڈرڈ میں ہونے والی نام نہاد امن کانفرنس میں وہ اسرائیلی وفد کی قیادت کرتا ہے اس کے فوراً بعد لیکوڈ پارٹی کا سربراہ بن جانے کے بعد وہ اسرائیلی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھال لیتا ہے۔ فرنیچر کے کاروبار سے اسرائیلی وزارت عظمیٰ تک پہنچنے کا یہ سفر اتنی تیزی سے طے ہوا کہ بین الاقوامی سیاسی و صحافتی حلقے اس سفر کے پس منظر کو جاننے میں منہمک ہو گئے۔

نیتن یاہو نے اپنی سابقہ زندگی مقبوضہ فلسطین اور امریکہ میں گزاری۔ اسرائیل میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ امریکہ منتقل ہو گیا۔ امریکہ میں دو سال گزارنے کے بعد وہ واپس اسرائیل پلٹا اور القدس میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ثانوی تعلیم کے حصول کے لئے اس نے دوبارہ امریکہ کا رخ کیا۔ فلاڈیلفیا کے تعلیمی ادارے میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد یہ واپس پھر اسرائیل آ گیا۔ اسرائیلی فوج میں خدمات انجام دینے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے اس نے امریکہ کی یونیورسٹی M.E.T. میں داخلہ لے لیا اور ایم اے

کی ڈگری حاصل کی۔ لمبے عرصے تک نیتن یاہو نے اسرائیلی اور امریکی شہریت اختیار کئے رکھی تاکہ وہ آسانی سے دونوں طرف نقل و حرکت جاری رکھ سکے اور امریکہ میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے قرض بھی حاصل کرتا رہے۔ اس طرح بعد میں امریکہ میں کام کرنے کے لئے کوئی قانونی رکاوٹ بھی نہیں آ سکتی تھی۔ ہر امریکی شہری کی طرح نیتن یاہو کا بھی سیکورٹی نمبر تھا۔ بنکوں اور دوسرے حکومتی اداروں میں اس کی فائلیں تھیں مگر نیتن یاہو کا دوسرے امریکی شہریوں کی نسبت معاملہ مختلف تھا۔ اس بات کا انکشاف اسرائیلی ہفت روزہ ''یاعیر'' بھی کر چکا ہے۔ اسرائیلی جریدے کے مطابق نیتن یاہو کی چار درخواستیں جو قرض حاصل کرنے کے سلسلے میں دی گئی تھیں امریکی نیشنل سیکورٹی کے محکمے میں موجود ہیں۔ ان درخواستوں کا نمبر 30, 437 اور 20 ہے مگر یہ تمام درخواستیں مختلف ناموں سے درج کی گئی تھیں۔ پہلی درخواست بنیامین نیتن یاہو کے نام سے ہے۔ دوسری بنیامین نیتائی کے نام سے تیسری جیہ سولیفان اور چوتھی جون سولیفان جونیئر کے نام سے ہے۔ یہ چاروں نام ایک ہی آدمی کے ہیں' اس سلسلے میں امریکی صحافی نیف گورڈن جو دی واشنگٹن رپورٹ اور دی مڈل ایسٹ میں کالم نویسی سے منسلک ہے کے مطابق بنیامین نیتن یاہو وہ نام ہے جو اسرائیلی وزیر اعظم کا پیدائشی نام تھا جبکہ دوسرا نام وہ اس وقت استعمال کرتا تھا جب وہ ایم ای ٹی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔

جون 1973ء میں بوسٹن کے محکمے کو تبدیلی نام کے سلسلے میں ایک درخواست دی جاتی ہے جس میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نیتن یاہو سے نام تبدیل کر کے نیتائی کر دیا جائے کیونکہ پہلا نام لکھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور وہ اپنے نام کو مختصر کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال محکمے میں درخواست منظور کر لی جاتی ہے جبکہ تیسرا اور چوتھا نام پردۂ اسرار میں رہتا ہے اور ان ناموں کے تحت کیلیفورنیا میں جو پتہ درج کیا جاتا ہے ان مقامات کا روئے زمین پر کوئی وجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان فرضی ناموں سے حکومتِ امریکہ سے قرض حاصل کرنے کے سلسلے میں ان حقائق کو مٹانا تھا جو مستقبل میں ثابت کر سکتے تھے کہ بنیامین نیتن یاہو کے نام سے امریکہ میں قرض لئے گئے۔ اس سلسلے میں اسرائیلی جریدے ہاعیر کے دو صحافیوں نے جب تحقیق کی غرض سے قلم اٹھایا تو نیتن یاہو کے کیس کو خصوصی فائل قرار دے کر انہیں اس تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ ایسی فائلوں کو صرف چار اغراض سے عوام الناس کے سامنے نہیں آنے دیا جاتا بشرطیکہ ان

فائلوں کے حاملین کا تعلق ایف بی آئی سے یا سی آئی اے سے ہو' اس کے بعد صرف دہشت گردوں یا دوسرے مجرمین کی فائلیں رہ جاتی ہیں اس لئے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ امریکی حکومت کی نظر میں یہ شخص سی آئی اے کا ایجنٹ تھا یا دہشت گرد؟

اسرائیلی صحافیوں کے مطابق اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ نیتن یاہو نے امریکی شہریت کو خیر باد کہہ دیا ہے کیونکہ اسرائیلی قوانین کے مطابق پارلیمنٹ کا کوئی رکن دہری شہریت نہیں رکھ سکتا جبکہ نیتن یاہو کا دعویٰ ہے کہ اس نے 1982ء میں امریکی شہریت ترک کر دی تھی' اس کے باوجود اسرائیلی صحافی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے۔ ان کے مطابق تل ابیب میں امریکی سفارتخانے کے پاس ابھی تک نیتن یاہو کی فائل موجود ہے جس میں امریکی شہریت سے متعلق نیتن یاہو کی تمام معلومات درج ہیں۔

میڈرڈ کانفرنس کے بعد نیتن یاہو نے نائب وزیر خارجہ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اس کے بعد اس نے انتہا پسند یہودی جماعت لیکوڈ کی سربراہی سنبھال لی اس طرح وہ اس جماعت کے سربراہ کے طور پر اسرائیل کا وزیر اعظم بن گیا۔ ایک اسرائیلی ضرب المثل ہے کہ کسی شخص کے اہداف کو جاننے کے لئے اس کے دوستوں کے اہداف دیکھو' اس مثال کو سامنے رکھ کے سب سے پہلے رابن مانیوس کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ شخص 1996ء میں انتقال کر چکا ہے۔ اس شخص نے ایک فاشسٹ جماعت کے سربراہ ہاخام میئر کاہانا کو کئی ملین ڈالر صرف اس لئے پیش کئے تھے کہ وہ الخلیل میں یہودی آبادکاری کو تیز کر سکے۔ یہ صیہونی نیتن یاہو کا بہت بڑا سپورٹر تھا۔ اس کے بعد مارفین جوزفین کا نام آتا ہے یہ شخص امریکہ کے ایک بہت بڑے نشریاتی دارے آئی سی ایم کا مالک ہے۔ یہ یہودی بھی لیکوڈ جماعت کا بہت بڑا سپورٹر ہے۔ اس نے کروڑوں ڈالر اس جماعت کو حکومت میں پہنچانے کے لئے صرف کئے۔ باری سلونیکا جس کا کام روسی اور اٹلی مافیا سے یہودی مفادات کا دفاع کرنا ہے ہاخام کاہانا کا قریبی دوست تصور کیا جاتا ہے۔۔ بلکہ اس کا شمار جدید یہودی تاریخ میں ہیرو کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ٹیڈ اریسون جو امریکہ میں بہت بڑے تجارتی بحری بیڑے کا مالک ہے نیتن یاہو کے مقربین میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شخص اسرائیل میں بڑے ادارے خریدنے کا خواہش مند تھا جبکہ آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے یہودی سرمایہ کار جوزف برینڈر' برناڈ موسی' مارک بیسان' جاک مینڈل یہ تمام سرمایہ دار اسرائیلی

صحافتی حلقوں کو اپنے دائرہ اختیار میں لانا چاہتے تھے۔ اسرائیلی صحافتی حلقوں کے مطابق جاک مینڈل نے تل ابیب میں موجود اپنی عالیشان بلڈنگ نیتن یاہو کے تصرف میں دی ہوئی تھی۔ شانڈی ایس شتاح جو اسرائیل میں گیس اور تیل کی کمپنی کا مالک ہے نے القدس میں اپنی عمارتیں نیتن یاہو کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ نیتن یاہو لندن میں رابٹ میر دوخ نامی آسٹریلوی یہودی کا مہمان رہتا تھا۔ یہ یہودی دنیا میں صحافتی ایمپائر کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں نیتن یاہو کے حلیفوں میں رونالڈ لاورڈ کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے القدس میں شالیم انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا تھا اس کے علاوہ نیتن یاہو کے خفیہ لیکن قریبی تعلقات سابق امریکی صدر ریگن اور سابق برطانوی وزیر اعظم تھیچر کی لابی کے ساتھ بھی تھے۔

نیتن یاہو کی خفیہ زندگی بے شمار اسرار لئے ہوئے ہے۔ 1979ء میں ایک امریکی ادارے جس کا صدر دفتر نیویارک میں ہے کے زیر اہتمام خارجی تعلقات اور دہشت گردی کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ کانفرنس اس وقت 27 سالہ نوجوان نیتن یاہو کے زیر اہتمام عمل میں لائی گئی۔ اس وقت امریکہ کی اعلیٰ شخصیات جن میں جارج بش' جارج شلز اور امریکی وزارت خارجہ کے اہلکاروں نے شرکت کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک گمنام نوجوان کے زیر اہتمام کانفرنس میں اتنی بڑی شخصیات نے شرکت کیوں کی؟ نیتن یاہو کے پاس جو امریکی وفد آیا اس کی قیادت اس وقت کے سی آئی اے کے ڈائریکٹر اور سابق امریکی صدر جارج بش کر رہے تھے۔ بوسٹن میں کام کے دوران اچانک نیتن یاہو نے اسرائیل جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ وہاں فرنیچر کا کاروبار کر سکے۔ اس کیساتھ ساتھ یہاں آ کر نیتن یاہو نے دہشت گردی کے سد باب کے سلسلے میں ایک تنظیم منظم کی اور اس سلسلے میں ایک کانفرنس بھی منعقد کی۔ اس کانفرنس میں اس وقت کے یہودی امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے یہ اعلان کیا کہ ریگن انتظامیہ کی اولین ترجیح دنیا میں دہشت گردی کو ختم کرنا ہے۔ اسرائیلی آئین کے تحت سفارتی ذمہ داریاں وزارت خارجہ کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں اس کام کو اسرائیلی معاشرے میں حکومت کے بعد بہت اہم سمجھا جاتا ہے لیکن بہت سے سینئر لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے واشنگٹن میں متعین اسرائیلی سفیر اریز نے نیتن یاہو کو سیاسی معاملات کا انچارج مقرر کر دیا۔

1984ء میں نیتن یاہو اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے نیویارک پہنچا۔ امریکہ کے بڑے

نشریاتی ادارے CNN' نیویارک ٹائمز' واشنگٹن پوسٹ' اور نیوز ویک نے نیتن یاہو کو بڑی شخصیت کے طور پر متعارف کرایا' اس طرح نیتن یاہو اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ جارج شلز کا دوست ٹھہرا۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے حیرت انگیز سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں۔ کہ صرف اس کے لئے اتنا اہتمام کیوں کیا گیا؟ 1985ء میں واشنگٹن میں منعقد ہونے والی دہشت گردی سے متعلق کانفرنس میں جس کا انتظام نیتن یاہو نے کیا تھا جارج شلز نے کیوں شرکت کی۔ اس کانفرنس کی کوریج کو ساری دنیا میں بری طرح اچھالا گیا جس سے نیتن یاہو کا سیاسی ستارہ یکدم عروج پر پہنچ گیا۔ سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز اور سابق سی آئے اے کے ڈائریکٹر جارج بش نے نیتن یاہو کے مستقبل کو استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے جواب طلب سوالات ذہن میں گردش کرتے ہیں جن کا تعلق نیتن یاہو کی خفیہ زندگی سے ہے۔ 1987ء میں نیتن یاہو نے امریکی بنکوں سے قرضہ لینے لے لئے امریکی سیکورٹی نمبر 020364537 استعمال کیا۔ یہ نمبر جان سولیفان سے مستعار لیا گیا تھا جس نے اپنا پتہ رجسٹر کراتے ہوئے شمالی کیلیفورنیا کا اندراج کرایا تھا' 1987ء' 1988ء کے درمیان نیتن یاہو نے اس نام کو قرضہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ امریکی اور اسرائیلی صحافیوں نے اس سیکورٹی نمبر کی مدد سے ہی نیتن یاہو کی سابق زندگی سے پردے اٹھائے تھے۔ مگر ان حقائق تک پہنچنے کے لئے امریکی حکومت کے خاص نمائندے کے علاوہ کسی کو اجازت نہیں ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ جب نیتن یاہو اقوام متحدہ میں اسرائیلی سفیر کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا تو اس نے کاروباری طور پر اپنی لائن کو تین مرتبہ بدلا۔ نیتن یاہو کے کانگرس کے رکن بل غالیمان جو اس وقت کانگرس کی امورِ خارجہ کمیٹی کا صدر تھا سے قریبی تعلقات تھے۔ یہ وہی بل غالیمان ہے جو کال مونوفیٹش کا مقرب خاص تھا ان دونوں نے افریقہ میں تجارتی تسلط قائم کر رکھا تھا' بعد میں کال مونوفیٹش کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ سابق سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے لئے خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ نیتن یاہو نے کانگرس کے ارکان سے قریبی تعلقات استوار کر لئے تھے۔ جس کے لئے وہ اسرائیلی مفادات کے لئے جاسوسی بھی کرتا رہا۔ اس کے بعد دو عالمی سرمایہ کار جن کا تعلق اسرائیل سے ہے ان میں ایک

جاک مینڈیل ہے جس کا تعلق آسٹریلیا سے تھا اور دوسری امریکی نژاد یہودی سنڈے استاد ہے۔ انہوں نے نیتن یاہو کے لئے تل ابیب اور القدس میں بڑی عمارتیں خریدیں ایسا کیوں کیا گیا یہ بھی ایک جواب طلب سوال ہے۔ نیتن یاہو نے وزیراعظم بننے سے پہلے اردن کے شاہی خاندان کے لوگوں سے لندن اور عمان میں ملاقاتیں بھی کیں۔ یروشلم پوسٹ کے مطابق جون 1996ء میں دونوں طرف سے سات ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے علاوہ نیتن یاہو کے تعلقات جدید ٹیکنالوجی سے متعلق اسرائیلی کمپنی سستائیٹک کے ساتھ بھی قائم ہوئے۔ اسرائیلی اخبار "یدیعوت احرونوت" کے مطابق نیتن یاہو لیکوڈ کے سربراہ بننے سے پہلے اس کمپنی کے مالک سے مالی وسائل حاصل کرتا رہا ہے۔ سستائیٹک کمپنی کا صدر اولڈ لیف لیفیستال ہے جو نیتن یاہو حکومت میں خزانے کا وزیر تھا۔ اس کمپنی نے اقتصادی تنازعے کی بنا پر نیتن یاہو کے دنیا بھر میں سرمایہ کاری کے خفیہ راز فاش کر دیئے جس کے مطابق 35 ملین ڈالر ڈھائی سو امریکی شخصیات کے نام پر ان یہودیوں نے سرمایہ کاری کی جن میں بڑی تعداد امریکی سیاستدانوں کی ہے۔ ان لوگوں نے مختلف ناموں کے ساتھ غیر قانونی طور پر بنکوں کا اجراء کیا۔ ذرائع کے مطابق امریکی صدارت کے سابق امیدوار کولن پاؤل نے امریکی صدر کے انتخاب سے صرف اس لئے علیحدگی اختیار کی کہ ان کے خلاف الیکٹرونکس سے متعلق اقتصادی بے قاعدگیاں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو یہودی سرمایہ کاروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں جارج بش' سابق امریکی وزیر دفاع وائن برگر' امریکی ریاست کنساس کے دو وکیل سیس فوسٹر اور ہیلری کلنٹن (سابقہ امریکی خاتون اول) شامل ہیں۔ یہ دونوں امریکی کاروباری شخصیت کیپسن طیلفن کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔ ان اقتصادی موشگافیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ سستائیٹک کمپنی کا قیام نیشنل سیکورٹی ایجنسی NSA کے تحت عمل میں لایا گیا تا کہ اسرائیل سے باہر موجود بنکوں کی جاسوسی کی جا سکے۔ اب اس بات کا تعین مشکل ہے کہ اس کا قیام کمپنی کے مفادات کیلئے تھا یا کمپنی ڈائریکٹران کے مفادات کے لئے لیکن کمپنی کے نامہ نگار کے شدت سے انکار کے باوجود اس کا قیام ایک وکیل فوسٹر کے زیر اہتمام عمل میں آیا تا کہ غیر اسرائیلی بنکوں کی جاسوسی کی جا سکے اس سلسلے میں سابق امریکی صدر کلنٹن کی اہلیہ ہیلری کلنٹن بھی بہت سے الزامات کا سامنا کر چکی ہیں کیونکہ اس کمپنی کے ہی

وسائل سے زمین کا ایک بڑا رقبہ خریدا گیا تا کہ اس پر نیتن یا ہو اپنا دفتر قائم کر سکے۔ نیتن یا ہو کے حکومت میں آنے کے بعد اسرائیل کا سارا خارجی سسٹم تبدیل ہو گیا۔ ایرل شارون کو حکومت میں انتہائی احساس منصب سے نوازا گیا۔ اور یہ بات سب کے علم میں ہے کہ اس کے امریکی ایجنسی سے تعلقات کس نوعیت کے ہیں' اس کے علاوہ یاکوف نعمان کو وزیر عدل بنایا گیا۔ یہ شخص لندن میں قتل کے ایک مقدمے میں مطلوب تھا۔ فری مین ایزل کو اسرائیلی اقتصادیات پر مسلط کرتے ہوئے بنک آف اسرائیل کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا حالانکہ یہ شخص 1970ء سے 1991ء تک اسرائیل سے باہر رہا ہے۔

سابق اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یا ہو کا اس طرح عروج پر آنا امریکی اور یہودی عناصر کی ان کوششوں کو اجاگر کرتا ہے جو اسے حکومت میں لانے کے لئے کی گئیں۔ سیاسی منظر پر آنے سے پہلے نیتن یا ہو کے شاہ حسین سے تعلقات بھی طشت از بام ہو چکے ہیں' اسی لئے شاہ حسین نے القدس پر اسرائیلی تسلط کو خاموشی سے تسلیم کر رکھا تھا۔ شرق الاوسط میں کون فائدے اور کون خسارے میں ہے اس کا اندازہ لگانا اب زیادہ مشکل نہیں رہا۔

سی آئی اے اور انور سادات

سی آئی اے اور سابق مصری صدر جمال عبدالناصر کے درمیان تعلقات زیادہ دیر نہیں رہے تھے کیونکہ جمال عبدالناصر نے بعد میں اپنی پالیسی میں امریکہ کو اہمیت دینا چھوڑ دیا تھا بلکہ ایک مقام پر معاملہ دشمنی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ مگر جب انور سادات کرسی صدارت پر پہنچے تو یہ تعلقات ایک مرتبہ پھر استوار ہونا شروع ہو گئے۔ معاہدہ کیمپ ڈیوڈ اس کی بڑی مثال ہے اس کے فوراً بعد سی آئی اے نے صدر سادات کے محافظ دستے کو تربیت دینا تھی مگر اس کی آڑ میں وہ صدر سادات اور اس کے وزیروں کی جاسوسیاں کرتے تھے۔ 1981ء میں فوجی پریڈ کے دوران صدر سادات کا قتل بھی سی آئی اے کی نالائقی بتایا جاتا ہے کیونکہ قتل کے واقعہ کے بعد تک سی آئی اے نے اس حادثے کی تصدیق نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے قتل کی سازش کی پیشگی اطلاع تھی۔ سی آئی اے کو ایک لمبے عرصے تک اس بات کا خوف لاحق رہا کہ کہیں سادات کا قتل اس پر نہ ڈال دیا جائے۔

سی آئی اے اور معمر قذافی

ریگن حکومت کے دور میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی کا شمار قذافی کے بڑے دشمنوں میں ہوتا تھا۔ ایک موقعہ پر ولیم کیسی نے اپنے نائب روبرٹ جیٹس (جو بعد میں ولیم کیسی کی جگہ ڈائریکٹر بنا تھا) کو ہدایت کی کہ لیبیا پر امریکہ اور مصر کے مشترکہ حملے کا پروگرام وضع کیا جائے تاکہ شمالی افریقہ میں امریکی مفادات کا تحفظ کیا جاسکے مگر مصر کے انکار نے ولیم کیسی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اس کے بعد ولیم کیسی نے قذافی کو قتل کرنے کے منصوبے ترتیب دینے شروع کردیئے اس کام میں اسرائیلی موساد ولیم کیسی کی بھرپور اعانت کر رہی تھی۔ اس دوران برلن کی ایک بار میں دھماکے کی وجہ سے کئی امریکی فوجی ہلاک ہوگئے اس سازش کو قذافی کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے اپریل 1986ء میں امریکی طیاروں نے لیبیا پر بمباری شروع کردی۔ جس کے فوراً بعد سی آئی اے نے وائٹ ہاؤس پیغام بھیجا کہ قذافی اس حملے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ مگر قذافی زندہ تھے جس کے بعد کیسی نے کہا کہ ہم قذافی کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے مگر ہمیں افسوس بھی ہے کہ وہ قتل نہیں ہوئے.....!

سی آئی اے اور ڈاکٹر محمد مصدق

شرق الاوسط میں جتنا ایران سی آئی اے کا زخم خوردہ رہا ہے کوئی اور ملک اس کی مثال نہیں پیش کرسکتا۔ آج سے چالیس سال قبل سی آئی اے نے ایران میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا کیونکہ ڈاکٹر مصدق ایران میں امریکہ کے تیل کے مفادات کیلئے خطرہ بنتے جارہے تھے اس کے علاوہ ان کی سوویت یونین سے قربت بھی سی آئی اے کو بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹنے کے بعد سی آئی اے محمد رضا پہلوی کو اقتدار میں لے آئی جو علاقے میں امریکہ کا پولیس مین اور اسرائیل کا دوست تھا۔

ایرانی انقلاب کے بعد جب شاہ ایران کو اقتدار سے معزول کردیا گیا تو شاہ نے امریکی حکومت سے علاج کی غرض سے امریکہ منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر سی آئی اے نے تہران میں موجودہ امریکی یرغمالیوں کو نقصان پہنچنے کے احتمال کی وجہ سے امریکی حکومت کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ لبنان میں امریکی یرغمالیوں کو آزاد کرانے میں سی آئی اے نے ایران کے ساتھ تعاون کیا اور اسرائیل کے راستے ایران کو امریکی اسلحہ فراہم کیا مگر اس کے بعد دس سال تک دونوں ممالک کے تعلقات پھر کشیدہ ہوگئے۔

سی آئی اے اور ایرانی یہودی

ایران کا اسلامی انقلاب برپا ہو چکا تھا، تہران میں امریکی سفارتخانہ اور اس کے عملے کو انقلابیوں نے یرغمال بنالیا تھا امریکہ میں کارٹر انتظامیہ یعنی ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت تھی، امریکہ میں ہونے والے آئندہ انتخابات میں سی آئی اے نے در پردہ ری پبلکن پارٹی کو جتوانے کا منصوبہ ترتیب دیا ہوا تھا، امریکہ کے سابق صدر جارج بش سی آئی اے کے ڈائریکٹر رہ چکے تھے، تہران میں امریکی یرغمالی کی رہائی بالواسطہ طور پر کارٹر انتظامیہ کو انتخابات میں ہیرو بنا سکتی تھی جو سی آئی اے کو نامنظور تھا، کارٹر انتظامیہ ایرانیوں کے لئے بھی خاصی قابل نفرت تھی اس لئے وہ اس سے کسی قسم کے مذاکرات کے موڈ میں نہیں تھے، اسلامی ایران میں امریکیوں کے لئے وسیلہ معلومات صرف ایرانی یہودی تھے، موساد کے سابق افسر ''اری بن موشے'' نے اپنی کتاب **PROPHET OF WAR** میں امریکہ اور اسرائیل کے ایران سے متعلق دوہرے معیار سے پردہ اٹھایا ہے وہ کتاب میں رقم طراز ہے کہ جارج بش اور ایرانی نمائندوں کے درمیان پیرس میں ایک خفیہ ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے ایرانیوں کو یقین دلایا کہ امریکی بنکوں میں منجمد ایرانی اثاثے واپس کردئے جائیں گے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تک ریگن انتظامیہ وائٹ ہاؤس نہیں پہنچ جاتی اس وقت تک تہران میں یرغمالی امریکی قیدیوں کو رہا نہ کیا جائے ! تا کہ کارٹر انتظامیہ آئندہ انتخابات میں اس سے سیاسی فائدہ نہ اٹھا

سکے۔ یہ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد کارٹر انتظامیہ کے پاس امریکی یرغمالیوں کی رہائی کا صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا اور وہ تھا ''کمانڈو ایکشن''، مگر اس کمانڈو ایکشن کا کیا حشر ہوا دنیا اس سے واقف ہے امریکی کمانڈوز کو ذلت آمیز حالات کا سامنا کرنا پڑا امریکی عوام کی جانب سے کارٹر انتظامیہ کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا، بین الاقوامی سطح پر رسوائی اس کے علاوہ تھی۔ ذرائع کے مطابق امریکی کمانڈو ایکشن میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب خود سی آئی اے کی مخبری تھی جو انہوں نے ایرانی یہودیوں کے ذریعے انتظامیہ کو کی، ایرانی پہلے اسے امریکیوں کی کوئی چال سمجھے مگر جلد ہی ان پر معاملہ کھل گیا اور امریکیوں کی کم بختی آ گئی۔

بین الاقوامی سطح پر ایران میں اسرائیل کے لئے جاسوسی کرنے والے تیرہ ایرانی یہودیوں پر چلایا جانے والا مقدمہ اہم واقعہ تصور کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ایران پر بین الاقوامی دباؤ بھی بڑھایا گیا اور اسرائیل نے ایرانیوں پر الزام عائد کیا کہ نسلی تعصب سے متاثر ہو کر ان یہودیوں پر مقدمات قائم کئے گئے جبکہ ایرانی حکام کا کہنا تھا کہ ان یہودی جاسوسوں کا لیڈر حمید تیفلین اسرائیل کو معلومات مہیا کرنے کے جرم کا اعتراف کر چکا تھا۔ ایرانی حکام کے مطابق یہودی جاسوسوں کا سربراہ اس بات کا تفصیلی اعتراف کر چکا تھا کہ اس نے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کو ایران کی حساس معلومات مہیا کی ہیں یہ سب کچھ اس نے بھاری رقم اور اسرائیل کی محبت میں کیا، حمید تیفلین نے ایرانی ٹیلی ویژن پر اس بات کا اعتراف کیا کہ اسے اس سلسلے میں تربیت اسرائیل میں دی گئی تھی اور وہ اسرائیل کے لئے جاسوسی کرنے کا اعتراف کرتا ہے میری سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی سرگرمیوں کا تعلق اسرائیل کے لئے جاسوسی کرنے سے تھا۔ دوسری جانب وکیل صفائی اسماعیل ناصری نے کہا کہ ان کے مؤکل پر جاسوسی کا جرم ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کی سرگرمیاں جاسوسی کے زمرے میں نہیں آتیں۔ دوسرے ملزموں میں عبرانی زبان کے اساتذہ بھی شامل ہیں جن کا تعلق جنوبی شیراز سے ہے۔

اس سلسلے میں امریکی میڈیا اور اداروں نے بھی خاصا اہتمام کر رکھا تھا کیونکہ بات یہودیوں کی تھی اور امریکی میڈیا اور حکومت پر یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے باقاعدگی کے ساتھ ایران کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے اس سلسلے میں ییل یونیورسٹی امریکہ میں تاریخ کے استاد ڈاکٹر مائیکل رابن اور واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار مڈل ایسٹ کے ماہرین نے ایک

انٹرویو میں کہا تھا کہ ایران میں تقریباً پچیس ہزار یہودی آباد ہیں شرق الاوسط میں اسرائیل کے بعد یہ سب سے بڑی تعداد ہے ان پر جاسوسی کا الزام ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ انہوں نے مذہبی شعائر کے لئے یورپ کے راستے اسرائیل کا سفر اختیار کیا تھا۔ انہوں نے کہا ایک سال قبل ایرانی انتظامیہ نے شیراز اور اصفہان سے **13** یہودیوں کے علاوہ آٹھ مسلمان بھی گرفتار کر لئے۔ شروع میں ایرانی انتظامیہ نے گرفتاری کے اسباب ظاہر نہیں کئے مگر بعد میں الزام لگا دیا گیا کہ یہ لوگ جاسوس ہیں۔ ایران کے خلاف مغرب کی یہ بنیادی پالیسی ہے کہ اسے ہر مرحلے میں تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں وہ ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے بھی نہیں چوکتے۔ اس مقام پر آکر مغرب ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہوجاتا ہے، ایران ایک آزاد ملک ہے اپنی حفاظت اور داخلی امن کو برقرار رکھنے کے لئے وہ ہر قسم کے اقدامات کرنے کا حق رکھتا ہے امریکہ جہاں کالے اور دوسری نسلوں کے لوگوں سے بدترین زیادتی کی جاتی ہے سینکڑوں لوگوں کو نسلی بنیاد پر سڑکوں پر قتل کر دیا جاتا ہے بہت سے واقعات میں خود ان کی پولیس ملوث ہوتی ہے مگر امریکی حکام اس جانب توجہ نہیں دیتے مگر کسی بھی اسلامی ملک میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس واقعے نے ایران میں یہودیوں کے وجود کی بحث چھیڑ دی ہے۔ اس بحث کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایران میں یہودیوں کی تاریخ کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔

ایران میں یہودی تاریخ خاصی قدیم ہے کورش جسے قرآن کریم میں ذوالقرنین کہا گیا ہے کے دور کو یہودیوں کا سنہری دور کہا جاتا ہے جس میں یہودیوں کو بابل کی اسیری سے نجات دلائی گئی تھی، رضا شاہ کے دور میں یہودیوں کو خاص مراعات دی گئیں **1925**ء میں شہری قوانین کے تحت ایرانی یہودیوں کو ایسی سہولتیں میسر آگئیں جو صرف وہاں کے مسلمانوں کا حصہ تھیں اس سلسلے میں یہودیوں کے ''خارجی تعلقات'' نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد یہودی نہ صرف دوسرے حکومتی مناصب پر فائز ہونے لگے بلکہ فوج میں بھی انہوں نے بڑے بڑے منصب سنبھال لئے۔ انتخابات میں حصہ لینے کی انہیں کھلی چھٹی اور اجازت تھی۔

اسلامی جمہوریہ کے دور میں ایران میں اقلیتوں جن میں زرتشتی، یہودی اور عیسائیوں کی حدود متعین کی گئیں جس میں رہتے ہوئے انہیں ہر قسم کی مذہبی آزادی تھی اور اسلامی معاشرے

میں ہر قسم کی سہولیات سے فیض یاب ہوسکتے تھے مگر یہ سب کچھ اس شرط پر تھا کہ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جو مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے یا اسلامی جمہوریہ ایران میں اسلامی تعلیمات کے خلاف جاتا ہو۔

17ویں صدی میں ایران میں شاہ عباس اول اور شاہ عباس ثانی کے دور میں ایرانی یہودیوں کی سرگرمیوں میں خاصی تیزی آئی۔ اس دوران ان کی بڑی تعداد نے اسلام بھی قبول کیا اور بہت سے یہودی ہیکلوں کو یا تو آگ لگا دی گئی یا انہیں مساجد میں تبدیل کر دیا گیا اسی وجہ سے اسرائیل کے بعض مورخوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ شیعہ مسلمانوں کی نسبت اہل سنت مسلمان یہودیوں کے بارے میں زیادہ نرم گوشہ رکھتے ہیں۔'' اسرائیلی مورخ سیموئیل اٹینگر کے مطابق یہودیوں کی سرگرمیوں کے لئے خاصی قیود وضع کی گئی تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے مرکزی حکومت کے تحت خاصا اچھا وقت گذارا'' تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی حالات سے متاثر ہوکر ایران اور یمن میں بے شمار یہودی مسلمان ہوئے خاص طور پر صفویوں کے دور میں فرسولین شہر کے قریب تقریباً **300** یہودیوں کے دیہات مسلمان ہوگئے انہیں ''نئے مسلمان'' کا نام دیا گیا، ہوسکتا ہے کہ یہودیوں میں یہ احساس ہو کہ اس طرح رہ کر وہ ملکی معاشرے سے کٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ مساوی حقوق سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے جبکہ ان کی بڑی تعداد یورپ اور امریکہ میں آباد یہودیوں سے زیادہ قریب تھی اسی لئے اکثریت نے صرف نام تبدیل کئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایران میں یہودیوں کی وجہ سے خارجی عناصر نے مداخلت شروع کی اور صیہونی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اس سلسلے میں تہران کے یہودیوں کو مرکز بنایا گیا کیونکہ ان کی اقتصادی حالت بہت بہتر تھی، اسی طرح عراق سے خاصے متمول یہودی ہجرت کر کے تہران آگئے مگر انہوں نے اپنے آپ کو ایرانی یہودیوں سے الگ رکھا بلکہ اپنی روایات، زبان اور دینی شعائر تقالید کی حفاظت کی اس سلسلے میں انہوں نے اپنے الگ تعلیمی مراکز قائم کئے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے تک ایرانی یہودی اقتصادی بحالی کے پروگرام پر عمل کرتے رہے تاکہ ان کی ایران میں معاشی حالت عام ایرانیوں سے بھی بہتر ہوسکے۔ **70** کی دہائی کے دوران اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوچکے تھے **1975**ء میں تہران میں

12 ارب پتی یہودیوں کے وجود کا پتا چلتا ہے اس دور میں ایرانی یہودی انتہائی خوشحالی کے دور مین داخل ہو چکے تھے ایران کی پندرہ بڑی صنعتوں کے مالک یہودی تھے ان کا شمار ایران کے ایک ہزار متمول خاندانوں میں ہوتا تھا جو ایران کی اقتصادیات پر چھائے ہوئے تھے۔ 1979ء کے بعد احتساب کا عمل شروع ہوا تو ان خاندانوں پر بھی عتاب نازل ہوا اور ان میں سے کئی یہودی جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ انقلاب کے بعد یہودیوں کی ایک تنظیم منظر عام پر آئی جس کا نام ''جیوش لٹریری آرگنائزیشن'' تھا اس تنظیم نے بظاہر فلسطینیوں کی جدوجہد کی حمایت کر رکھی تھی اور صیہونیت کی مذمت کرتی تھی اس کے تھوڑے عرصے کے بعد یہودیوں کی ایک اور تنظیم منظر عام پر آتی ہے جس کا نام ''جیوش آرگنائزیشن تہران'' تھا اس تنظیم نے اسلامی حکومت کی حمایت کر رکھی تھی! اس تنظیم کی جانب سے 1986ء میں صابرہ وشتیلا کے قتل عام کی مذمت کی گئی تھی مگر اس کے باوجود یہودیوں کی سیاسی سرگرمیاں محدود رہیں اور ایران کی سیاست میں کوئی خاص اثر نہ چھوڑ سکے حالانکہ شاہ ایران کے زمانے میں جب تہران اور تل ابیب خاصے قریب تھے تو یہی یہودی ان تعلقات میں کلیدی کردار ادا کرتے تھے۔

اسلامی ممالک میں صیہونی سرگرمیاں خاص طور پر ایران میں تین مراحل میں منقسم ہیں انفرادی مرحلہ، اعلانیہ مرحلہ اور خفیہ مرحلہ، ایران میں پہلی قسم کی سرگرمیاں تو اتنی نمایاں طور پر نظر نہیں آتیں مگر دوسرے مرحلے میں ایرانی یہودی خاصے سرگرم رہتے ہیں 1917ء میں ''صیہونی اتحاد برائے ایرانی یہودی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی، عبرانی زبان کی تدریس کے لئے سنٹر قائم کیا گیا ایک اخبار ''شالوم'' کا اجراء ہوا، اس تنظیم کے تحت 1919ء میں تہران میں ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی اس کانفرنس میں تمام دنیا سے یہودیوں کی فلاح کے لئے خاصا سرمایہ اکٹھا کیا گیا تھا اس کانفرنس کا بڑا مقصد مقبوضہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے زمینیں خریدنا بھی تھا۔

تیسرا مرحلہ (خفیہ مرحلہ) 1921 میں رضا خان کے عہد میں شروع ہوتا ہے کیونکہ اس دور میں ایرانی حکام کی جانب سے صیہونی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی، ان کا اخبار بھی بند کر دیا گیا اور ایرانی یہویوں کو مقبوضہ فلسطین کی طرف ہجرت کرنے سے روک دیا گیا۔

1941ء میں اتحادیوں کی ایران پر یلغار کے بعد ایک مرتبہ پھر یہودیون کو بھر پور

سرگرمیاں جاری کرنے کی اجازت مل گئی، اس طرح ایران میں یہودیوں کے سنہرے دن ایک بار پھر لوٹ آئے اس دور میں یہودی خبر رساں ایجنسی کو تہران میں اپنا دفتر کھولنے کی اجازت بھی مل گئی جس کی وجہ سے ایرانی یہودیوں کی سرگرمیوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ستر کی دہائی کے دوران ایرانی یہودیوں کی دولت اور معاشرتی حالات انتہائی عروج پر پہنچ چکے تھے۔ مگر 1979ء میں انقلاب کے بعد ان کی تمام سرگرمیاں موقوف ہو گئیں اسرائیل کے ساتھ ان کے تمام روابط ختم کر دے گئے۔

فلسطین کی جانب ایرانی یہودیوں کی ہجرت پانچ مراحل میں تقسیم ہے اس میں انفرادی ہجرت 1812ء۔1880ء کے دوران ہوئی، بڑی تعداد میں ہجرت 1881ء۔1914ء میں ہوئی، غیر قانونی ہجرت 1915ء۔1948ء کے دوران ہوئی، جماعتوں کی شکل میں ہجرت 1949ء۔1952ء میں ہوئی اس کے بعد 1953 سے لیکر 1997ء تک یہودی موقع کی مناسبت سے ایران سے باہر جاتے رہے، اس کے علاوہ ایران یہودی ہجرت کے دوران ایک راستے کا کام بھی دیتا رہا بہت سی عرب ریاستوں سے یہودی پہلے یہاں آتے اس کے بعد یہاں سے اسرائیل منتقل ہوئے اسی طرح دوسری عالمگیر جنگ کے دوران مشرقی یورپ سے یہودیوں نے پہلے یہاں قیام کیا تھا اسرائیل کے قیام کے بعد وہ وہاں منتقل ہو گئے۔

ان ہجرتوں کے دوران یہودیوں کو اقتصادی سطح پر خاصا نقصان بھی اٹھانا پڑا مگر ایرانی یہودی دوسری دنیا کے یہودیوں کے مقابلے میں خاصے منظم تھے مثلاً 1917ء کے بعد فلسطین کی جانب یہودیوں کی بڑی تعداد نے ہجرت کی ان کی اکثریت مقبوضہ القدس میں قیام پذیر ہونا چاہتی تھی جس کی وجہ سے یہاں خاصے مسائل پیدا ہوئے جس کی وجہ سے یہاں کے یہودیوں نے مصر کی راہ لی ان میں سے زیادہ تر یہودی روس اور فرانس سے آئے ہوئے تھے جس کی وجہ سے یہاں بھی خاصے مسائل پیدا ہو گئے اس لئے مصر پر قابض اس وقت کی انگریز حکومت نے ان مسائل کے حل کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جس کے ارکان میں 51 ایرانی یہودی شامل تھے۔

ایرانی یہودیوں کی اسرائیل کی جانب ہجرت میں ایرانی بہائیوں نے خاصا کلیدی کردار ادا کیا تھا انہیں صیہونیت کا معاون بھی کہا جاتا ہے جس زمانے میں ایرانی یہودی غیر قانونی طور پر اسرائیل فرار ہو رہے تھے اس دور میں بہائیوں نے ان کی بڑی مدد کی، اس زمانے میں تقریبا

چالیس ہزار یہودیوں نے اسرائیل ہجرت کی تھی ان میں سے نصف یمن سے تعلق رکھتے تھے باقیوں کا تعلق کردستان، افغانستان، عراق اور ایران سے تھا انگریز حکومت کی جانب سے مقبوضہ فلسطین میں تعینات یہودی مندوب ہربرٹ سیموئیل نے اس سلسلے میں خاصی سرگرمی دکھائی تھی۔

اجتماعی ہجرت کے دوران تقریباً ایک لاکھ یہودی عراق اور کردستان سے اسرائیل پہنچے، 55 ہزار یمن سے اور 22 ہزار افغانستان اور ایران سے اسرائیل میں آباد ہوئے۔ 1994ء میں اسرائیل میں آباد ایرانی یہودیوں کی تعداد ایک لاکھ پینتیس ہزار تھی اس طرح وہ اسرائیل میں آباد یہودیوں کا تین فیصد ہیں ان کی بڑی تعداد مقبوضہ القدس، حیفا، تل ابیب اور بئر السبع میں آباد ہے۔ 1949ء سے 1969ء کے دوران اسرائیلی پارلیمنٹ ''کنیست'' میں ایک ایرانی یہودی زیر مردخائی نمائندہ تھا اس کے بعد ایک اور ایرانی یہودی ''افرائیم شالوم'' ممبر پارلیمنٹ بنا۔

اسرائیل میں جس ایرانی نژاد یہودی نے سب سے بڑا منصب حاصل کیا وہ موشے کتساف ہے جس نے اسرائیل کے صدر کے طور پر خدمات انجام دی تھیں یہ 1945ء میں ایران میں پیدا ہوا اور مقبوضہ القدس کی ہیبرو یونیورسٹی کا فارغ التحصیل، تین مرتبہ اسرائیل کا وزیر بنا ایک مرتبہ نائب وزیراعظم بھی رہا اس کے علاوہ اسرائیل کے اخبار یدیعوت احرونوت میں کالم نگاری بھی کرتا رہا۔

انقلاب سے پہلے تک ایران اسرائیل تعلقات خاصے مضبوط تصور کئے جاتے تھے، 1967ء میں اسرائیل کے لئے ایرانی تیل کی سپلائی کا معاہدہ عمل میں آیا تھا، اسی طرح اسرائیل کے راستے بحیرہ روم اور پھر وہاں سے مغربی یورپ اور امریکہ تک ایرانی تیل کی سپلائی کا انتظام کیا گیا تھا، 1978ء تک ایران کے لئے اسرائیلی برامدات کا تخمینہ 300 ملین ڈالر تھا جبکہ اس وقت تک متعدد اسرائیلی شخصیات نے ایران کے دورے بھی کئے ان میں لیوی اشکول، گولڈا میئر، اسحاق رابن اور بیگن شامل ہیں۔

مغربی ذرائع اور میڈیا کے مطابق'' 1986ء کے آخر میں ایران نے 30 ہزار ایرانی یہودیوں کو ترکی کے راستے اسرائیل جانے کی اجازت دی اور اس کے بدلے اسرائیلی اسلحہ

حاصل کیا گیا۔ کیونکہ ایران اس وقت عراق کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا، اس وقت کے اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے اہم ایرانی رہنماؤں سے بھی ملاقات کی'' ایک اہم برطانوی اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''ایران نے جنگی جہاز ''فینٹم'' کے ذریعے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کی 100 عدد فضائی تصاویر حاصل کیں جس سے بعد ازاں عراق کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور اسرائیل کو عراق کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کرنے میں کامیابی ملی''

سی آئی اے اور پی ایل او تعاون کے تیس سال

2001ء میں سی آئی اے کے شعبہ شرق الاوسط کے سابق ڈائریکٹر فرینک اینڈرسن نے انکشاف کیا کہ تنظیم آزادی فلسطین اور سی آئی اے کے درمیان تعلقات کی ابتداء باقاعدہ طور پر **1969**ء میں ہوئی تھی۔ اس چونکا دینے والے انکشاف نے شرق الاوسط کے امور کے ماہرین کے دماغوں سے یہ بات بڑی حد تک صاف کردی کہ میری لینڈ سمجھوتے کے بعد ہی سی آئی اے کو فلسطینی سرزمین پر قدم جمانے کا موقع نہیں ملا بلکہ یہ عمل گزشتہ تیس سالوں پر محیط ہے۔

فرینک اینڈرسن کا شمار اسرائیل اور اس کی خفیہ ایجنسی موساد کے سابق اور حالیہ اراکین کے نزدیک ''محترم ترین امریکیوں'' میں ہوتا ہے جس نے شرق الاوسط میں امریکی مفادات اور اس کی منظور نظر شخصیات کے موضوع پر کتاب تالیف کی۔ اینڈرسن کے مطابق سی آئی اے اور تنظیم آزادئ فلسطین کے درمیان تعلقات **1969**ء میں اس وقت استوار ہوئے جب تنظیم کی جارحانہ پالیسیوں سے زچ ہوکر اس وقت کے سی آئی اے ڈائریکٹر رچرڈ ہومز کو امریکی صدر نکسن کا یہ پیغام موصول ہوا کہ ''علاقے میں جس طرح بھی ہو سکے اپنا اثر و رسوخ بڑھایا جائے اس سلسلے میں جو کچھ میں کہوں اس پر سختی سے عمل کیا جائے'' اس حکم نامے کی روشنی میں ہی بیروت میں سی آئی اے کے ایریا ڈائریکٹر روبرٹ ایمز نے پی ایل او کے نمائندہ علی سلامہ سے ملاقات کی علی سلامہ پی ایم او کی ذیلی شاخ ''فورس **17**'' کا سربراہ تھا اینڈرسن کے

مطابق **1970**ء تک ان خفیہ تعلقات کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا۔ **1973**ء میں ان تعلقات کی تجدید کے لئے مزید بات کی گئی اور یوں نومبر **1974**ء میں سی آئی اے کی جانب سے روبرٹ ایمز اور پی ایل او کی جانب سے علی سلامہ نے معاہدے پر باقاعدہ دستخط کئے جس کے مطابق پی ایل او امریکیوں کے خلاف کسی بھی قسم کی ''تخریبی کاروائیوں'' سے پرہیز کرے گی جس کے جواب میں امریکہ یاسرعرفات کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کی اجازت دے گا اینڈرسن کے مطابق معاہدے پر دستخط نیویارک کے ولڈروت استوریا ہوٹل میں گئے تھے۔

1979ء میں اسرائیلیوں نے علی سلامہ کو قتل کردیا اس پر الزام تھا کہ وہ میونخ اولمپکس کے دوران اسرائیلی کھلاڑیوں کے قتل میں ملوث ہے۔ علی سلامہ قتل کے وقت امریکہ میں تھا سی آئی اے کی دعوت پر وہاں بلایا گیا تھا علی سلامہ نے وہاں شادی بھی کی اور سی آئی اے کے خرچے پر جزائر ہوائی بھی گیا مگر اسکے اچانک قتل نے پی ایل او کو اور غضب ناک کردیا۔ پی ایل او اور سی آئی اے درمیان تعلقات کی یہ سردمہری **1982**ء تک قائم رہی فرینک اینڈرسن کے مطابق یاسرعرفات کا خیال تھا ''امریکیوں کے ساتھ تعلقات کی یہ نوعیت اسے اسرائیل کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا سکتی ہے مگر علی سلامہ کے قتل نے یاسرعرفات کو خود اپنی زندگی کے بارے میں خوفزدہ کردیا'' اینڈرسن کے مطابق سی آئی اے یاسرعرفات کو ہمیشہ اس کے قتل کی سازش سے متعلق قبل از وقت آگاہ کرتی رہی مگر عرفات اور پی ایل اس کے صلے میں سی آئی اے کے لئے کچھ نہ کرسکے.....

فرینک اینڈرسن کے مطابق دونوں جانب خفیہ تعلقات کی نوعیت ''دہشت گردی'' کی وارداتوں کی روک تھام کے لئے تھی مگر اس نے اس کی تفصیلات بتانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''میں اس وقت ان تعلقات کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کرسکتا کیونکہ یہ دونوں جانب کے مفادات کے خلاف ہوگا مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ **70**ء کی دہائی میں یہ تعلقات انتہائی مضبوط تھے اور پی ایل او اس دوران سی آئی اے کو ''معلومات'' فراہم کرتی تھی۔ اینڈرسن مزید انکشاف کرتا ہے کہ **1975-76**ء میں لبنان کی خانہ جنگی کے دوران پی ایل او نے بیروت میں امریکی سفارت خانے' سفارتکاروں اور امریکی شہریوں کی حفاظت کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں اس کے علاوہ روم اور زائرے میں امریکی سفارتخانوں کے خلاف ''دہشت گردی'' کو

روکنے میں پی ایل او نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ 1989ء میں تہران میں امریکی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کا تیسرا مشن امریکی صدر کارٹر نے یاسر عرفات کو سونپا تھا اس سے پہلے ان آٹھ امریکی فوجیوں کی لاشوں کو بھی یاسر عرفات ہی کی مدد سے واپس لایا جا سکا تھا جو ایران میں یرغمالیوں کو چھڑانے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔

فرینک اینڈرسن کے چونکا دینے والے انکشافات میں سب سے اہم انکشاف یاسر عرفات کی اسرائیلیوں کے ہاتھوں جان بخشی ہے۔ 70ء کی دہائی کے وسط میں اسرائیلی وزیر خارجہ ایرل شیرون کو اطلاع ملی کہ یاسر عرفات لبنان میں موساد کی زد میں ہے اور اسے کسی وقت بھی قتل کیا جا سکتا ہے، شیرون نے فوراً اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناحیم بیگن کو اطلاع دی مگر بیگن نے فوراً حکم دیا کہ عرفات کو قتل نہ کیا جائے اس کا وجود ضروری ہے۔

ان تمام حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شرق الاوسط میں امن کا قیام فلسطینی اتھارٹی کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ امریکہ اور اسرائیل کے مفادات کی قیمت پر عمل میں آئے گا وہ یاسر عرفات جو تیس سال تک سی آئی اے کی نظر التفات تلے اسرائیل سے جان بچاتا رہا ہو کیسے فلسطینی عوام کے حقیقی مسائل عالمی سطح پر اجاگر کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ قیام امن کے تمام نام نہاد معاہدے و منصوبوں کے باوجود علاقے کی صورتحال روز بروز بگڑتی جا رہی ہے۔ پی ایل او جو کبھی اسرائیل کے خلاف مظلوم فلسطینیوں کا ہتھیار تصور کی جاتی تھی اب بڑی طاقتوں نے اسے ''فلسطینی اتھارٹی'' کی شکل میں تبدیل کر کے خود فلسطینیوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔!

ریڈ مرکری 20/20 کے حصول کے لئے

اسرائیل نے قتل عام کا بازار گرم کیا

نومبر 1991ء میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں دو سیاہ فام نوجوانوں نے سفید رنگ کی BMW-7281 کار چرائی اور اسے جوہانسبرگ کے مضافاتی علاقے سویٹو لے گئے۔ یہ جگہ سیاہ فام لوگوں کی اکثریت کا علاقہ تصور کیا جاتا ہے یہاں پہنچ کر ان سیاہ فام نوجوانوں نے کار کی تلاشی لی تو ڈگی میں سے ایک سفید فام شخص کی لاش برآمد ہوئی جو صفائی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ لاش کے ٹکڑوں پر سیاہ رنگ کا محلول چڑھا ہوا تھا۔ لاش کو دیکھ کر سیاہ فام نوجوان خوفزدہ ہو کر بھاگنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں کا جرم صرف کار چرانے کی حد تک ہے، قتل سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق کیمیائی تجزیئے کے بعد معلوم ہوا کہ لاش کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا محلول ''پارہ'' تھا۔

کار سے برآمد ہونے والی لاش کے ٹکڑے 48 سالہ برطانوی کیمیکل انجینئر ایلن کیڈ کر کے تھے جو جنوبی افریقہ میں برطانوی کیمیکل کمپنی ''ثور'' کی شاخ کا ڈائریکٹر تھا۔ اس قتل کی ابتدائی تحقیقات کے بعد کیس بریکسٹون پولیس کے تجربہ کار انسپکٹر چارلس لیڈمان کے سپرد کر دیا گیا جو مجرموں تک پہنچنے کی خاص شہرت رکھتا تھا۔ چارلیس لیڈمان نے تحقیقات جلد از جلد مکمل

کر کے کیس وقتی طور پر بند کر دیا کیونکہ اس وقت جنوبی افریقہ نسل پرست حکومت کے شکنجے سے نکل رہا تھا پورے ملک میں احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے چونکہ اس کیس کے دوران اہم انکشافات ہوئے تھے اس لئے چارلس لیڈمان نے اس وقت اس قتل کے محرکات کو اچھالنا مناسب نہ سمجھا۔ چند ماہ بعد انتخابات کے نتیجے میں حکومت نیلسن منڈیلا کے پاس آئی تو چارلس لیڈمان نے ارادہ کیا کہ اب ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکنا مناسب ہوگا۔ یوں 25 جون 1994ء کو جنوبی افریقہ کے بڑے روزنامہ **The Star** کی سب سے بڑی سرخی تھی۔

’’اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے قتل کے نئے طریقے ایجاد کر لئے‘‘ چارلس لیڈمان نے اخبار کو رپورٹ دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ ’’برطانوی انجینئر ایلن کیڈکر کو موساد نے قتل کروایا تھا کیونکہ موساد کو یقین ہو گیا تھا کہ برطانوی کمپنی ’’ٹور‘‘ شرق الاوسط کے عرب ممالک کو کثیر تعداد میں ایسا مادہ فراہم کر رہی ہے ایٹم بم کی تیاری میں کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ قتل دراصل موساد کی جانب سے ان کمپنیوں کو بھی دھمکی تھی جو عرب ممالک کے ساتھ تعاون کر رہی تھیں۔ اس ساری تحقیقات میں جنوبی افریقہ کے پولیس انسپکٹر چارلس لیڈمان نے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی پر الزام عائد کیا کہ موساد تمام دنیا میں اسلحہ اور کیمیاوی اشیاء بنانے والی ان کمپنیوں کے اراکین کو قتل کروا رہی ہے جو کسی بھی طرح مرکری 20/20 کے حصول کے لئے بھی کوشاں ہیں۔ اس مادے کے متعلق روسی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اسے ایٹمی ہتھیاروں میں استعمال کرنے کے لئے ترقی دی ہے جو دنیا کے بڑے حصے کو تباہی سے دوچار کر کے باقی ماندہ کو منجمد کر دے گا.........!‘‘ اس چونکا دینے والے انکشاف کے بعد تحقیقات کا سلسلہ جنوبی افریقہ سے نکل کر یورپ اور سائبیریا تک جا پہنچا۔ شمال مغربی یورپ میں اسکاٹ لینڈ کے مغربی کنارے پر رہائش پذیر محقق اور صحافی پیٹر ہانوم نے سنڈے ٹائمز میں کام کے دوران پانچ سال صرف ریڈ مرکری 20/20 کی تحقیق پر صرف کئے تھے۔ پیٹر ہانوم نے اسی تحقیق سے متعلق سائبیریا (روس) سے لے کر جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) تک کا سفر کیا تھا۔ پیٹر ہانوم نے جنوبی افریقہ کے پولیس انسپکٹر چارلس لیڈمن کے موساد پر الزامات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود اس سلسلے میں موساد کے ایک رکن کا سامنا کر چکا ہے جس نے ریڈ مرکری 20/20 کا نمونہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ پیٹر ہانوم کے مطابق وہ اپنی سابقہ صحافتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں برطانوی ٹیلی ویژن

کے نمائندے گوین روبٹس کے ساتھ نومیا میں ریڈ مرکری 20/20 (سرخ پارہ) کے نمونے کے معائنے کے لئے پہنچا جس ہوٹل میں انہوں نے قیام کیا تھا وہاں جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی **NIS** کا رکن ان کے کمرے میں داخل ہوا ان کے اطمینان کے لئے اس نے اپنا ریوالور ان کے سامنے خالی کر کے رکھ دیا اور انہیں خبردار کیا کہ ’’وہ دونوں پہلی فلائٹ سے واپس چلے جائیں کیونکہ حزب اللہ کے مطابق ریڈ مرکری 20/20 کا اعلیٰ نمونہ پیٹر ہانوم کے پاس ہے اس لئے انہوں نے یہ نمونہ حاصل کرنے کے لئے جوہانسبرگ میں پیٹر کو قتل کرنے اور یہ مادہ حاصل کرنے کے لئے قاتلوں کو معاوضہ بھی دے دیا ہے۔ بعد میں جب پیٹر کے ساتھی گوین روبٹس سے اس واقع کی تصدیق کی گئی تو اس نے مزید حیرت انگیز انکشافات کئے جس کی بنیاد پر لندن میں مقیم عرب صحافی یسری فودہ نے مزید تحقیقات کا بیڑا اٹھایا جس کی تحقیقات نے اس حیرت انگیز معمہ کو بڑی حد تک سلجھا دیا۔ اس سلسلے میں یسری فودہ نے سب سے پہلے مصر کا رخ اختیار کیا قاہرہ کے اخبارات نے ریڈ مرکری کے بارے میں تفصیلات شائع کرنا شروع کر دی تھیں جن کے مطابق یہ مادہ قدیم زمانے میں فرعونوں کی لاشوں کو حنوط کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا بلکہ ایک مصری سائنسدان نے یہاں تک دعویٰ کر دیا تھا کہ ایک گرام ریڈ مرکری 20/20 سے پورے اسرائیل کو تباہ کیا جا سکتا ہے....... مصری آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر زاہی حواس نے اس نظریئے سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا ان کے مطابق قدیم حکماء لاشوں کو حنوط کرنے کے عمل سے پوری طرح واقف تھے ماسوائے اس مادے کے جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ مصری سائنسدانوں کے مطابق مرکری (پارہ) دو قسم کا ہوتا ہے ایک کو وائٹ مرکری کہا جاتا ہے۔ یہ [illegible] میں سرد ہوتا ہے جبکہ ریڈ مرکری 20/20 انتہائی گرم ہوتا ہے اسے اسلحے کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق اس کا رنگ ہرن کے خون کی مانند گہرا سرخ ہوتا ہے اسے چھونے والے کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے اور اگر کوئی اسے منہ میں ڈال لے تو شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔

مصری اٹامک انرجی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر فوزی حماد کے مطابق یہ مادہ ابھی تک اپنی سائنسی قوت ظاہر نہیں کر سکا۔ ممکن ہے یہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے مگر ابھی تک یہ صرف نظر کا دھوکہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ ....‘‘ مگر برطانوی صحافی گوین روبٹس

کے مطابق سابق روسی وزیراعظم پریماکوف جب روسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے اس وقت انہوں نے اس مادے کی تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں۔ سابق سوویت یونین کے زمانے میں اسے مکمل طور پر اچھالانہیں گیا تھا بلکہ سوویت یونین کے تمام سائنسدان بھی اس سے واقف نہیں تھے۔ اس مادے کی پیداوار کا آغاز 1968ء میں ''ڈوبنا'' کی ایٹمی تجربہ گاہ میں ہوا تھا۔ جس کے متعلق صرف کیمیاوی سائنسدان ہی جانتے تھے اس مادے کا فارمولہ Hg1sb207 ہے یہ مادہ ایک مکعب سنٹی میٹر میں ۲۳ گرام آتا ہے یورپین سائنسدانوں کے مطابق انتہائی درجہ حرارت پر جب اس میں بلبلے بننا شروع ہو جائیں تو یہ دنیا کے خالص ترین معدنی مادے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت اور یہ مادہ ایک مکعب سنٹی میٹر میں 13.6 گرام کم تک آجاتا ہے۔ اس وقت خالص ترین پلاٹینیم بھی اس سے ۲۰ گرام کم ہوتی ہے۔ اس مادے کو سائنسی بنیادوں پر سب سے پہلے سابق سوویت یونین میں انتہائی خفیہ انداز میں بنایا گیا تھا۔

سوویت یونین کی تحلیل کے بعد وہاں سے عسکری نوعیت کی بے شمار چیزیں باہر کی دنیا میں غیر قانونی طور پر سمگل کی گئیں۔ انہی میں ریڈ مرکری 20/20 کا خطرناک مادہ بھی شامل تھا سوویت یونین سے یہ مادہ آسٹریا پھر یہاں سے سوئزرلینڈ اور رومانیہ پہنچایا گیا یہاں سے خاص مقدار میں اٹلی سمگل کرنے کی کوشش کی گئی مگر اٹلی کی خفیہ پولیس نے سمگلنگ کرنے والے افراد کو روم میں گرفتار کر لیا۔ تفتیش کرنے کے بعد ان ملزمان نے جج کے سامنے اعتراف کیا کہ دنیا کے کئی ممالک جن میں لیبیا' ایران' عراق' اسرائیل اور جنوبی افریقہ شامل ہیں اس مادے کے حصول میں کوشاں ہیں یہاں تک کہ امریکہ بھی اس خطرناک ترین مادے کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

سوویت یونین کی تحلیل کے پندرہ ماہ بعد بورس یلسن کرسی صدارت پر براجمان ہو چکے تھے مگر روس سے باہر اسلحہ سمگل کرنے والا مافیا ابھی تک متحرک تھا۔ اس سلسلے میں کریملن میں تحقیقات کی گئیں تو خفیہ ایجنسی کی دستاویزات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ سوویت یونین سے باہر غیر قانونی طور پر بھیجی جانے والی عسکری چیزوں میں ریڈ مرکری بھی شامل ہے۔ روسی پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے دفاعی امور کے ایک رکن نے انکشاف کیا کہ روسی خفیہ ایجنسی کے جی بی نے روسی صدر کو ریڈ مرکری کے وجود سے انکار کرنے کے لئے کہا تھا جبکہ روس سے باہر

سمگل ہونے والی اشیاء کی جو لسٹ پیش کی گئی تھی اس میں روایتی بموں کے دھماکوں کی آواز سے بچانے والے آلات، ایٹمی دھماکوں کے دوران استعمال ہونے والے آلات' رات کو نگرانی کرنے والے راڈار، ایٹمی ہتھیار لے جانے والے میزائلوں کے حصے شامل تھے۔

فروری 1992ء میں روسی صدر بورس نے خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کو اپنے دستخطوں کے ساتھ ایوان زیریں میں پیش کیا۔ یہ رپورٹ روس سے باہر سمگل ہونے والے روسی اسلحے سے متعلق تھی جس میں ریڈ مرکری کا ذکر نہیں تھا۔ یہ سارا کام دانستہ کیا گیا تھا بلکہ روسی صدر نے ریڈ مرکری تیار کرنے والی کمپنی کو اجازت دے دی کہ وہ اس مادے کا نام بدل کر بروماکولوجی کے طور پر متعارف کرائیں۔ کمپنی کے مطابق اس طرح اس مادے کی سالانہ پیداوار سے ساڑھے تین بلین ڈالر کمائے جا سکتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد کمپنی کے ڈائریکٹر اولیغ صاریکوف نے ایک ٹی وی چینل میں تفصیلات بتاتے ہوئے ریڈ مرکری 20/20 کا نام ہی بدل دیا حالانکہ ایک شیشے کی ٹیوب میں ریڈ مرکری کا نمونہ ڈال کر اس نے کیمرے کے سامنے پیش کیا تھا جہاں وہ گوندھی ہوئی مٹی کی طرح موجود تھا۔ ''صادیکوف'' نے اس کے متعلق بتایا کہ ابھی اسے ایک کیمیائی عمل سے گزرنا ہے اس کے بعد یہ اپنی اصل شکل میں آئے گا۔ اسے ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے انجکشن کی شکل کی ایک ٹیوب پکڑی جس میں گہرے سرخ رنگ کا مادہ تھا۔ اس کے بارے میں اس نے بتایا کہ یہ ریڈ مرکری 20/20 ہے۔ لندن میں مقیم عرب صحافی یسری فودہ نے اس سلسلے میں روس کا سفر اختیار کیا جہاں ایک روسی سائنسدان نے اپنا نام ظاہر کئے بغیر یہ انکشاف کیا کہ ریڈ مرکری 20/20 افزودہ یورینیم اور پلاٹینیم سے کہیں زیادہ سستی ہے جبکہ ہلاکت خیزی میں ان دونوں سے زیادہ خطرناک..... روسی سائنسدان کے مطابق بہت جلد مغرب کے ایٹمی شعبے میں انقلاب آ جائے گا......!''

جنوبی برطانیہ کے شہر ہمپشائر میں مقیم برطانوی سائنسدان فرینک بارنی جس نے 50 کی دہائی میں برطانوی ایٹم بم بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک ایسا پوڈر رکھتا ہے جو اوکسائیڈ مرکری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی کثافتی شکل کو روسیوں نے ریڈ مرکری 20/20 کا نام دیا تھا۔ فرینک بارنی کے پاس اوکسائیڈ مرکری کو تین مختلف مراحل سے گزار کر خطرناک شکل دے کر ایٹمی ہتھیاروں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جس کی تباہ کاری یورینیم یا پلاٹینیم کے بموں سے زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہے۔

برطانوی ٹی وی نمائندے گوین رابٹس نے جس پر ایران نے الزام عائد کیا تھا کہ وہ برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی۔6 کے لئے کام کرتا ہے ابتدائی تحقیق کے بعد اس نے بھی دعویٰ کیا کہ جنوبی افریقہ موساد کی سرگرمیوں کا مرکز بنتا جارہا ہے۔ اپنی تحقیق کے سلسلے میں یسری فودہ کی ملاقات سب سے پہلے جنوبی افریقہ کی اسلحہ ساز کمپنیوں کے سابق ایجنٹ ''ارمسکور'' سے ہوئی نسل پرست حکومت کے دور میں اسے فرانکو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ارمسکور کے مطابق اسے اسی کی دہائی میں ریڈ مرکری 20/20 مادہ اوزمیوم 187' مادہ ادیبڈیوم اور مادہ کالیفورنیوم کی تحقیق پر مامور کیا گیا تھا یہ کام ارمسکور نے یورپین عسکری ماہرین کی معاونت سے تکمیل کو پہنچایا تھا۔ یسری فودہ نے جب معلومات کیلئے برطانیہ' اٹلی اور جرمنی میں ٹیلی فون پر رابطے کئے تو ایک اسرائیلی جنرل کی طرف سے اسے جنوبی افریقہ میں تنبیہہ کی گئی کہ یہ ایک خطرناک مادہ ہے اور اسے چاہئے کہ اس سے دور رہے۔ اسرائیل کی اس معمولی دھمکی کے باوجود یسری فودہ نے تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ریڈ مرکری 20/20 کی شکل کمال کو ''شیمپو'' کا کوڈ نام دیا گیا ہے ان سے پہلے اسے ''صاف بم'' کا کوڈ دیا گیا تھا اس کی تکنیکی معلومات امریکہ' برطانیہ' فرانس اور اٹلی سے موصول ہوسکتی تھیں اس لئے اسرائیلیوں نے سٹوڈنٹ پاسپورٹ پر موساد کے کم عمر ایجنٹ ان ممالک کی سائنسی لیبارٹریوں میں داخل کر دیئے تھے۔ جنہوں نے اس ٹیکنالوجی سے متعلق موساد کو باخبر کرنا شروع کر دیا تھا ان ہی کی اطلاع پر ایلین کیڈ کر کو جنوبی افریقہ میں قتل کیا گیا جو برطانوی کیمیکل کمپنی ''ثور'' کا جنوبی افریقہ کا نمائندہ تھا اس کمپنی کے متعلق موساد کو شک تھا کہ یہ کمپنی ریڈ مرکری 20/20 کی ٹیکنالوجی سے واقف ہو چکی ہے۔ اور اسے عربوں کو منتقل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ارمسکور کیمیکل کمپنی عراق کو کیمیاوی ہتھیاروں کے سلسلے میں معاونت کر چکی ہے.....!

عرب صحافی یسری فودہ نے جب ایلین کیڈ کر کے بھائی جیمس کیڈ کر سے ملاقات کی تو اس نے بہت سے انکشافات کئے جس کے مطابق برطانیہ کے شہر لیورپول میں ''جون ایلین'' نامی شخص کے ایلین کیڈ کر سے روابط تھے دونوں کے درمیان ایک سودا طے ہوا تھا جو مکمل نہ ہوسکا جون ایلین ایک مالدار شخص تھا جس نے ایلین کیڈگر کو کچھ کیمیاوی تجربات کے لئے آمادہ کیا تھا۔

مادہ وہ زمبیا کے راستے جنوبی افریقہ سے درآمد کرتا تھا جو بعد میں برطانیہ لایا جاتا تھا جہاں سے اسے شرق الاوسط بھجوایا جاتا تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کیمیائی مادے کی شکل کیا ہوتی تھی؟ تو اس نے بتایا کہ یہ اعلیٰ درجے پر پرکھا جاتا تھا جو کویت کی آزادی کی جنگ کے دوران شرق الاوسط بھی بھیجا گیا تھا اس نے مزید بتایا کہ اسے کیمیاوی اسلحے میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

برطانوی سنڈے ٹائمز کے جنوبی افریقہ میں سابق نامہ نگار جیمس گوین اپنے طور پر اس مہم جوئی میں مصروف تھا۔ ایلین کیڈگر کے قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں اس کا واسطہ ارمسکور کمپنی کے ایجنٹ فرانکو سے پڑ گیا جس نے اسے ٹیلی فون پر بتایا کہ کیپ ٹاؤن کے علاقے میں لبنان کی انتہا پسند تنظیم ''حزب اللہ'' کے تربیتی کیمپ موجود ہیں۔ گفتگو کے دوران فرانکو نے جیمس گوین سے وعدہ کیا کہ وہ اسے ان تربیتی کیمپوں کی تصاویر بھی مہیا کرے گا۔ مگر اگلے روز وہ ان تمام باتوں سے منحرف ہو گیا۔ بعد میں گوین نے یسری فودہ کو بتایا کہ اس گفتگو کے بعد جب اس نے ہوٹل میں اپنے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ کیا تو کمرے کے دروازے پر دو سفید فام اور دو سیاہ فام آدمی کھڑے تھے جن کے پاس اس کے ٹیلی فون گفتگو کی ٹیپ بھی موجود تھی ان لوگوں کے مطابق وہ جنوبی افریقہ کی خفیہ پولیس کے ارکان ہیں.....! جنہوں نے جیمس گوین کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے سے منع کیا اور دھمکی دی کہ یہ اس کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔ اس کے بعد سے یسری فودہ اور گوین نے کافی احتیاط برتنا شروع کر دیں۔ جیمس گوین زیادہ تر ریڈ مرکری 20/20 کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا جبکہ یسری فودہ جنوبی افریقہ میں حزب اللہ کے وجود سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ مگر اس کے خیال میں نہ تو گوین کے ہوٹل میں آنے والے چاروں افراد خفیہ پولیس کے آدمی تھے اور نہ ہی جنوبی افریقہ میں حزب اللہ کا کوئی وجود تھا حزب اللہ لبنان کی حد تک ایک طاقتور تنظیم ضرور ہے مگر اس میں اتنا اثر و رسوخ نہیں تھا کہ وہ جنوبی افریقہ میں تربیتی کیمپ قائم کر سکے۔ یہ اسی خفیہ ہاتھ کی کارستانی محسوس ہوتی تھی جو دنیا کے دوسرے خطوں کی طرح جنوبی افریقہ میں بھی مسلمانوں کو دہشت گردی کے نام سے بدنام کرنا چاہتا تھا۔

اپریل 1993ء میں رٹز ہوٹل میں ایک سیاہ فام شخص نے ''فریزر'' کے نام سے کمرہ

نمبر 1803 بک کرایا جہاں سے تھوڑی دیر بعد اس نے روم سروس فون کر کے اپنے لئے کچھ کھانے کی چیزیں منگوائیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک سفید فام شخص اس سے ملنے آیا۔ آپس میں گفتگو کے دوران ان میں جھگڑا ہوا اور سیاہ فام شخص تیزی کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ہوٹل بیرا جب روم سروس کے لئے کمرے میں داخل ہوا تو سفید فام شخص کی لاش خون میں لت پت فرش پر پڑی تھی۔ پولیس تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ 44 سالہ انجینئر ''فینانڈ فان فیک'' کی لاش ہے جو جنوبی افریقہ کے عسکری شعبے میں کیمیائی ماہر تصور کیا جاتا تھا مگر جب پولیس نے اس کا پاسپورٹ کھولا تو اس میں بعض عرب ممالک کے ساتھ ساتھ اسرائیل کا ویزہ بھی لگا ہوا تھا۔

بریکسٹون کے پولیس انسپکٹر چارلس لیڈمان نے ایک مرتبہ پھر وثوق کے ساتھ دعویٰ کر دیا کہ ''فینانڈ فان فیک'' کا قتل بھی ایلن کیڈگر کی طرح موساد نے ہی کرایا ہے۔ پولیس کے مطابق فان فیک کا رابطہ بین الاقوامی اسلحہ کے تاجر ''ڈونجوان رانفا'' کے ساتھ تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے ایٹم بم پھینکنے والی دور مار توپیں Howitzer G5 عراق کو سپلائی کی تھیں۔ ڈونجوان رانفا کا سر ایک پلاسٹک کے لفافے میں فان فیک کے قتل سے تھوڑا عرصہ پہلے ایک سڑک کے کنارے ملا تھا۔ ڈونجوان ایلن کیڈگر کے قتل میں موساد کے ہاتھ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈنجوان ایک اور اسلحے کے تاجر ''ڈیرک اسٹیو برگ'' کا دوست تھا جسے اپریل 1994ء میں پریٹوریا میں اس کی ساتویں بیوی کے ساتھ اس کے عالیشان گھر میں قتل کرنے کے بعد چھٹی منزل سے نیچے پھینک دیا گیا تھا۔ چارلیس لیڈمان کا خیال تھا کہ کیمیائی انجینئر فان فیک کا ریڈ مرکری 20/20 سے تعلق تھا موساد کو خدشہ تھا کہ یہ اسے عرب ممالک نہ منتقل کر دے اس لئے موساد نے جنوبی افریقہ میں اس خطرناک مادے کے حصول اور عرب ممالک کو اس سے دور رکھنے کے لئے قتل عام کا بازار گرم کر دیا۔ پولیس تحقیقات کے مطابق ڈیرکس اسٹیو برگ کے گھر میں گولیوں کے خول اور دیواروں پر خون کے نشانات تھے آس پاس کے لوگوں کے مطابق دو لوگ واردات کے بعد ڈیرک کے گھر سے نکلے وہ کسی ''ایجنسی'' کے تربیت یافتہ ارکان معلوم ہوتے تھے۔ ڈیرک اسٹیو برگ کا نام ایران میں امریکی یرغمالیوں کے سلسلے میں بھی آتا رہا تھا اس کے علاوہ اس پر سب سے بڑا الزام روس سے ریڈ مرکری 20/20 باہر منتقل کرنے کا تھا جس کا نمونہ اس کے گھر سے قتل کے بعد برآمد ہوا تھا۔ اس کے گھر سے برآمد ہونے والے

کاغذات سے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق اردن کے ایک شہری ''زہدی الخطیب'' کے ساتھ بھی تھا جس کے ساتھ اس نے افزودہ یورینیم اور مرکری 20/20 کی سپلائی کا سودا کیا تھا۔ ڈیرک کے قتل کے بعد اس کی سابقہ بیوی سے تحقیقات کے بعد جنوبی افریقہ کی پولیس پر انکشاف ہوا کہ ڈیرک پہلے جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی NI کے لئے کام کرتا تھا۔ عراق ایران جنگ کے خاتمے پر اس کے تعلقات CIA سے استوار ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے کیمیائی ہتھیاروں میں استعمال ہونے والا کیمیائی مواد تیونس کی ایک کیمیکل کمپنی کے ذریعے یورپ کے راستے روس سے درآمد کرنا شروع کر دیا۔ تیونس کی یہ کیمیکل کمپنی درحقیقت لیبیا کی خفیہ ایجنسی کے تحت کام کرتی تھی......

ڈیرک اسٹیو برگ اور اس کی بیوی کے قتل کے صرف ایک ماہ بعد ہی جنوبی افریقہ کی پولیس کو دو نوجوان کیمیکل انجینئروں کی لاشیں سڑک پر ملیں ان میں سے ایک 25 سالہ سکاٹ ایٹن تھا دوسرا 27 سالہ ''فیلکس کوٹیزی'' تھا انہیں پورٹ ایلزبتھ میں گولی مار کر قتل کیا گیا تھا یہ دونوں برطانیہ کی الیکٹریکل کمپنی ''راکال'' کے جنوبی افریقہ میں نمائندے تھے یہ کمپنی بھی بعض عرب ملکوں کو عسکری نوعیت کا سامان مہیا کرتی تھی۔ 1991ء میں ایلن کیڈگر کے قتل کے تین ہفتے بعد ہی ایک برطانوی نژاد کیمیکل انجینئر جون سکاٹ جو جنوبی افریقہ میں کیمیکل کمپنی ''ووکر'' کا ڈائریکٹر تھا کو اس کی بیوی اور دو بچوں سمیت گیس کے ذریعے قتل کر دیا گیا تھا۔ ایلن کیڈگر کے کیس پر مامور انسپکٹر چارلس لیڈمان نے ان وارداتوں کی تمام کڑیاں موساد سے جا ملائی تھیں۔ چارلس لیڈمان کا اس سلسلے میں بڑا ذریعہ معلومات یورپ کے ایک ملک کا شہری اور موساد کا ایجنٹ تھا جسے بعد میں اس کے گھر میں ''نامعلوم'' افراد نے پھانسی دے کر ہلاک کر دیا۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر لیڈمان نے موساد کو ان وارداتوں میں ملوث قرار دیا ہے۔ جنوبی افریقہ کے اخبارات خاص طور پر The Star نے بھرپور انداز میں کوریج دی مگر جلد ہی یہ معاملہ حیرت انگیز طور پر دبا دیا گیا۔ تحقیقی افسر چارلس لیڈمان کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ جس کے بعد وہ ایک سیکورٹی کمپنی میں خدمات انجام دینے لگا۔ دی سٹار کے ایڈیٹر کو بھی بعد میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا تھا وہ ایک مقامی سیاحتی کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام کرنے لگا ریڈ مرکری 20/20 اور قتل عام کی تمام تحقیقات دفن کر دی گئیں......!

براعظم افریقہ کی ان خصوصیات کو ہی سامنے رکھ کر موساد نے یہاں ہر جگہ اپنے خفیہ مراکز کا جال بچھا دیا۔ اس کے علاوہ جن جن مغربی اور افریقی کمپنیوں نے عرب ملکوں کو عسکری نوعیت کا سامان مہیا کیا ان کے نمائندوں اور ماہرین کو موساد نے چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ برطانیہ کے صحافتی حلقوں کے مطابق موساد کی افریقہ میں جاسوسی سرگرمیوں میں بحراحمر کے جزیروں کے گرد اسرائیلی آب دوزیں بھی شامل ہیں۔ ''فارن رپورٹ'' کے مطابق موساد کا افریقہ میں سب سے بڑا جاسوسی اڈا جزیرہ ''دھلک'' میں واقع ہے جو اریٹیریا کی بندرگاہ ''ماساوا'' کے قریب واقع ہے۔ اسرائیلی اخبار ''یروشلم پوسٹ'' کے مطابق اسرائیل نے ایتھوپیا سے یہ جزیرہ پٹے پر حاصل کیا ہے تاکہ یہاں ''ترقیاتی کام'' انجام دیئے جا سکیں۔ فارن رپورٹ کے مطابق بحیرہ احمر کے ایک اور اہم جزیرے ''حنیش'' میں اسرائیل نے دوسرا بڑا اڈا بنایا ہے۔ ٹائمز کے مطابق موساد نے اریٹریا کے علاقے ''محل'' کی پہاڑیوں میں الیکٹرانک آلات سے آراستہ انتہائی جدید خفیہ اڈا قائم کیا ہے یہ علاقہ سوڈان کی سرحد کے قریب واقع ہے....

امریکی خفیہ دستاویزات
شاہ فیصل شہید نے اسرائیل کے خلاف اعلان جہاد بلند کیا

امریکی وزارت خارجہ کی بعض خفیہ دستاویزات پچھلے دنوں طویل مدت کے بعد عوام اور پریس کیلئے عام کی گئیں ان دستاویزات میں مختلف ممالک اور ان کے سربراہان سے متعلق مختلف امریکی سفارتخانوں اور امریکی وزارت خارجہ کے درمیان خفیہ مراسلت میں امریکی حکمت عملی واضح کی جاتی تھی۔ مندرجہ ذیل دستاویزات میں اسلامی دنیا کی محبوب شخصیت شاہ فیصل شہید کی مقبوضہ فلسطین اور مسجد اقصی کی آزادی کے لئے جدوجہد کو مختلف امریکی سفارت خانوں اور امریکی وزارت خارجہ کے درمیان باہمی خفیہ مراسلت کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔ ان مراسلات سے پہلے شاہ فیصل شہید اور امریکی صدر نکسن کے درمیان چند خطوط کا تبادلہ بھی ہوا تھا جس میں شاہ فیصل شہید نے امریکی صدر نکسن کو صاف الفاظ میں مخاطب کر کے کہا تھا کہ

☆ جناب صدر مقبوضہ القدس کی آزادی کے لئے میں شہید ہونے کے لئے تیار ہوں۔ (انہوں نے اپنا یہ قول سچ ثابت کر دکھایا)۔

☆ میں امریکہ اور سعودی عرب کے درمیان اچھے تعلقات کا خواں ہوں۔

☆ امریکہ کو چاہیئے کہ اسرائیل پر دباؤ ڈالے تاکہ مسلمانوں کے خلاف تشدد کی کارروائیاں بند

ہوسکیں۔

☆ مقبوضہ القدس پر صرف مسلمانوں کا حق ہے اور اسے ایک دن انہی کی جانب لوٹنا ہے۔

شاہ فیصل شہید کے ان اقوال کی روشنی میں اس وقت شرق الاوسط کی جو سیاسی صورتحال تھی اسے امریکی انتظامیہ کس نظر سے دیکھ رہی تھی اس کی ہلکی سی جھلک امریکی وزارت خارجہ کی اس وقت کی خفیہ مراسلت کی روشنی میں آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے۔امریکی انتظامیہ نے قومی مفاد کے تناظر میں ہنری کسنجر کے ساتھ خط وکتابت ملکی مفاد میں اوپن نہیں کی۔

منجانب امریکی سفیر۔سعودی عرب
برائے امریکی وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ:3/1/1968
(عام)

جاپانی قائم مقام سفیر کونیو کا تاکورا کی خواہش پر امریکی سفارتخانے کے ایک اہلکار نے ان سے ملاقات کی جس میں انہوں نے جاپانی وزیر برائے بین الاقوامی امور اور شاہ فیصل کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

شاہ فیصل نے جاپانی وزیر کے ساتھ پینتالیس منٹ تک ملاقات کی جس میں انہوں نے عرب اسرائیل تنازعے کے متعلق گفتگو کے دوران اسرائیل کے لئے امریکی سیاسی حکمت عملی پر شدید غم وغصے کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بحر ہند میں سوویت بحری بیڑے میں اضافے پر تشویش کا اظہار بھی کیا ان کا کہنا تھا کہ سعودی عرب تیل کے وسیع ذخائر کا مالک ہے مگر ان کی حفاظت کے لئے اس کے پاس وسائل ناکافی ہیں۔

(بیروت پر حملہ)
منجانب: امریکی سفیر، سعودی عرب
برائے وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ۔2/2/1969
(خفیہ)

سعودی عرب نے بیروت ائرپورٹ پر اسرائیلی حملے کی شدید مذمت کی ہے اس حملے میں لبنان کا ایک مسافر طیارہ تباہ ہوا ہے۔مگر ابھی تک شاہ فیصل کی جانب سے ایسا کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ ایک اور عرب کانفرنس کا اجلاس طلب کریں گے۔

پچھلے ماہ مصر سے ایک سرکاری وفد سعودی عرب آیا تھا جس کا مقصد سعودی مصر مشترکہ بنک کا قیام تھا، اسی ماہ سعودی عرب نے مصر اور اردن کو 36 ملین ڈالر کی رقم بھی ادا کی ہے، یہ اس رقم کا حصہ ہے جو سعودی عرب ہر تین ماہ بعد ان ملکوں کو دیتا ہے تاکہ 1967ء میں خرطوم کے مقام پر ہونے والی کانفرنس کی قراردادوں پر عمل کرایا جاسکے، سعودی حکومت اس امداد کا برملا اعلان نہیں کرتی مگر سعودی اخبارات کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس سے متعلق خبریں چھاپ سکتے ہیں۔

(اعلان جہاد)
منجانب: امریکی سفیر، سعودی عرب
برائے: امریکی وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ۔3/4/1969
(خفیہ)

شاہ فیصل کو اس بات کا پوری طرح ادراک ہے کہ شرق الاوسط کے حالات انتہائی نازک مرحلے سے گذر رہے ہیں جو سعودی عرب کے لئے بھی خطرناک ہوسکتے ہیں مگر اس کے

باوجود انہوں نے اسرائیل کا مزید دلیری کے ساتھ سامنا کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پچھلے ماہ انہوں نے دنیا بھر سے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے ''جہاد کا خطبہ'' دیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سعودی عرب نے فلسطین کے مسئلے کو اپنی پالیسی میں سرفہرست رکھا ہوا ہے۔سعودی حکومت نے اپنے تمام اہلکاروں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ اسرائیل کے قبضے سے مقبوضہ القدس کی آزادی عین اسلامی فریضہ ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان پر مسلمانوں کو متحد کرنے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔

سعودی حکومتی اہلکاروں میں ایک شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز ہیں جو سعودی عرب کے وزیر دفاع بھی ہیں انہوں نے کل مصری بریگیڈیر عبدالمنعم ریاض کی موت پر ایک تعزیتی ٹیلی گرام ارسال کیا ہے جو نہر سویز کے علاقے میں اسرائیلی فوجوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں ہلاک (شہید) ہو گئے تھے۔سعودی وزیر دفاع نے اپنے ٹیلی گرام میں لکھا ہے کہ بریگیڈیر عبدالمنعم ریاض نے اپنے دین اور وطن کی خاطر اللہ کی راہ میں جان دی ہے۔

سعودی حکومت کی جانب سے اسلام اور اسلامی دنیا کی حمایت میں متشدد رویہ اختیار کرنے کی ایک اور مثال اس طرح ہے کہ انہوں نے فلسطینی فدائین کی حمایت میں مزید اضافہ کر دیا ہے، مدینہ منورہ کے گورنر شہزادہ عبدالمحسن بن عبدالعزیز نے فلسطین کے مسئلے پر بلائی گئی ایک کانفرنس میں فلسطینی فدائین (مجاہدین) کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا ہے۔اس کے ریاض کے گورنر شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز نے یہاں ایک فلسطینی فیسٹول کے انعقاد کے افتتاح کے موقع پر فدائین کی سرگرمیوں کو سراہا۔

(مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی)

منجانب: امریکی سفیر، سعودی عرب

برائے وزارت خارجہ، واشنگٹن

تاریخ: 3/9/1969

(خفیہ)

مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی نے سعودی حکومت اور عوام کو بری طرح غضبناک کر دیا ہے،

لیکن سعودی فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز کا غصہ اور رنج ان سب میں سب سے زیادہ ہے۔جس روز مسجد کو جلایا گیا اسی روز شاہ فیصل نے اسلامی دنیا کو جہاد کی کال دے دی تاکہ اسرائیل کے ہاتھوں سے القدس کو آزاد کرایا جاسکے۔اس واقعے کے دو روز بعد شاہ فیصل کو اردن کے شاہ حسین کی جانب سے ایمرجنسی ٹیلی گرام موصول ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی کے موضوع پر فوراً عرب سربراہ کانفرنس بلائی جائے تاکہ اس مسئلے پر غور و خوض کیا جاسکے مگر شاہ فیصل جو سوائے اسلامی ازم کے کسی ازم کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کا اسلامی ازم ناصر کے عرب ازم سے زیادہ خطرناک ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عرب سربراہ کانفرنس کی بجائے اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کو ترجیح دی ہے ان کی فکر میں اسلامی فکر تمام افکار پر فوقیت رکھتی ہے۔اسی دن شاہ فیصل نے سعودی وزیر مملکت برائے خارجی امور السقاف کو عرب وزراء خارجہ کانفرنس کے ہیڈکوارٹر قاہرہ ان ہدایات کے ساتھ روانہ کر دیا کہ مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا جائے۔

اس سے تین روز پہلے میں خود شاہ فیصل سے ملا تھا تاکہ ان کے غم و غصے کا اندازہ کر سکوں ان کا ردعمل عروج پر تھا دوسرے اس لئے بھی کہ اب وہ اسرائیل کے خلاف منصوبہ بندی کا کونسا طریقہ اختیار کریں گے۔اس سلسلے میں میری رائے ہے کہ وہ اپنے کاز سے انتہائی مخلص ہیں۔

(شہزادہ فہد کا دورہ)

منجانب: جوزف سیسکو نائب وزیر برائے شرق الاوسط

برائے وزیر خارجہ ولیم روجرز،

تاریخ: 16/10/1969

(خفیہ)

آج آپ شہزادہ فہد بن عبدالعزیز (خادم الحرمین الشریفین) سے ملاقات کریں گے۔

اس ملاقات کا بڑا موضوع القدس ہے۔ان کو یقین دلائیں کہ ہم القدس کے مسئلے پر شاہ فیصل کے جذبات کو نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ ان کا پوری طرح احترام بھی کرتے ہیں، ہم اس بات کا کئی مرتبہ برملا اظہار کر چکے ہیں کہ ہم القدس کو اسرائیلی مقبوضہ علاقہ تصور کرتے ہیں اور شہر کی تاریخی

حیثیت بدلنے کے خلاف ہیں۔

شہزادہ فہد کو بتائیں کہ ہم فریقین کے درمیان کسی بھی امن مذاکرات کی حمایت کریں گے تاکہ اس مقدس شہر میں تینوں بڑے مذاہب کے ماننے والوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے۔ مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی جو ایک غیر ذمہ دار شخص کی وجہ سے ہوئی اس سلسلے میں ہم اپنے مسلمان دوستوں کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں ہم مسجد کو دوبارہ اسی انداز میں مرمت کرنے کی حمایت کریں گے اور چاہیں گے کہ دوبارہ ایسا واقعہ نہ ہوسکے۔

(مصری اتاشی)

منجانب: جوزف سیسکو، نائب وزیر برائے شرق الاوسط

برائے وزیر خارجہ ولیم راجرز،

تاریخ: **17/10/1969**

(خاص)

مصری سفارتخانے کے اتاشی محمد صلاح الدین السید واشنگٹن میں وزارت خارجہ آئے تھے اور یہاں انہوں نے رامبلمایار سے ملاقات کی، ہم نے انہیں صدر نکسن اور وزیر خارجہ کی خفیہ گفتگو کے عام نکات سے جو شرق الاوسط کے بارے میں تھے آگاہ کیا۔ مصری اتاشی نے القدس کے معاملے میں ہمارے ردعمل سے متعلق سوال کیا تھا جس پر رامبلمایار نے انہیں القدس کے بارے میں شاہ فیصل کی تشویش سے آگاہ کیا اور واضح کیا ہے کہ امریکہ مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی کے واقعے کو افسوس کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ تین بڑے مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے ماننے والے پرامن طریقے سے یہاں اپنی اپنی عبادات جاری رکھیں گے اور اسرائیل کی کسی بھی ایسی کوشش کی مذمت کی جائے گی جس میں اس مقدس شہر کی ہیئت بدلنے کی کوشش شامل ہو۔

(نکسن اور شہزادہ فہد)

منجانب: وزارت خارجہ واشنگٹن،

برائے: امریکی سفارتخانہ سعودی عرب

تاریخ: **17/10/1969**

(خفیہ)

((صدر نکسن اور شہزادہ فہد بن عبدالعزیز کے درمیان گفتگو کی مختصر تفصیلات))۔

صدر نکسن نے مذاکرات کے دوران کہا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ شرق الاوسط میں ایسی پالیسی اختیار کی جائے جس کا فائدہ علاقے میں اس کے دوستوں کو بھی پہنچے تاکہ ان کی دل شکنی کا سبب پیدا نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے معتدل عرب دوستوں کے ساتھ تعاون کی فضاء بڑھانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم شاہ فیصل کی اس بات کو سراہیں گے جس میں انہوں نے مسائل کے حل کے لئے اعلیٰ ترین وسائل حرکت میں لانے کا مشورہ دیا ہے۔ شہزادہ فہد نے صدر نکسن کے ان جذبات کا شکریہ ادا کیا اور انہیں شاہ فیصل کی جانب سے ارسال کردہ خط پہنچایا جس میں شاہ فیصل نے صدر نکسن کو مخاطب کرکے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ سعودی عرب امریکہ کے ساتھ دوستی کی فضا برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ شہزادہ فہد نے بھی ایسے ہی جذبات کی توقع کا اظہار کیا اسکے جواب میں صدر نکسن نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا اور انہیں شاہ فیصل تک پہنچانے کی درخواست کی۔

کسنجر کی جانب یاددہانی کا خط

منجانب وزارت خارجہ واشنگٹن،

برائے ہنری کسنجر، وائٹ ہاؤس

صدارتی مشیر برائے قومی امن

تاریخ: **5/11/1969**

(خفیہ)

لندن میں ہمارے سفارتخانے کو شہزادہ فہد بن عبدالعزیز کی جانب سے ایک شکریئے کا

خط ارسال کیا ہے جس میں امریکی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اگلے ہفتے ہمارا سفیر ایلٹس سعودی عرب جاکر شاہ فیصل کو صدر نکسن کی جانب سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شہزادہ فہد کو بھی صدر نکسن کی جانب سے ان کے خطاب کی کاپیاں پہنچائے گا اس چیز کا اشارہ وزیر خارجہ ولیم روجرز نے اپنے یاددہانی کے خط میں بھی کیا ہے جو صدر نکسن کو ارسال کیا گیا تھا۔

(ہنری کسنجر کے خطوط کا مجموعہ امریکی قومی امن کے تقاضوں کے تحت افشاء نہیں کیا گیا۔۔۔)

(نیویارک ٹائمز)
منجانب: جوزف سیسکو، نائب وزیر برائے شرق الاوسط
برائے: وزیر خارجہ ولیم روجرز، واشنگٹن،
تاریخ: **12/12/1969**
(خاص)

دو ہفتے بعد سعودی سفیر السویل سعودی عرب جانے سے پہلے مجھ سے ملاقات کریں گے۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ فیصل القدس کے معاملے میں طاقتور موقف اپنا رہے ہیں اور اس مسئلے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا متاثر کن اور طاقتور پہلو دنیا کے سامنے آیا ہے۔ آج نیویارک ٹائمز ایسی خبر چھاپے گا جس میں بتایا جائے گا کہ ہم نے خفیہ انداز میں اردن کے شاہ حسین کو القدس کے بارے میں بعض تجاویز ارسال کی ہیں اس سے ہمیں شاہ فیصل کے رد عمل کا باآسانی اندازہ ہو جائے گا یہ خبر اس طرح ہوگی:

''ہم ابھی تک القدس کی تاریخی حیثیت بدلنے کے مخالف ہیں اس سلسلے میں ہم اردن کو کلیدی کردار میں دیکھنا چاہتے ہیں یہ مسلمانوں کے حق میں بھی بہتر ہوگا اور عیسائیت اور یہودیت کے ماننے والے بھی یہاں اپنی مذہبی رسومات پوری کرتے رہیں گے مگر اس سلسلے میں ہم اپنے سرکاری موقف کی تمام تفاصیل سے آگاہ نہیں کرسکتے کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ القدس کے معاملے میں تمام فریقوں کی رضامندی شامل ہونی چاہئے''۔

(صہیونیت اور کمیونزم)
منجانب: امریکی سفارتخانہ، سعودی عرب
برائے: وزارت خارجہ واشنگٹن،
تاریخ: **23/5/1971**
(خفیہ)

ایران میں تعینات امریکی سفیر میکارتھر نے شاہ فیصل کے دورہ ایران اور ان کے دورہ کے آخر میں دونوں ممالک کی جانب سے مشترکہ اعلامیے پر مشتمل جو رپورٹ سامنے آئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ فیصل نے صہیونیت اور کمیونزم کو شرق الاوسط کے لئے دو بڑے خطرے قرار دیا ہے۔ اسی طرح کا بیان شاہ فیصل نے اپنے دورہ تائیوان کے دوران دیا تھا۔ اس لئے ہم انہیں دورہ واشنگٹن کے دوران اس قسم کے بیان سے نہیں روک سکتے۔ اس سلسلے میں کل میری ملاقات سعودی عرب کے وزیر برائے امور خارجہ السقاف سے بھی ہوئی ہے جس میں ان کے ساتھ میں نے اس موضوع پر خاص طور پر گفتگو کی، خاص طور پر شاہ فیصل کے دورہ واشنگٹن کے حوالے سے بات چیت ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی توجہ نیویارک ٹائمز کی اس خبر کی جانب مبذول کرائی جس میں مصر کے انور سادات نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ اسرائیل کے ساتھ معاملات مذاکرات کی میز پر طے ہونے چاہیں۔ سادات کا خیال ہے کہ سفارتی ذرائع سے طے ہونے والے معاملات میں مصر اسرائیل سے اپنے وہ مقبوضہ علاقے واپس لینے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ (یہ جنگ رمضان 1973ء سے پہلے کا بیان ہے) میں نے السقاف کو واضح طور پر بتایا ہے کہ امریکی حکومت اور عوام چاہتے ہیں کہ عرب اسرائیل تنازعات کا حل سفارتی سطح پر ہو۔

(شاہ فیصل)

منجانب: وزیر خارجہ ولیم راجرز،

برائے: صدر نکسن

تاریخ: 24/5/1971

(خاص)

جب سے آپ صدر منتخب ہوئے ہیں یہ آپ کی شاہ فیصل کے ساتھ پہلی ملاقات ہوگی۔ شاہ فیصل کے اس دورے کے دوران ہماری پالیسی ہوگی کہ ہم انہیں اس بات پر قائل کریں کہ امریکہ شرق الاوسط کے معاملات کو منصفانہ انداز میں حل کرنا چاہتا ہے اور ہم ان کے ملک کے بارے میں اپنی اہم ذمہ داری کو سمجھتے ہیں امریکہ اپنی اس حیثیت کو نبھانے کے لئے ہر قسم کے اقدامات کرے گا۔ شاہ فیصل کی جانب سے اس دورے کا سب سے بڑا مقصد امریکہ کو شرق الاوسط کے معاملے میں عرب موقف سے آگاہ کرنا ہے مگر انہیں اس بات کا پوری طرح اندازہ ہے کہ ہمارے رویئے میں کوئی ڈرامائی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی مگر ان کا خیال ہے کہ ہم اسرائیل پر بعض امکانات کی بنیاد پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ شاہ فیصل علاقے میں استحکام کی صورت پیدا ہونے کے امکانات پر آپ کی رائے جاننا چاہیں گے۔ شاہ فیصل علاقے میں کمیونزم اور قومیت کے مخالف ہیں حالانکہ اسی بنیاد پر وہ اسرائیل کے بڑے دشمن بھی ہیں لیکن سعودی عرب نے 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیا تھا مگر اس کے باوجود اسرائیل کے خلاف لڑنے والے عرب ملکوں کو ان کی بھرپور اعانت اور حمایت حاصل تھی وہ عرب ملکوں کی کسی بھی ایسی قرارداد کی مخالفت نہیں کریں گے جس میں اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہو۔ شاہ فیصل ابھی تک مصر اور اردن کو سالانہ 147 ملین ڈالر مہیا کر رہے ہیں تاکہ 1967ء کی خرطوم اسلامی کانفرنس کی قراردادوں پر عمل کر سکیں، اس کے علاوہ فلسطینی گوریلا تنظیم الفتح کو بھی شاہ فیصل کی مالی اور سیاسی معاونت حاصل ہے۔

(شاہ فیصل اور ولیم راجرز)

منجانب: وزیر خارجہ ولیم راجرز

برائے: وائٹ ہاؤس

تاریخ: 27/5/71

(خفیہ)

میں نے شورام ہوٹل میں شاہ فیصل سے ملاقات کی ہے۔ ان کے ساتھ شہزادہ نواف، سعودی سفیر السویل، اقوام متحدہ میں سعودی سفیر بارودی اور شاہ کے مشیر فرعون تھے جبکہ میرے ساتھ سعودی عرب میں امریکی سفیر تھیچر، شرق الاوسط کے امور کے نائب وزیر سیسکو اور سعودی امور کے انچارج مرفی تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے شاہ فیصل کو یقین دلایا کہ ہم شرق الاوسط میں امن وامان کی خاطر ہر قسم کی کوششیں بروئے کار لائیں گے اس سلسلے میں ہم ہر طرح سے کوششیں کر رہے ہیں کہ مصر اور اسرائیل کو بات چیت کے لئے قریب لا سکیں۔ میں نے انہیں کہا ہے کہ آپ کی القدس کے بارے میں رائے کو ہم نے مدنظر رکھا ہوا ہے۔

(خطوط کا تبادلہ)

منجانب: سیکرٹری وائٹ ہاؤس،

برائے: ہنری کسنجر، صدارتی مشیر برائے قومی سلامتی

تاریخ: 23/6/1971

(خاص)

شاہ فیصل نے اپنے دورہ واشنگٹن کے اختتام پر صدر نکسن کو خط ارسال کیا ہے، یہ خط عربی زبان میں ہے جس کا انگریزی ترجمہ جو سعودی عرب میں ہوا تھا بھیجا جا رہا ہے جو اس طرح ہے:

سعودی عرب کے شاہ فیصل بن عبدالعزیز کی جانب سے

"اپنے دورہ واشنگٹن کے دوران میں آپ کی یعنی امریکی حکومت کی مہمان نوازی سے محظوظ ہوتا رہا جس میں دونوں ملکوں کی جانب سے حکومتی اور عوامی سطح پر دوستی کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ میں پھر ایک مرتبہ آپ کو اس بات کی جانب یقین دہانی کے لئے متوجہ کروں گا کہ آپ نے علاقے کی صورتحال کو عادلانہ انداز میں حل کرنے میں مدد دینے کی یقین دہانی کرائی ہے تاکہ علاقے کے امن کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے، مگر انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض خفیہ معاملات کی وجہ سے ان ممالک کے منصفانہ عناصر کی کوششیں ماند پڑتی جارہی ہیں جو شرق الاوسط کے امن کے لئے کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں، ہم امریکی قیادت جس کے آپ صدر ہیں کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ ایسے معاملات سے اجتناب کیا جائے۔"

(دو خطوط)

منجانب: سیکریٹری وائٹ ہاؤس،

برائے: ہنری کسنجر، صدارتی مشیر برائے قومی امن

تاریخ: 24/11/1972

(خفیہ)

شاہ فیصل کا خط مع اس کے انگریزی ترجمہ کے سعودی سفارتخانے کے اہلکار نے امریکی وزارت خارجہ پہنچایا تھا اس خط میں دو نکات پر بات ہوئی ہے:

1۔ امریکی جانب سے تیزی کے ساتھ ایسے اقدامات کئے جائیں جن کی وجہ سے اسرائیل جلد از جلد مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کردے۔

2۔ سوویت یونین کی جانب سے جمہوریہ یمن میں اپنے مفادات میں اضافے اور عدن انتظامیہ کے ساتھ وسیع تعاون پر نظر رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

آخر میں صدر نکسن کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کی مبارکباد ہے۔ (امریکی انتخابات 1972ء)۔

(شاہ فیصل افریقہ میں)

منجانب: سعودی سفارتخانہ سعودی عرب

برائے: وزارت خارجہ واشنگٹن،

تاریخ: 13/2/1973

(خفیہ)

ماہ رمضان کے اختتام پر شاہ فیصل افریقی ممالک جن میں یوگنڈا، چاڈ، سینگال، موریتانیا اور نائجیریا شامل ہیں کا دورہ کیا۔ دورے کے اختتام پر نائجیریا اور چاڈ نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کرنے کا اعلان کردیا جبکہ مالی نے بھی ایسا ہی کیا ہے حالانکہ شاہ فیصل کے دورے میں یہ ملک شامل نہیں تھا مگر شاہ نے اس ملک کو بھی مالی امداد بھیجی ہے۔ شاہ فیصل کا اثر رسوخ ایسے عرب ممالک میں بھی بڑھ رہا ہے جہاں اسلامی حکومتوں کے بجائے قومیت کی بنیاد پر حکومتیں قائم ہیں۔

(شاہ فیصل اٹلی میں)

منجانب: امریکی سفارتخانہ سعودی عرب

برائے: وزارت خارجہ واشنگٹن،

تاریخ: 18/7/1973

(خفیہ)

متعدد عرب اور یورپی ممالک کے دوروں کے بعد شاہ فیصل نے اٹلی کا دورہ کیا تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی اور سیاسی تعلقات میں مزید فروغ حاصل ہوسکے۔ اس دورے کی وجہ سے سعودی عرب اور یورپی اقتصادی منڈی کے ممبر ممالک کے درمیان تعاون کی فضاء پیدا ہورہی ہے یہ ممالک سعودی پیٹرول کے بدلے یورپی صنعت اور ٹیکنالوجی مہیا کریں گے۔ اس دورے کے دوران شاہ فیصل نے شرق الاوسط کے امن کے لئے دو خطروں کی

نشاندہی کی ہے ایک صیہونیت اور دوسرا کمیونزم ،اٹلی کی حکومت اور عوام میں شاہ فیصل کی سیاسی بصیرت کی بنیاد پر ان کا خاصا احترام ہے۔

(شاہ فیصل اور یاسر عرفات)
منجانب: امریکی سفارتخانہ سعودی عرب
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 17/10/1973
(خفیہ)

پی ایل او کے چیرمین یاسر عرفات نے گذشتہ دنوں سعودی عرب کا دورہ کیا اور شاہ فیصل سے ملاقات کی ،سعودی عرب اور پی ایل او کے درمیان خاصے قریبی تعلقات ہیں۔شاہ فیصل نے اس ملاقات میں پی ایل او کو مزید مالی امداد دی ہے اس کے ساتھ ساتھ شاہ فیصل نے یاسر عرفات کو کہا ہے وہ فلسطینی مسلمانوں اور ان کی عسکری تنظیموں کو منظم کرے۔

امریکی سفارتخانے کو یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ شاہ فیصل نے یاسر عرفات کو ان فلسطینی عناصر پر گرفت تنگ کرنے کو کہا ہے جو پیرس میں سعودی سفارتخانے پر حملے میں ملوث ہیں یاسر عرفات نے ایسا کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

ΩΩΩ

امریکی خفیہ دستاویزات
سوڈان کا نمیری انقلاب اور امریکی بے بسی

تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے اس کا اندازہ امریکی محکمہ خارجہ کی ان خفیہ دستاویزات سے لگایا جاسکتا ہے جو ربع صدی کے بعد دنیا کے سامنے افشاء کی گئیں ،یہ خفیہ دستاویزات دنیا کے تقریبا ان اسٹریٹیجک خطوں کے بارے میں ہیں جہاں آج بھی امریکہ ماضی کی طرح کسی نہ کسی طرح دخیل ہے۔انہی خطوں میں ایک ملک سوڈان ہے ،آج جس طرح امریکہ سوڈان کی اسلامی حکومت اور اس کے اسلامی نظام کے نفاذ کے پروگرام کو ثبوتاژ کرنے کے درپے ہے وہ نئی بات نہیں بلکہ تاریخ کا ایسا تسلسل ہے جسے عام لوگ جلد بھلا دیتے ہیں،سوڈان کی اسلامی وحدت کو توڑنے کے لئے جنوبی سوڈان میں عیسائی اقلیت کی امریکہ اور یورپ جس انداز میں معاونت کر رہے ہیں وہ یکدم ظہور پذیر ہونے والے واقعات نہیں ہیں بلکہ آج سے تیس سال پہلے بھی اس خطے میں آنے والے انقلابات نہ صرف امریکہ بلکہ پڑوسی ملکوں کے لئے بھی تشویش کا باعث رہے ہیں۔پینتیس سال پہلے بھی سوڈان میں کرنل جعفر نمیری کی قیادت میں بائیں بازو کا عسکری انقلاب برپا کیا گیا تھا جس نے علاقے میں امریکی مفادات کی چولیں ہلا دی تھیں اور بحیرہ احمر میں امریکیوں کو سوویت بحری جہاز تیرتے نظر آنے لگے تھے اس انقلاب کے دنیا میں کیا اثرات مرتب ہوئے ،امریکی انتظامیہ کھلبلی کا

تناسب کیا تھا، اتنے بڑے واقعے پر امریکہ سوڈان میں مداخلت کی جرأت کیوں نہ کر سکا؟ اس کے لئے سوڈان سے متعلق امریکی دستاویزات کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

(بائیں بازو کا انقلاب)

منجانب: وزارت خارجہ، واشنگٹن
برائے: امریکی سفیران شرق الاوسط اور مشرقی افریقہ
تاریخ: 26.5.1969
(خاص)

کرنل جعفر نمیری (39 سالہ) کی قیادت میں کل ہفتے کی رات خرطوم میں بائیں بازو انقلاب برپا کر دیا گیا ہے جس کے دوران کسی قسم کی خونریزی ہونے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ کرنل محمد جعفر نمیری تین سال قبل لیونورتھ کے ملٹری کالج میں تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ نمیری نے بائیں بازو کی فکر کے حامل سابق چیف جسٹس بابکر عوض اللہ کو وزیر اعظم اور وزیر خارجہ مقرر کیا ہے جبکہ نئی کابینہ میں پانچ کمیونسٹ وزیر بھی تعینات کئے گئے ہیں، سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئی ہیں اور اخبارات کی اشاعت بند ہے۔ عوام کو مظاہروں کی اجازت نہیں ہے نئے نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو عبرت ناک سزا کا حکم دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم محجوب، صدر الازہری، فوج کے سربراہ اور دیگر فوجی آفسران کو ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا۔

(خلیل عثمان)

منجانب: امریکی سفیر، کویت
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 26.5.1969
(خفیہ)

کویت میں مقیم "گلف فیشری کمپنی" کا سوڈانی ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیل عثمان محمود مجھ سے ہنگامی ملاقات کے لئے آیا تھا اس کمپنی کا مالک سابق وزیر خارجہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ

سوڈان جائے گا اور نمیری جو اس کا پرانا ہم جماعت ہے اسے کمیونسٹ ایجنٹ دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ خرطوم میں امریکی سفارتخانے سے رابطہ کر کے سوڈانیوں کو کمیونسٹ یا مصری انقلاب سے نجات دلانے کی کوشش کرے گا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس انقلاب میں دوسری طاقتور شخصیت عوض اللہ ہے جو مصری کمیونسٹ ہے۔۔۔۔۔

(روس)

منجانب: امریکی سفیر، ماسکو
برائے وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 26.5.1969
(محدود اطلاع)

روسی اخباروں نے سوڈانی انقلاب کی خبر کو خوب اچھالا ہے۔ روسی خبر رساں ایجنسی "تاس" نے وزیر اعظم عوض اللہ کے خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ سوڈان علمی طریقے سے مسائل کا حل تلاش کرے گا اور اقتصادی بحران پر قابو پائے گا اس کے ساتھ ساتھ یہاں بادشاہت کے نظام کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔ تاس کے مطابق عوض اللہ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ سوڈان اپنے پڑوس میں انقلابی اور ترقی پسند ممالک کی جانب دست تعاون بڑھائے گا اس کے ساتھ ساتھ فلسطینی عوام کی تائید کی جائے گی سوڈانی انقلاب کو عوام کی بھرپور تائید حاصل ہے۔ ماسکو کے ردعمل سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ روسی سوڈانی انقلاب سے خوش ہیں خاص طور پر عوض اللہ کے بائیں بازو سے متعلق افکار پر۔

(روس یا چین؟)

منجانب: وزارت خارجہ، واشنگٹن
برائے امریکی سفیر، ماسکو
تاریخ: 28.5.1969
(خاص)

واشنگٹن میں روسی سفارتخانے کا اتاشی میکالیوف ہنگامی طور پر امریکی وزارت خارجہ آیا

تھااور شرق الاوسط کے شعبے کے انچارج سے سوڈانی انقلاب کے بارے میں گفتگو کرتا رہا اس کا کہنا تھا کہ امریکی ابھی تک سمجھتے ہیں کہ اس انقلاب کے پیچھے روسی منصوبہ کارفرما تھا۔ جس پر شرق الاوسط کے شعبے کے انچارج نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہماری معلومات کے مطابق انقلابی قوم پرست نوجوان ہیں اس لئے یہ بات پوری طرح نہیں کہی جاسکتی کہ یہ بائیں بازو کا انقلاب ہے۔

میکالیوف نے سوال کیا کہ اگر ہم یہ تصور کریں کہ یہ انقلاب روس یا چین کی جانب مائل ہے تو؟ اس پر متعلقہ شعبے کے انچارج نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا میکالیوف کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں خرطوم میں روسی سفارتخانے سے یہ سوال کرے۔ میکالیوف نے کہا کہ واشنگٹن کے روسی سفارتخانے میں ابھی تک روسی وزارت خارجہ یا خرطوم کے روسی سفارتخانے سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی ہے۔

(پڑوسی ممالک کے خدشات)

منجانب: امریکی سفیر، ادیس ابابا

برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن

تاریخ: 28.5.1969

(خفیہ)

آج میں نے وزیر خارجہ کیتیما سے ملاقات کی جس میں انہوں نے سوڈان کے انقلاب پر سخت تشویش کا اظہار کیا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ انقلاب کمیونسٹوں کا برپا کیا ہوا ہے کیونکہ کمیونسٹ مشرقی جرمنی نے بھی نہ صرف اس انقلاب کی تائید کی ہے بلکہ سوڈان کو اسلحہ سپلائی کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔ جس سے سوڈان کے پڑوسی ممالک کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ گذشتہ سال امریکی وزارت دفاع نے ایتھوپیا میں اسلحے کی فیکٹریاں لگانے کے منصوبے کی مخالفت کی تھی۔ اب امریکہ کے دوست ہیل سلاسی کی حکومت پھر امریکہ کو دعوت دیتی ہے کہ یہاں اسلحہ ساز فیکٹریاں لگائی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ سوڈان میں انقلابی اقلیت میں ہیں اس لئے ان کی زیادہ توجہ فوج پر ہی مرکوز رہے گی۔

(نیٹو کی تشویش)

منجانب: امریکی سفارتخانہ، خرطوم

برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن

تاریخ: 29.5.1969

(خفیہ)

نیٹو کے ممبر ممالک کے سفیروں کا خرطوم میں ہنگامی اجلاس ہوا ہے جس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا ہے کہ انقلابیوں کو سوڈان میں مکمل رسوخ حاصل ہے اور یہ نظام طویل عرصے تک رہے گا۔

نئے انقلابی نظام میں ایسا تاثر پایا جارہا ہے کہ جیسے اب سوڈان اور باہر کی دنیا میں کمیونسٹ انقلاب کی بازگشت کا جواب دیا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم کا نام اب کم لیا جارہا ہے اور اس انقلاب کو عرب قوم پرستی کی جانب موڑا جارہا ہے۔ ہمارا ابھی یہی خیال ہے کہ یہ انقلاب کمیونزم کی جانب مائل تو ہے مگر سو فیصد کمیونسٹ انقلاب نہیں ہے، کیونکہ نئی کابینہ میں دس وزیر کمیونسٹ ہیں، ابھی تک ہم نے حالات پر نظر رکھی ہوئی ہے۔

(مشرقی یورپ)

منجانب: امریکی سفیر، صوفیا

برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن

تاریخ: 29.5.1969

(خاص)

بلغاریا کی حکومت سوڈان کے انقلاب پر خاص نقطہ نظر کی حامل ہے۔ چار ماہ قبل بلغاریہ کے صدر نے سوڈان کا دورہ کیا یہ دورہ سوڈانی صدر الازھری جو انقلاب میں معزول کردیئے گئے ہیں کے دورے کے جواب میں کیا گیا تھا۔

بلغاریہ کے اخبارات نے سوڈانی انقلاب کو خاص کوریج دی ہے ان اخبارات میں ایسے نقشے بھی شائع کیے ہیں جن پر سوڈان کے محل وقوع کی نشاندہی کی گئی ہے مشرقی جرمنی پہلے ہی

سوڈان کی انقلابی حکومت کو تسلیم کر چکا ہے، عرب انقلابی حکومتیں سوڈان کا نام بدل کر اسے ''جمہوریہ سوڈان'' کا نام دینے کی تجویز پیش کر رہی ہیں۔

(روسی ٹیلی گرام)
منجانب: امریکی سفیر، ماسکو
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 2.6.1969
(محدود اطلاع)

روسی اخباروں نے صدر پڈگورنی اور وزیر اعظم کوسیگن کے دو ٹیلی گرام شائع کئے ہیں جو کرنل جعفر نمیری اور وزیر اعظم عوض اللہ کو ارسال کئے گئے تھے ان میں انقلاب کی کامیابی کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا اور دونوں ملکوں کے درمیان مستقبل میں بہتر تعلقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ کوسیگن نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ ان کا ملک سوڈان کی ہر شعبے میں مدد کرے گا تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات مضبوط اساس پر قائم رہ سکیں۔

روسی اخبار پراودا نے انقلاب کو سوڈان کی ترقی کا سنگ میل قرار دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے تبصرہ کیا ہے کہ اسرائیل کے خلاف لڑنے والی قوتوں کو اس انقلاب سے تقویت حاصل ہوگی اور شرق الاوسط میں پی ایل او کی اہمیت بڑھے گی۔ اس اطلاع کا لب لباب یہ ہے کہ علاقے میں اس انقلاب سے روسیوں کے دوست ممالک میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔

(خلیل عثمان بیروت میں)
منجانب: امریکی سفیر، بیروت
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 6.6.1969
(خفیہ)

کویت میں مقیم مشہور سوڈانی سرمایہ کار خلیل عثمان نے، جو گلف انٹرنیشنل کمپنی کا بڑا

عہدیدار بھی ہے، یہاں قائم مقام سفیر سے ملاقات کی جس میں اس نے اپنے دورہ خرطوم کی رپورٹ پیش کی تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق کل اس کا دورہ اختتام پذیر ہوا تھا، اس دورے کے دوران اس نے انقلابی قیادت کے بعض افراد سے ملاقات بھی کی۔ اس نے کہا ہے کہ انقلابی قیادت نے اس بات کو مسترد کیا ہے کہ ان کا تعلق کمیونسٹ عناصر سے ہے ان کا نظریہ ہے کہ وہ قوم پرست اشتراکی ہیں۔ خلیل عثمان نے کہا ہے کہ عسکری قیادت کمیونسٹ عناصر کے زیر اثر ہے اور یہ اثر تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ کل وہ واپس کویت جا رہا ہے جہاں وہ امریکی سفیر سے ملاقات کرے گا مگر دورہ خرطوم کے دوران وہ ''بعض وجوہات'' کی بنا پر امریکی سفارتخانے کے قریب نہیں گیا۔

(حسن الترابی)
منجانب: شعبہ جاسوس، وزارت خارجہ واشنگٹن
برائے: امریکی وزیر خارجہ
تاریخ: 9.6.1969
(خفیہ، داخلی، سفارتخانوں کے لئے نہیں ہے)

سابق سوڈانی وزیر اعظم اور الانصار کے رہنما الصادق المہدی کو گرفتار کر لیا گیا ہے، ان کا موقف ہے کہ عسکری قیادت سوڈان میں تقلیدی اور روایتی مراکز اور اداروں کو تیزی کے ساتھ جدید شکل دے کر بنیادی تشخص کو خراب کر رہی ہے اس سلسلے میں اس کی مشیر ملک کی کمیونسٹ پارٹی ہے، یہ تنظیم خاصی منظم ہے۔

نئے نظام کے حق میں ہونے والے مظاہروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ملک کے شمالی حصوں میں زیادہ مقبول ہے جہاں پر طلبہ اور مزدور تنظیموں کا زور ہے، ریلوے کے پچاس ہزار ملازمین جو کمیونسٹ نہیں ہیں مگر انہوں نے بھی نئے نظام کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے اس وقت نئے نظام کے خلاف پورے ملک میں صرف ایک قوت ہے اور وہ ہے اسلامی تحریک اخوان المسلمین جس کی قیادت ڈاکٹر حسن الترابی کرتے ہیں انہیں بھی عسکری قیادت نے قید کر رکھا ہے۔

(سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی)

منجانب: وزارت خارجہ، واشنگٹن
برائے: امریکی سفارتخانہ، خرطوم
تاریخ: 11.6.1969
(خفیہ)

سوڈان کے انقلاب کے بعد آپ لوگوں کی بھیجی جانے والی رپورٹیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔مگر گذشتہ ہفتے جو رپورٹ ہمیں موصول ہوئی ہے اس نے خاصا تشویش میں مبتلا کر دیا ہے یہ رپورٹ سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے بارے میں ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ایسی رپورٹیں بھی موصول ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور انقلابی قیادت میں کچھ اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں ایسے اختلافات کمیونسٹ پارٹی کے اندر بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ صورتحال اب تک ہم پر واضح نہیں ہے، رپورٹیں زیادہ تر ابتدائی حالات پر مبنی ہیں۔اس لئے سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں مزید تفصیلات ارسال کی جائیں اس کے علاوہ اس پارٹی کے سوڈانی قیادت پر اثرات اور مستقبل کے احتمالات پر تفصیلات بھی ارسال کی جائیں۔

منجانب: شعبہ جاسوسی، وزارت خارجہ
برائے: امریکی وزیر خارجہ
تاریخ: 1.6.1969
(خفیہ، سفارتخانوں کے لئے نہیں ہے)

سوڈان کے بائیں بازو کے انقلاب نے کینیا، صومالیہ اور ایتھوپیا میں سوویت اثرات کی راہ ہموار کر دی ہے جو پہلے ہی بحر ہند اور بحیرہ روم میں بڑھتا جا رہا ہے۔روس نے افریقہ کے اس علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایک مغرب نواز حصہ جس میں ایتھوپیا اور کینیا آتے ہیں اسلامی حصہ جس میں سوڈان اور صومالیہ آتے ہیں۔سوڈان کے انقلاب سے پہلے روسی ان علاقوں میں خاصے متحرک رہے ہیں۔صومالیہ میں ان کی سرگرمیاں کسی سے پوشیدہ نہیں

ہیں۔جہاں تک اتھوپیا کا تعلق ہے تو روسی یہاں ہیل سلاسی کی بادشاہت کا خاتمہ چاہتے ہیں، جبکہ کینیا میں جاموکنیاتا کا زوال انہیں مقصود ہے۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سوویت یونین ان تبدیلیوں میں اضافہ کے لئے مزید فعال ہوگا۔

(مصریوں کی آراء)

منجانب: امریکی سفارتخانہ، قاہرہ
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 12.6.1969
(خاص)

آج صبح میں نے صدر جمہوریہ کے مشیر حسن صبری الخولی سے سوڈانی انقلاب کے بارے میں اس کی رائے دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ سوڈان کی انقلابی کونسل میں کوئی کمیونسٹ شامل نہیں کیا گیا ہے، وزیراعظم کی کابینہ میں صرف تین کمیونسٹ ہیں۔

اس نے کہا کہ مصری وزیراعظم عوض اللہ کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ نہیں ہے۔عرب قومیت کا نظام مغرب کا دشمن نہیں ہے۔

میں نے اسے کہا کہ سوڈان کا نمیری انقلاب عراق کے عبدالکریم قاسم کے انقلاب سے خاص مشابہ ہے عبدالکریم قاسم نے انقلاب کے شروع میں مصریوں کے ساتھ دوستی دکھائی تھی مگر جلد ہی اس نے ان سے رجوع کر کے مصری ماہرین کو عراق سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور کمیونسٹوں کو نوازنا شروع کر دیا تھا۔

میری اس بات پر خولی کافی دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا کہ ''جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت سے ہٹ کر نہیں ہے''۔خولی کا کہنا ہے کہ مصری نمیری کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔حیرت کی بات ہے کہ عسکری پس منظر ہونے کے باوجود خولی عسکری قیادت کو سیاسی مقاصد کے لئے پائدار قرار نہیں دیتا۔

www.kurfku.blogspot.com

منجانب: امریکی سفارتخانہ، خرطوم
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 12.6.1969
(خفیہ)

احمد المیرغنی کے بھائی محمد عثمان المیرغنی نے کل مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا جس کے دوران اس نے بتایا کہ اس نے نئی حکومت کی تائید کی ہے کیونکہ وزیراعظم عوض اللہ نے اسے ایسا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ نئی حکومت میں کمیونسٹ عناصر موجود ہیں۔ اس نے کہا کہ وزیراعظم عوض اللہ نے اسے کہا کہ اس کے والد علی المیرغنی اور اس کے تعلقات باپ بیٹوں کی طرح سے تھے، اور عوض اللہ کبھی بھی کمیونسٹوں کو اقتدار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔

اس بات کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ دونوں بھائی سیاسی طور پر اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اقتدار میں بڑا حصہ پا سکیں مگر کمیونزم کے خلاف دینی نقطہ نگاہ سے کام کرنے میں مخلص ہیں۔ اگر انہیں محسوس ہوا کہ قیادت میں کمیونسٹوں کو زیادہ حصہ دیا جا رہا ہے تو یہ اس کے خلاف بڑی تعداد میں لوگ سامنے لا سکتے ہیں۔ ان کا والد اپنے دور میں مصر کی جانب خوب راغب تھا۔

(منصور خالد)

منجانب: امریکی سفارتخانہ، خرطوم
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 18.6.1969
(خاص)

آج منصور خالد مجھ سے ملاقات کے لئے آیا تھا یہ سابقہ حکومت کے دور میں بڑا حکومتی اہلکار تھا آخری سالوں میں پیرس میں یونسکو کے ساتھ بھی کام کرتا رہا ہے اس نے بتایا کہ وہ کولوراڈو یونیورسٹی جا رہا ہے جہاں وہ چند ہفتے قیام کرے گا اس کے بعد یونسکو پروگرام کے تحت ادیس ابابا آجائے گا۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ موجودہ انقلابی حکومت کے لئے کام کر رہا ہے کیونکہ نمیری اور اس

KURF

www.facebook.com/kurf.ku

کے انقلابی ساتھیوں نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے اس لئے کمیونسٹوں کے غلبے کا اب زیادہ خطرہ نہیں رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اور نمیری ایک ساتھ مدرسے میں پڑھتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے دوست ہیں اس لئے نمیری نے مجھے کسی بھی قسم کے دباؤ سے دور رکھا ہوا ہے اس لئے کولوراڈو سے واپسی پر میں اس کے لئے کچھ کرنے کا سوچوں گا۔ نمیری چاہتا ہے کہ میں اس کے مشیروں میں شامل ہو جاؤں۔

(الامام الھادی المھدی)

منجانب: امریکی سفارتخانہ، خرطوم
برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن
تاریخ: 22.7.1969
(خفیہ)

الانصار پارٹی کے رہنماء امام الھادی المھدی کے سابق ذاتی سیکریٹری عبدالمنعم حسن معنی امریکی سفارتخانے آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ امام کی جانب سے پیغام لائے ہیں کہ ہم نئے عسکری نظام کی مخالفت کر رہے ہیں، وہ ہم سے اپوزیشن والوں کی سرگرمیوں کی میڈیا کوریج کے لئے مدد کے طلب گار تھے۔ سفارتخانے کے ایک آفیسر نے انہیں کہا کہ امریکہ دوسرے ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔

اس رپورٹ کا لب لباب یہ ہے کہ امام المھدی جزیرہ ابا میں اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر رہے ہیں مگر بعض باخبر ذرائع کے مطابق وہ سوڈان کی فوجی قیادت کے خلاف عسکری قدم اٹھانے سے قاصر ہیں۔

(عبدالخالق محجوب)

منجانب: شعبہ جاسوسی، وزارت خارجہ
برائے: امریکی وزیر خارجہ
تاریخ: 20.6.1969
(خفیہ، سفارت خانوں کو ارسال نہیں کی جا رہی)

سوڈان کی نئی حکومت میں نو یا دس وزراء کمیونسٹ

علم و دانش

موں کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔حکومت نے جنوب کو داخلی خودمختاری اور جمہوری رٹی منظم کرنے کا عندیہ دیا ہے یہ تمام افکار کمیونسٹوں نے اختیار کئے ہوئے تھے۔

مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ سوڈانی حکومت نے بہت سے معاملات میں خاموشی ختیار کر رکھی ہے۔ایک ہفتہ قبل جمہوری پارٹی کے جنرل سیکریٹری عبدالخالق محجوب نے ماسکو میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک اجلاس میں شرکت کی اور کہا کہ سوڈان اس وقت جمہوریت کے دور سے گذر رہا ہے اس کے لئے یہاں ایسے ہی انقلاب کی ضرورت تھی۔

عبدالخالق محجوب کے بارے میں پتا چلا ہے کہ اس کی جماعت نے انقلاب میں کسی قسم کی مدد نہیں کی یہ شاید اس خوف کی وجہ سے تھا کہ سوڈانی عوام اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔

(جمال عبدالناصر)

منجانب: وزارت خارجہ، واشنگٹن

برائے: امریکی سفارتخانہ، قاہرہ

تاریخ: 17.9.1969

(خفیہ)

خرطوم کے امریکی سفارتخانے نے ہمیں ایک ٹیلی گرام ارسال کیا ہے اس کی ایک کاپی آپ تک بھی پہنچ چکی ہے اس پیغام میں کہا گیا ہے کہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے کرنل نمیری کو خبردار کیا ہے کہ وہ ملک میں کمیونسٹ اثرات پھیلنے سے روکیں۔یہ بات انہوں نے قاہرہ میں منعقد ایک علاقائی کانفرنس کے دوران کہی جس میں قذافی اور نمیری بھی موجود تھے۔

اس کانفرنس کے بارے میں اگر مزید معلومات ہیں تو جلد از جلد ہمیں ارسال کی جائیں۔

(کرنل حسن الزین)

منجانب: امریکی سفارتخانہ، جدہ

برائے: وزارت خارجہ، واشنگٹن

تاریخ: 22.12.1969

(خفیہ)

جدہ میں مقیم سوڈانی فوج کے ریٹائرڈ کرنل حسن الزین نے امریکی سفارتخانے میں ایک اہلکار سے ملاقات کی اور نئے عسکری نظام کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لئے امریکہ سے فوجی امداد کی درخواست کی۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ ریٹائرڈ کرنل ہے اور برطانوی فوج کے ساتھ دوسری جنگ عظیم میں افریقہ کے فرنٹ پر جنگ لڑ چکا ہے۔الزین سفارتخانے کے کونسلر سے ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر امریکی سفارتخانے نے اپنے تمام اہلکاروں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ الزین کے ساتھ اس موضوع پر دوبارہ بات چیت نہ کریں۔

ΩΩΩ

امریکی خفیہ دستاویزات

جمال عبدالناصر اور امریکی وزارت خارجہ

جمال عبدالناصر کا بھائی

منجانب: دفتر برائے امریکی مفادات۔قاہرہ
برائے وزیر خارجہ۔واشنگٹن
(خاص)
تاریخ:7-1-1969

آج جمال عبدالناصر نے امریکی طبیب کی خدمات حاصل کرنے کا کہا ہے تا کہ کار حادثے میں زخمی ہونے والے اپنے بھائی اللیثی کا علاج کرایا جاسکے اللیثی کی عمر 47 برس ہے، زخموں کی پیچیدگی کی وجہ سے مصری ڈاکٹروں نے ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ اللیثی کی کھوپڑی میں خون جم چکا ہے جبکہ وہ شوگر کا مریض بھی ہے۔یہ حادثہ اسکندریہ میں پیش آیا تھا جہاں ابتدائی علاج میں ڈاکٹروں کی غفلت کی وجہ سے ناصر کے بھائی کی حالت بگڑ گئی۔اطلاعات کے مطابق صدر ناصر اس سلسلے میں امریکی ڈاکٹروں کی خدمات تو حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر خفیہ طور پر۔اس سلسلے میں ہم نے امریکی بحریہ کے ایک ڈاکٹر کو سویلین کپڑوں میں قاہرہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جو عام فلائٹ سے قاہرہ جائے گا۔

اسرائیل کے ساتھ صلح

منجانب: امریکی سفارتخانہ۔بلغراد
برائے وزیر خارجہ۔واشنگٹن
تاریخ:18-1-1969

ناصر کے موقف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے میں نے یہاں تیونس کے سفیر ھگلعموری سے ملاقات کی ہے اس نے بھی ایسی ہی معلومات بہم پہنچائیں جو ہمارے سفیر گارفی مقیم لندن نے حاصل کی ہیں۔ایسی ہی معلومات مجھے اسسٹنٹ وزیر خارجہ یوگوسلاویہ دراندستش سے حاصل ہوئیں ہیں جو اس طرح ہیں:

1۔صدر ناصر اسرائیل کے ساتھ سیاسی حل کے لئے تیار ہیں۔

2۔عبدالناصر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پورا ادراک رکھتے ہیں کہ مصری عوام اور دوسرے متشدد ملک جن میں عراق اور شام شامل ہیں ان اقدامات کی سخت مخالفت کریں گے۔

3۔ان تمام باتوں کے ساتھ صدر ناصر کو مصر میں بڑھتے ہوئے روسی اثر و نفوذ پر تشویش بھی ہے۔

4۔صدر ناصر اسرائیل کے ساتھ بلاواسطہ مذاکرات کی تجویز کو مسترد نہیں کریں گے (جزیرہ روڈس کے مذاکرات کی طرح) جو عملی طور پر نیویارک میں اقوام متحدہ کے مرکز میں شروع ہوئے تھے۔

5۔ہوسکتا ہے کہ صدر ناصر یوگوسلاویہ سے درخواست کریں گے اسرائیل کے مذاکرات کے دوران وہ شام اور عراق کو ان پر تنقید سے باز رکھے۔

امریکہ اور اسرائیل

منجانب: امریکی وزیر خارجہ

برائے صدر نکسن

(خفیہ)

تاریخ: 25-1-1969

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ایلچی سکرانٹن کو صدر ناصر نے جواب دیا ہے کہ وہ امریکہ کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اسے انہوں نے اس بات سے مشروط کیا ہے کہ امریکہ اپنی سیاسی پالیسی میں اسرائیل کی عرب مقبوضہ علاقوں پر توسیع کی پالیسی پر تنقید کرے۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ 5-1-1969 میں صدر ناصر نے آپ کو ایک خط ارسال کیا تھا جو تنقید اور مصالحت دونوں قسم کے موضوعات سے معمور تھا (اس کا ترجمہ ساتھ ہے) آپ کے انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد اور ایلچی روانہ کرنے کے بعد ہی انہوں نے بات چیت پر رضا مندی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عرب اسرائیل معاملے میں امریکہ کی پالیسی مشکل صورتحال کی جانب گامزن ہے۔

اللیثی دوسری مرتبہ

منجانب: وزیر خارجہ۔ واشنگٹن

برائے ہنری کسنجر۔ وائٹ ہاؤس

(خاص۔ محدود تقسیم)

تاریخ: 31-1-1969

قاہرہ کے دفتر برائے امریکی مفادات سے آپ کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا گیا ہے جس میں صدر ناصر کے اس خطاب کا متن شامل ہے جس میں انہوں نے صدر نکسن اور متعلقہ امریکی حکام کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے ان کے بھائی اللیثی کے علاج کے لئے تعاون کیا۔

صدر ناصر کا بھائی ایک کار حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا مصری اور ایک برطانوی

ڈاکٹر کے مطابق اللیثی جلد موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ اسی دن شمالی واشنگٹن میں واقع امریکی بحریہ کے ہسپتال سے شعبہ سرجری کے ڈائریکٹر تھیوڈور ویلسن اور دماغی امراض کے ماہر فرانسیس سین قاہرہ پہنچے ان دونوں کی کوششوں سے اللیثی صحت یاب ہو سکا جس نے صدر ناصر کو بھی حیرت زدہ کر دیا اور وہ اس معاملے میں خاصے خوش نظر آتے ہیں۔

ہیکل اور نیوز ویک کا انٹرویو

منجانب: شعبہ جاسوسی وزارت خارجہ۔ واشنگٹن

برائے۔ وزیر خارجہ

(خاص۔ سفارتخانوں کے لئے نہیں ہے)

تاریخ: 6-2-1969

اسی دن جریدہ نیوز ویک شائع ہوا (تین روز قبل) جس میں صدر ناصر کا انٹرویو شائع کیا گیا ہے (انٹرویو ڈی بورچ گراف نے کیا) اسے مصری سرکاری نیوز ایجنسی ''انباء الشرق الاوسط'' نے بھی جاری کیا ہے۔ جس میں انٹرویو کا متن شائع نہیں کیا گیا اس میں تقریباً 75 جگہ تبدیلی کی گئی ہے جبکہ یہ انٹرویو 35 سوالوں پر مشتمل ہے۔

اس انٹرویو میں ترجمے کی وجہ سے تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ انٹرویو انگریزی زبان میں تھا اور اس کا ترجمہ مصری ایجنسی نے عربی میں کیا۔ اس کا دوسرا ترجمہ ہماری ایجنسی ''فبیس FIBS'' نے بھی انگریزی میں کیا ہے۔ نیوز ویک کے بین الاقوامی امور سے تعلق رکھنے والے رابرٹ کرسٹوفر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس نے اس انٹرویو کا ایک نسخہ محمد حسنین ھیکل کو بھیجا تھا جو صدر ناصر کا قریبی مشیر تصور کیا جاتا ہے اس نے صدر ناصر کے ان بیانات کا تذکرہ کیا ہے جو وہ اب تک اسرائیل کے بارے میں غیر اعلانیہ طور پر کرتے رہے ہیں مگر پہلی مرتبہ صدر ناصر نے یہ باتیں کھلے طور پر کی ہیں۔

شاہ فیصل

منجانب: امریکی سفارتخانہ۔جدہ
برائے وزیر خارجہ۔واشنگٹن
(خاص)

تاریخ: 18-2-1969

مصر میں سعودی عرب کے سفیر محمد علی رضا نے گذشتہ رات کو کہا ہے کہ مصری وزیر خارجہ محمود ریاض جلد سعودی عرب کا دورہ کریں گے جس میں شاہ فیصل سے ملاقات کر کے انہیں صدر ناصر کی عرب کانفرنس کے انعقاد کے لئے درخواست پیش کریں گے شاہ فیصل ناصر کی اسرائیل کے ساتھ مصلحت کی سوچ کی تائید نہیں کریں گے۔سعودی سفیر نے کہا کہ شاہ فیصل مصری وزیر خارجہ کو جو جواب دیں گے وہ اس طرح ہے کہ:

1۔ناصر نے خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کرتے وقت سعودی عرب سے مشورہ نہیں کیا تھا (جو جنگ کا ایک بڑا سبب تھا)۔

2۔اب ناصر خود اسرائیل کے ساتھ کسی بھی معاہدے کی ذمہ داری قبول کرے۔

3۔سعودی عرب ناصر کی قرارداد سے اتفاق کرلے گا۔

نیویارک ٹائمز کو انٹرویو

منجانب: دفتر برائے امریکی مفادات۔قاہرہ
برائے وزارت خارجہ واشنگٹن
(محدود تقسیم)

تاریخ: 28-2-1969

آج نیویارک ٹائمز کے مدیر اعلیٰ سولز برگر نے مجھ سے ملاقات کی ہے جس میں اس نے مجھے صدر ناصر کے انٹرویو کا ایک حصہ سنایا جو انہوں نے دو گھنٹے کی ملاقات میں اس کو دیا تھا۔اس نے بتایا کہ صدر ناصر نے جو بات نیوز ویک کو کہی تھی وہی تقریباً اسے کہی ہے کوئی نئی بات نہیں تھی۔اس کے خیال میں صدر ناصر کو یقین ہے کہ اسرائیل کے بارے میں امریکی سیاسی

حکمت عملی میں کچھ تبدیلی ضرور واقع ہوگی اس لئے اسرائیل کو فینٹم طیاروں کی سپلائی صدر ناصر کی سوچ کو متاثر کرسکتی ہے۔

برگر کے مطابق صدر ناصر کی صحت زیادہ اچھی نہیں ہے اور ان کا وزن کافی بڑھ چکا ہے۔نیند کی گولیاں اور سگار کا استعمال بھی صدر ناصر نے بند کردیا ہے جس کی کمی وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔برگر نے بتایا کہ اس نے محسوس کیا ہے کہ ناصر اسرائیل کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کوئی ایسی بات ہوسکتی ہے۔

اشرف غربال

منجانب: وزارت خارجہ۔واشنگٹن
برائے امریکی سفارت خانے، لندن، قاہرہ، پیرس، تل ابیب۔
(خفیہ)

تاریخ: 4-3-1969

آج یہاں ہماری مصری نمائندے اشرف غربال سے ملاقات ہوئی ہے جس میں نیوز ویک کو دیئے گئے انٹرویو کا حوالہ شامل تھا۔اشرف غربال نے کہا کہ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ صدر ناصر نے اعلانیہ اسرائیل کے ساتھ مشروط مذاکرات کی بات کی ہے۔اشرف غربال نے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں صدر ناصر کا یہ کہنا کہ ’’اگر اسرائیلی فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی کے لئے تیار ہوئے‘‘ ’’اگر اسرائیل مقبوضہ عرب علاقے خالی کردے۔تو یقیناً امن قائم ہوسکتا ہے ہم 1967ء سے پہلے کی سرحدوں کو تسلیم کرلیں گے‘‘۔

اسی دن ایک ٹیلی گرام کے ذریعے صدر ناصر کے بیانات کی تفصیلات معلوم کی گئی تھیں۔جس میں انہوں نے کہا کہ ’’جب میں امن کی بات کرتا ہوں تو یہ کوئی امن نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لئے اس پر عمل درآمد کرایا جائے گا۔جب ہم پناہ گزینوں اور عرب علاقوں کی واپسی کا مسئلہ حل کرلیں گے تو امن قائم ہوجائے گا‘‘۔

www.kurfku.blogspot.com

رابرٹ اینڈرسن

منجانب: وزارت خارجہ۔ واشنگٹن

برائے سفارتخانے قاہرہ، بیروت، جدہ، ماسکو، تل ابیب، اقوام متحدہ

(خفیہ۔ محدود تقسیم)

تاریخ: 27-3-1969

سابق وزیر خزانہ رابرٹ اینڈرسن، نائب وزیر سیسکو سے ملاقات کی اور صدر ناصر سے اپنی دو ملاقاتوں کا ذکر کیا جو 16 اور 18 مارچ کو کی گئی تھیں۔ اس نے کہا کہ اب ناصر کی صحت اچھی ہے اور امور پر گرفت بھی ہے بعض رپورٹوں میں اس کے بارے میں غلط کہا گیا تھا مگر وہ اس ناصر سے بالکل مختلف تھے جس سے میں دس برس قبل ملا تھا۔ اس نے کہا کہ ناصر باہر کی دنیا سے نالاں ہے وہ صرف اس بات پر یقین رکھتے ہیں جو رپورٹوں میں پڑھیں یا جو ان کے گرد موجود لوگ انہیں آگاہ کریں لیکن یہ لوگ انہیں حقیقت حال سے کم ہی آگاہ کرتے ہیں۔ صدر ناصر کو داخلی معاملات پر زیادہ تشویش ہے خاص طور پر جب سے طلبہ نے ان کے خلاف مظاہرے کئے تھے مظاہرین کا کہنا ہے کہ ناصر امریکی اثر میں داخل ہو رہے ہیں جبکہ کیوبا، ویت نام اور شمالی کوریا اس امریکی اثر کو رد کر چکے ہیں۔ جمال عبدالناصر نے ان سے کہا ہے کہ طالب علم کہتے ہیں امریکی میڈیا اسرائیل کے ساتھ ہے اس لئے عربوں کو چاہئے کہ وہ امریکہ سے کسی اچھی بات کی توقع نہ رکھیں۔

صدر ناصر نے ان سے صاف کہا ہے کہ وہ امریکہ کے ساتھ تعلقات کی بحالی چاہتے ہیں مگر اس سے پہلے طلبہ، مصری عوام اور مسلح افواج کی خواہشات کو پورا کرنا ہوگا۔

محمود فوزی

منجانب: وزیر خارجہ۔ واشنگٹن

برائے صدر نکسن۔ وائٹ ہاؤس

(خفیہ)

تاریخ: 11-4-1969

آج آپ مصری صدر کے مشیر برائے امور خارجہ محمود فوزی سے ملاقات کریں گے،

KURF

www.facebook.com/kurf.ku

یہ ملاقات مصریوں کی درخواست پر ہو رہی ہے۔ میں ان سے ملا ہوں مگر اس ملاقات میں کوئی گرمجوشی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ایسی خاص قسم کی بات نہیں کہی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ اسرائیل اور مصر کے درمیان امن مذاکرات کے لئے کسی پیش رفت سے کام لیا جارہا ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق ڈاکٹر فوزی اس سلسلے میں کسی متعین پالیسی کے تحت بات نہیں کریں گے بلکہ وہ عرب اسرائیل تنازعے کے سلسلے میں ہمارا موقف جاننے کی کوشش کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان سے کوئی تفصیلی بات چیت نہ کریں بلکہ گفتگو میں انہیں کہیں کہ اسسٹنٹ وزیر خارجہ سیسکو اس سلسلے میں ان سے تفصیلی ملاقات کریں گے۔

اس سلسلے میں دو نکات ایسے ہیں جو ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ ملاقات میں واضح کردیں:

1۔ کہ ہم سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر 242 کی حمایت کرتے ہیں جو علاقے میں پائیدار امن کے لئے ہے۔ اور اسرائیلی فوج کے عرب علاقوں سے انخلاء کے حامی ہیں۔

2۔ ہمارے خیال میں جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں مسئلے کے حل کی چابی ہے۔ اگر وہ اس بات کا خفیہ یا اعلانیہ اظہار کردیں کہ وہ اسرائیل کے ساتھ پائیدار امن کے لئے تیار ہیں تو باقی عرب ملک بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے انکار نہیں کریں گے۔

دوبارہ فوزی

منجانب: وزارت خارجہ۔ واشنگٹن

برائے امریکی سفارتخانے قاہرہ، جدہ، بیروت، تل ابیب (دس سفارتخانے اس کے علاوہ ہیں)

(خفیہ۔ محدود تقسیم)

تاریخ: 14-4-1969

تجزیئے کی حد تک ڈاکٹر فوزی کا دورہ واشنگٹن مفید ثابت ہوا ہے مگر اسے اس حد تک کامیاب نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ ڈاکٹر فوزی واشنگٹن صدر ناصر کے مشیر

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

نیویارک کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ روسی مصریوں سے زیادہ خوش نہیں ہیں کیونکہ مصریوں نے سویز کے علاقے میں اسرائیلیوں کا سامنا کرنے کے لئے روسی اسلحے کا بے دریغ استعمال کیا تھا روسی میزائلوں سے اسرائیلی طیارے گرائے تھے، جبکہ یہاں سام میزائلوں کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔

ایک ایسی بھی رپورٹ موصول ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ صدر ناصر ایک ایلچی ہماری جانب بھیجنا چاہتے ہیں جو ہم سے کہے گا کہ صدر ناصر مصری فوج میں روسی اثر ونفوذ سے تنگ آگئے ہیں اور اس سے خلاصی چاہتے ہیں۔ مگر یہ رپورٹ صحیح نہیں ہے۔

جبکہ ایک اور رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر ناصر روسی اثر ونفوذ سے خوش ہیں ا انہیں کسی قسم کی کوئی تشویش نہیں۔

روس میں علاج

منجانب امریکی سفارت خانہ۔ ماسکو

برائے وزیر خارجہ

(خفیہ)

تاریخ: 24-9-1969

ارما (ممکنہ طور پر جاسوس) سوویت ریاست جارجیا کے دارالحکومت تبلیسی سے وا آگیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ وہاں ایک رسمی پارٹی میں اپنی بیوی کے ساتھ شریک تھا ا کیلی فورنیا کی فرم امریکان پراسیس کا ڈائریکٹر رابرٹ روڈ بھی تھا اور وہاں کھلیوں کی ایک عال کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا تھا (یہ بھی جاسوس تھا) ارما نے کہا کہ روڈ نے اسے کہا کہ ا کے پاس ایک خطرناک راز ہے مگر ہوسکتا ہے کہ یہ روسی جاسوسوں کے ہاتھ لگ جائے جو ہا میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ارما کو ایک وزیٹنگ کارڈ دیا اور کہا کہ اس کی پشت پر جو ل ہے اسے پڑھ لینا میں نے ہوٹل واپس آکر جب کارڈ نکال کر پڑھا تو اس کی پشت پر لکھا تھا ''بہت جلد ناصر یہاں قریب ہی یعنی تسخالطوبو میں ہوگا جو شمال مغربی جارجیا کے قریب ہ کیونکہ وہ سخت بیمار ہے''۔ روڈ نے ارما کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے یہ راز کہاں سے حاصل کیا

جلد ہی واپس امریکہ آنے والا ہے پھر اس سے اس سوال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ھویدی، جمعہ اور شرف

منجانب: شعبہ جاسوسی، وزارت خارجہ۔ واشنگٹن

برائے وزیر خارجہ۔ واشنگٹن

(خفیہ۔ سفارتخانوں کے لئے نہیں ہے)

تاریخ: 20-10-1069

مصری تاریخ کے اعتبار سے جمال عبدالناصر کا دور اقتدار ابھی کم ہے مگر یہ طویل عرصے تک جاری رہ سکتا ہے جنگ میں شکست کے بعد ناصر کی عوام میں مقبولیت کم ہوئی ہے۔ وہ مصر کی اقتصادی اور سیاسی فلاح کے لئے بھی قابل قدر کام نہیں کر سکے ہیں۔

اس وقت جمال عبدالناصر کے انقلابی دوستوں میں سے دو باقی ہیں جو ان کے ساتھ ہیں۔ ناصر نے جاسوسی کے نظام کو توسیع دے کر اسے خاصا فعال بنالیا ہے وہ کسی بھی مصری شہری سے جب چاہے رابطہ کر سکتا ہے اس وجہ سے صدر ناصر کا بعض شخصیات پر انحصار بڑھ گیا ہے ان میں امین ھویدی، شعراوی جمعہ، سامی شرف شامل ہیں۔

ΩΩΩ

عاطف بسیسو

فلسطین کی جدوجہد آزادی کا دیومالائی کردار

30 اکتوبر 1991ء کو میڈرڈ میں ہونے والی امن کانفرنس کے بعد موساد نے پی ایل او کے خفیہ شعبے کے سربراہ صلاح خلف (ابوایاد) کے نائب عاطف بسیسو کو 8 جون 1992ء کی رات پیرس میں اس وقت قتل کیا جب وہ تیونس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک لمبے عرصے تک اس قتل کی تفصیلات دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔ اس امکان کو کوئی رد کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ کام موساد کا ہے مگر کیسے اور کن ذرائع کو استعمال کر کے کیا گیا؟ یہ کوئی نہیں جان سکا۔ موساد کے نزدیک عاطف بسیسو، تنظیم آزادی فلسطین کا آخری خطرناک کردار تھا جو اسرائیل کے لئے ایک طویل عرصے سے شکست و ہزیمت کی علامت بنا رہا۔ عاطف کا شمار تنظیم آزادیٔ فلسطین کے جنگجو گروپ ''الفتح'' کے اہم اراکین میں ہوتا تھا۔ ان ''خطرناک'' عناصر سے تنظیم آزادی فلسطین کو پاک کرنے کے بعد ہی اسرائیل نے 13 ستمبر 1993ء کو اوسلو میں پی ایل او کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کئے۔ سابق اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق شامیر نے عاطف بسیسو کی موت کے پروانے پر دستخط کے ساتھ ہی عملی سیاست سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا۔ انہوں نے اپنی عملی سیاست کی ابتداء بھی اقوام متحدہ کے نمائندے برائے قضیہ فلسطین کاؤنٹ برناڈوٹ کے قتل کے ساتھ کی تھی۔ دہشت گردی کا یہ دورانیہ

28 سالوں پر محیط رہا۔

عاطف بسیسو مقبوضہ فلسطین کے علاقے غزہ میں 1948ء کو ایک صاحب ثروت خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد چار سو سال قبل شام سے غزہ میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ بسیسو خاندان اپنی تعلیم اور تجارت کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس خاندان کے افراد نے عثمانوی دور میں شام اور استنبول کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ عاطف بسیسو کے والد فائق بسیسو اپنے وقت کے مشہور بنک، بنک الامۃ العربیہ کے ڈائریکٹر تھے۔ یہودیوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف اپنے وطن کی مدافعت کے جرم میں فائق بسیسو فلسطین پر برطانوی انتداب کے دوران تین مرتبہ جیل میں گیا۔ اس کے بعد وہ شمالی فلسطین میں طبریا کے مقام پر منتقل ہو گیا جہاں اس نے 1936ء میں فلسطین کی انقلابی قیادت سے روابط استوار کر لئے۔

1965ء میں الفتح ونگ کے خفیہ رکن صخر بسیسو نے تنظیم کی مالی امداد کے لئے عاطف کے والد فائق بسیسو سے غزہ میں رابطہ کیا۔ اس سے پہلے عاطف بسیسو صخر کے الفتح سے تعلق کے بارے میں ناآشنا تھا مگر اپنے والد کے دفتر میں انقلابی قسم کی گفتگو سننے کے بعد عاطف نے الفتح میں شمولیت کا ارادہ کر لیا۔ 1967ء تک عاطف بیروت یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ ان دنوں ان کا ایک گھر قاہرہ میں شارع عبدالغنی فہمی پر واقع تھا۔ اسے صخر بسیسو الفتح کے دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ نومبر 1967ء کو صخر فوجی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے دمشق چلا گیا۔ واپسی پر عاطف بسیسو کی عسکری تربیت کی گئی اور یوں 1968ء میں عاطف الفتح کا باقاعدہ رکن بن گیا۔ اسی سال ابوایاد بیروت میں الفتح کی تنظیم نو کے سلسلے میں وارد ہوئے جہاں ان کا عاطف بسیسو، نزار عمار، امیل خوری لمعی قمبرجی سے تعارف کرایا گیا۔ بیروت میں نزار عمار کو الفتح کی بیرونی رصد کا نگران مقرر کیا گیا۔ عاطف کو اس کے نائب کی حیثیت سے خدمات انجام دینی تھی۔ اس کے علاوہ عمار الفتح کے لئے خفیہ معلومات کے شعبے کا نگران بھی تھا جبکہ عاطف بسیسو الفتح کی خفیہ جنگی کاروائیوں کے نگران مقرر کئے گئے۔ اس مقصد کے لئے عاطف نے اپنے فیصلوں کی صوابدید پر فلسطینیوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ عاطف کے شعبے کا مقصد الفتح کے لئے جاسوسی کرنا اور اسرائیل کے خلاف خفیہ کاروائیوں کی نگرانی کرنا تھا۔ اس طرح ابتدائی دنوں سے ہی ابوایاد اور عاطف بسیسو کے درمیان ایک خاص تعلق پیدا ہوا جو دونوں

www.kurfku.blogspot.com

کی شہادت تک قائم رہا۔

1968ء میں ہی نزار عمار الفتح کی نئی شاخ قائم کرنے کی غرض سے بیروت سے اردن منتقل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اردن میں مالیاتی فنڈ اکٹھا کرنے اور تنظیم سازی کے لئے محمد عودہ' ابوداؤد' مہدی بیسو' ابوعلی' فخری العمری' ابومحمد' مرید الدجانی' ابورجائی' سفیان الآغا' مجدی نزار کو مقرر کیا۔ مصری خفیہ ایجنسی میں خدمات انجام دینے والے 12 فلسطینی نژاد افسر بھی اردن میں الفتح کے مرکز سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی کارکردگی کی بنیاد پر جلد ہی عاطف بسیسو لبنان میں الفتح کے مالیاتی فنڈ کے نگران بھی مقرر ہو گئے مگر جلد ہی ابوحسن سلامہ نے لبنان کے الفتح ونگ سے علیحدگی کا اعلان کر کے فلسطین کی جدوجہد آزادی کے لئے ایک الگ گروپ ''پاور-17'' کے نام سے تشکیل دے دیا۔ اس کے فوراً بعد ابوایاد نے لبنان میں الفتح کی تنظیم نو کی غرض سے عاطف بسیسو کی ذمہ داری لگائی۔ یوں عاطف براہ راست ابوایاد کی سربراہی میں کام کرنے لگا۔

1975ء تک عاطف نے فلسطینی کاز کے لئے اپنے کام کا دائرہ لبنان سے یورپی ممالک تک پھیلا دیا تھا۔ اسی دوران عاطف کی کوشش رہی کہ دنیا میں فلسطین کے انقلابی کا[رکنوں] کے لئے معاون بھرتی ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں اس نے یورپ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بائیں بازو کے عناصر سے کام لینا شروع کیا جبکہ لبنان میں خفیہ ٹھکانے بنائے گئے۔ ستمبر 1972ء کے میونخ اولمپکس میں مسلح فلسطینیوں نے اسرائیل کے گیارہ کھلاڑیوں کو یرغمال بنا لیا جنہیں بعد میں قتل کر دیا گیا۔ فلسطینیوں کی اس کارروائی کی وجہ سے میونخ اولمپک کی سرگرمیاں 48 گھنٹے کے لئے معطل ہو گئی تھیں۔ اس کارروائی کے بعد اسرائیلیوں نے پہلی مرتبہ عاطف بسیسو پر الزام عائد کیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف دہشت گردی کی وارداتوں میں ملوث ہے اسرائیلی کھلاڑیوں کی ہلاکت کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈالی گئی حالانکہ وہ اس کارروائی کے وقت تیونس میں تھا۔ اسرائیل نے اپنے تمام تر وسائل اپنے کھلاڑیوں کی ہلاکت کے پراپیگنڈے اور اس میں شرکت کرنے والے فلسطینیوں کے قتل پر صرف کرنے شروع کر دیئے۔ اسی آڑ میں اسرائیل پی ایل او کے ان لیڈروں کو بھی ٹھکانے لگانا چاہتا تھا جن کا براہ راست اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا عاطف بسیسو کا نام اس وقت سے موساد کی ہٹ لسٹ پر سرفہرست تھا۔

ستر کی دہائی کے شروع میں ہی پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان غیر اعلانیہ

KURF

www.facebook.com/kurfku

جنگ شروع ہو چکی تھی۔ یورپ اس کا بڑا مرکز تھا۔ فلسطینیوں کی کئی دوسری تنظیمیں بھی اس جنگ میں کود چکی تھیں۔ اسرائیل ان سے نمٹنے کے لئے ایک ٹاسک فورس بنا چکا تھا۔ 1973ء میں عاطف نے ''طیب الفرجان'' کے نام سے ایک عرب ملک کا پاسپورٹ حاصل کیا اور فلسطینی نوجوان جانبازوں کی ایک جماعت کے ساتھ اٹلی کے شہر روم میں وارد ہوا۔ یہاں ان کا مقصد روم ایئرپورٹ پر اسرائیل کے ایک بڑے فوجی طیارے کو نشانہ بنانا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ طیارہ اسرائیلی وزیراعظم گولڈا میئر کا تھا جسے ہلاک کرنا عاطف بسیسو کا مشن تھا جس نے روم میں واقع ایک عرب سفارتخانے سے میزائل حاصل کئے تھے مگر ایک میزائل اپنے ہدف پر داغنے سے پہلے جس کپڑے میں لپیٹا گیا تھا وہاں سے گر کر زمین پر آ پڑا۔ یہ روم کا ایک گنجان علاقہ تھا جہاں یہ جہاز اڑان بھرنے کے بعد اوپر سے گزرتا تھا۔ پولیس نے فوراً عاطف اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کر کے گرفتار کر لیا۔ جیل میں سخت اذیت ناک مرحلے سے گزرنے کے باوجود عاطف نے اپنے آپ کو فلسطینی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ اسی ملک کا باشندہ ہے جس کا اس کے پاس پاسپورٹ ہے۔ بعد میں موساد اس شک پر کہ یہ عاطف ہی ہے تفتیش میں شامل ہو گئی۔ اپنے ذرائع کی بنیاد پر انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ عاطف ہی ہے نہ کہ طیب لافرجان جس کے پاس عرب ملک کا پاسپورٹ ہے مگر عاطف نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ روم میں قید کے دوران عاطف کو شیخ زکریا فلسطینی نے جو خود بھی اٹلی کی جیل میں رہ چکے تھے' عاطف کو پیغام بھجوایا کہ اسے قتل کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ موساد جب یہ ثابت کرنے میں ناکام ہو گئی کہ عاطف کا تعلق الفتح سے ہے تو اس نے ایک دوسری چال چلی۔ عاطف بسیسو کی والدہ کو غزہ میں کہا گیا کہ وہ روم میں قید اپنے بیٹے سے ملاقات کرے تا کہ اٹلی کی عدالت میں یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہی ملزم فلسطینی دہشت گرد ہے مگر عاطف کی والدہ نے سارا معاملہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراف کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کا بیٹا اٹلی کی جیل میں قید ہے۔ اٹلی کی حکومت نے الزام ثابت نہ ہونے پر عاطف کو رہا کرتے ہوئے اٹلی کے فوجی جہاز پر لیبیا کے لئے روانہ کر دیا۔ یہ طیارہ مالٹا میں برطانیہ کے فضائی مستقر پر بھی اترا تھا۔ طیارے میں عاطف کے علاوہ اٹلی کے سیکورٹی کے ارکان اور ایک عسکری وفد بھی ساتھ تھا۔ بن غازی ایئرپورٹ پر عاطف کو اتارنے کے بعد یہ طیارہ جب واپس جانے کے لئے اڑا تو چند منٹوں بعد ہی فضا میں دھماکے

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

سے پھٹ گیا اور اٹلی کے سیکورٹی ارکان کے ساتھ عسکری وفد بھی ہلاک ہو گیا۔ عاطف اس حادثے سے حیرت انگیز طور پر محفوظ رہا۔ عرب حلقوں کے مطابق چونکہ اسرائیل کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ طیب نامی شخص اصل میں عاطف ہی ہے اس لئے کچھ نہ ہونے پر انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ اس کے طیارے کو دوران پرواز تباہ کر دیا جائے مگر بم اپنے مقررہ وقت پر پھٹ نہ سکا جس کی وجہ سے عاطف کی جان تو بچ گئی مگر باقی عملہ مارا گیا۔

1974ء میں مراکش کے شہر رباط میں عرب سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تنظیم آزادی فلسطین کی آزادی کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد یاسر عرفات نے امریکہ کا دورہ کیا جہاں انہوں نے اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے نمائندہ کے طور پر تاریخی خطاب کیا۔ جس کے بعد پی ایل او کو بین الاقوامی سطح پر بھی فلسطینی عوام کا نمائندہ تسلیم کر لیا گیا۔ یوں پی ایل او اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے بین الاقوامی برادری کا حصہ بن گئی۔ اب پی ایل او اور بین الاقوامی برادری کے درمیان تعلقات کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ پی ایل او نے اس مرحلے پر فلسطینی کاز کو آگے بڑھانے کے لئے صلاح حلف (ابوایاد) کی سربراہی میں متحدہ سیکورٹی کا نظام قائم کیا۔ یہاں بھی عاطف بسیسو کو ابوایاد کا نائب مقرر کیا گیا۔ اس نظام کے ساتھ ہی عاطف کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا کیونکہ اب عرب اور باقی دنیا سے تعلقات استوار کرنے کا وقت تھا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ موساد کی تخریبانہ کارروائیوں کا سدباب بھی کرنا تھا۔ پی ایل او بڑی حد تک یہ جان چکی تھی کہ فلسطینی جدوجہد کے خلاف دنیا بھر میں موساد کے جاسوسی نیٹ ورک کو توڑنے کی صلاحیت صرف عاطف بسیسو کو ہی حاصل ہے اس مقصد کے لئے عاطف نے پی ایل او کی جانب سے خود ایک جاسوسی نظام وضع کر رکھا تھا۔ اس نظام سے وابستہ افراد کی تربیتی ذمہ داری بھی عاطف پر ہی تھی۔ عاطف نے ہی سب سے پہلے لبنان میں ایک فلسطینی تنظیم ''صاعقہ فلسطینیہ'' کے سیکرٹری زہیر محسن کے قتل پر سے پردہ اٹھایا تھا۔ اسے موساد نے **1979**ء میں فرانس میں قتل کر دیا تھا۔ **1986**ء میں لندن سے شائع ہونے والے عربی جریدے ''المجلہ'' نے اس قتل کی تفصیلات بھی شائع کی تھیں۔ ان تفصیلات کا منظر عام پر آنا بھی فلسطینی سیکورٹی نظام کا کارنامہ تھا جس میں عاطف بسیسو کی ذاتی کاوشوں کا زیادہ عمل دخل تھا مگر اسرائیل نے زہیر محسن کے قتل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس جرم کا ارتکاب فرانس کی سرزمین پر کیا گیا تھا اور حکومت فرانس اس پر اسرائیل سے احتجاج بھی کر سکتی تھی مگر **25** ستمبر **1997**ء کو جب موساد عمان میں حماس کے پولیٹیکل ونگ کے سربراہ خالد مشعل کو قتل کرنے میں ناکام ہوئی اور اس کے ایجنٹ عمان میں گرفتار کر لئے گئے تو انہوں نے دوران تفتیش زہیر محسن کے قتل کا بھی اعتراف کیا۔

فلسطین کے متحدہ سیکورٹی نظام اور مصر کی خفیہ ایجنسی نے بھی باہمی روابط میں اضافہ کر لیا تھا۔ **1982**ء میں لبنان پر فلسطینی ٹھکانوں پر اسرائیل نے زبردست فوجی حملہ کیا۔ امریکہ اور مغربی طاقتیں اس کی پشت پر تھیں۔ اسرائیلی فوج جنوبی لبنان پر قابض ہو چکی تھیں۔ بیروت میں پی ایل او کے ساتھ خونریز معرکہ لڑا گیا مگر آخر کار پی ایل او کو افراتفری میں لبنان چھوڑنا پڑا۔ تیونس اس کا نیا مرکز تھا۔ متحدہ سیکورٹی نظام نے عاطف کی سرکردگی میں یورپ کے فلسطینی مراکز میں یہ ہدایات روانہ کیں کہ اسرائیلی جاسوسی وتخریبانہ کارروائیوں کے خاتمہ میں بھی امن و امان کا پورا خیال رکھا جائے۔ **1985**ء میں اعلان قاہرہ کے نام سے یاسر عرفات نے عسکری کارروائیاں کم کرنے کا اعلان کیا جس میں پی ایل او کے سیکورٹی نظام کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ عاطف بسیسو یورپ میں موساد کے خلاف سو سے زائد کارروائیاں کر چکا تھا۔ اس کے اعلان کے بعد خارجی سطح پر اس کی سرگرمیاں کسی حد تک محدود بھی ہو گئیں۔ امریکی نواز مراکش اپنے پڑوسی تیونس میں پی ایل او کی موجودگی سے خائف تھا۔ اس اعلان کے بعد پی ایل او کو صرف اتنا فائدہ ہوا کہ اسے یورپ سے ہلکی پھلکی اعانت نصیب ہونے لگی۔ امریکہ اس اعلان کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یاسر عرفات کے ساتھ مل کر ''تخریب کاری'' کے خاتمہ کے لئے مل کر کام کرنا چاہتا تھا۔

اس کی بنیاد پر اسرائیل میں باقاعدہ طور پر عاطف کے قتل کی ''قرارداد'' منظور ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل مقاصد وضع کئے۔

1- اس ''دہشت گرد'' کے خاتمے سے پی ایل او اور یورپی ممالک کے تعلقات میں بہتری آئے گی۔

2- یورپی ممالک اسرائیل کے ممنون ہوں گے اور اس سے یہ تاثر بھی قائم رہے گا کہ اسرائیل دہشت گردی کی کارروائیوں سے متعلق سب سے زیادہ باخبر ملک ہے۔

3- موساد کی مغربی یورپ میں سرگرمیاں کم ہو جائیں گی اور کسی دوسرے علاقے پر زیادہ توجہ دی جا سکے گی کیونکہ عاطف بسیسو اور اس کے متحدہ سیکورٹی نظام کی وجہ سے موساد کا بڑا حصہ مغربی یورپ میں کھپا ہوا تھا۔

4- عاطف بسیسو کی سب سے زیادہ خطرناک کاروائی موساد اور یورپی ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے بعض افراد کے درمیان تعلقات کا انکشاف تھا۔

امریکن سی آئی اے نے فلسطینی ''امن پسند'' دھڑے سے روابط استوار کر لئے تھے۔ یہ روابط میڈرڈ کانفرنس کے دوران وجود میں آئے۔ 1991ء میں میڈرڈ کانفرنس کے بعد اسرائیل عاطف کے قتل کا پورا منصوبہ ترتیب دے چکا تھا جس کے مطابق موساد نے عاطف کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مئی 1992ء کو عاطف تیونس سے اسپین اور وہاں سے کیوبا جا رہا تھا' برلن جانے سے پہلے اس نے 24 گھنٹے کے لئے امریکہ میں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ جرمنی پہنچا۔ یہیں قیام کے دوران اسے اسرائیلی منصوبے کا علم ہوا کہ اسے فرانس میں قتل کرنے کا منصوبہ ترتیب پا چکا ہے۔ اس منصوبے کی اطلاع سب سے پہلے یورپ میں متحدہ سیکورٹی نظام کے رکن بابل عبدالحمید کو یوگوسلاویہ سے ملی۔ یہ معلومات پیرس میں مقیم فلسطینی نژاد فرانسیسی ماذن کے ذریعے پہنچی تھیں جس پر الفتح کے مرکزی کمیٹی کے رکن ہانی الحسن نے عاطف بسیسو سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تا کہ وہ اس سلسلے میں یاسر عرفات سے بات چیت کرے الفتح کے رکن محمد الحجازی نے عاطف سے ملاقات کے بعد جرمن سیکورٹی فورسز کو موساد کے منصوبے سے آگاہ کیا جس پر جرمن حکام اس بات سے پریشان ہو گئے کہ کہیں یہ واردات ان کی سرزمین پر نہ ہو جائے۔ پی ایل او کی اعلیٰ قیادت نے عاطف کو پیغام بھیجا کہ وہ تیونس واپس آ جائے مگر آخری لمحات میں فرانسیسی وزیر دفاع کے مشیر سے عاطف کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ اس ملاقات کے لئے کئی مہینوں سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ عاطف نے اس ملاقات کو نظر انداز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یوں یہ ملاقات 8 جون 1992ء کو صبح دس بجے پیرس میں طے ہوئی۔ عاطف بسیسو نے جرمنی سے فرانس کا سفر لینڈ روور گاڑی میں کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک رات جرمنی اور فرانس کے بارڈر پر واقع ہوٹل میں گزاری۔ 7 جون کی شام چھ بجے وہ پیرس پہنچا۔ پیرس میں وہ یمنی پاسپورٹ پر عاطف احمد سالم کے نام سے پیرس کے میریڈین ہوٹل میں اترا۔ ہوٹل میں

بکنگ کی ذمہ داری پیرس میں موریطانیہ کے سفارتخانے نے پوری کی۔ ہوٹل میں قیام کے دوران اس کی ٹیلیفون پر محدود بات چیت ہوئی۔ بات کرنے والے سہیل راشد' فاطمہ بیضون اور تیونس میں اس کی بیوی تھے جن کو عاطف نے بتایا کہ صبح مذاکرات کے بعد وہ مارسیلیا کے راستے تیونس آ رہا ہے۔ سہیل راشد نے فرانسیسی سیکورٹی سے درخواست کی کہ وہ ہوٹل میں عاطف اور اس سے متعلق دوسرے لوگوں کی حفاظت کا بندوبست کریں مگر سیکورٹی والوں نے اس روز چھٹی ہونے کی بنا پر انکار کر دیا اور دوسرے دن کا وعدہ کیا۔ عاطف سہیل راشد کے ساتھ پیرس شہر میں دیر تک گھومتا رہا وہ گاڑی میں اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ فاطمہ بیضون عقبی نشست پر تھی۔ آدھی رات کے وقت وہ عاطف کو ہوٹل چھوڑنے آئے۔ عاطف اگلی نشست سے اٹھا تا کہ فاطمہ اگلی نشست پر آ جائے۔ اسی دوران ہوٹل کے گیٹ کے سامنے واقع نائٹ کلب سے جوگنگ کے لباس میں یورپین شکل وصورت کے دو افراد عاطف کی جانب بڑھے جن کے سروں پر بال چھوٹے تھے۔ آگے والے شخص نے اپنے چہرے کے سامنے بیگ کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے والا شخص اچانک عاطف کی پشت پر آ گیا جس نے مضبوطی سے اس کے بال پکڑ کر اسے واپس گاڑی میں بیٹھنے کا کہا۔ فاطمہ بیضون یہ منظر دیکھ کر چیخنے لگی جس پر دوسرے شخص نے دونوں پر پستول تان لیا۔ یہ پستول اس نے پلاسٹک کے ایک تھیلے سے نکالا تھا۔ اندر بیٹھتے ہی اس نے عاطف کے سر میں تین گولیاں ماریں۔ گولیوں کے خول واپس پلاسٹک کے تھیلے میں گرتے رہے۔ اس طرح صاحب ثروت ہونے کے باوجود فلسطین کی آزادی کی خاطر اپنی تمام زندگی صرف کرنے والا الفتح کا یہ دیومالائی کردار جس نے تیس سال تک اسرائیل اور اس کی طاقتور ایجنسی موساد کی نیندیں حرام رکھیں' اپنوں کی کمزوری اور بیوفائی کی بنا پر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

عاطف بسیسو کے قتل کی خبر تمام عالم عرب میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسرائیل میں ریڈیو بلیٹن جاری کیا گیا۔ الفتح کی مجلس شوریٰ نے ہنگامی اجلاس کے بعد اس کی ذمہ داری ابونضال (صبری البنا) گروپ پر عائد کر دی جس کی ابونضال گروپ نے فوراً تردید کی کہ اس قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں جبکہ اسرائیل میں کئی یہودی بنیاد پرست تنظیموں نے اس قتل کی ذمہ داری قبول کی۔ تل ابیب کے نائٹ کلبوں میں جام چھلکائے گئے۔ یہودی تنظیم کاخ اور اس کے

بعد کاہانا نے اس قتل کو اپنے ذمہ ڈالا۔ کاہانا کا ایک لیڈر امریکہ میں 1990ء میں قتل کیا گیا تھا یہ ایک طاقتور یہودی تنظیم ہے جس کا اثر ورسوخ اسرائیل کی حکومتی مشینری میں بہت زیادہ ہے۔ نومبر 1995ء میں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کے قتل کے بعد اس تنظیم کے اسرار پر سے کئی پردے اٹھائے گئے تھے۔

موساد نے سرکاری طور پر کبھی بھی عاطف کے قتل کا اعتراف نہیں کیا حالانکہ تمام دنیا اس قتل میں اس کے کردار سے واقف ہے۔ اسرائیلی میڈیا پر ہمیشہ عاطف کو ایک بین الاقوامی دہشت گرد کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ آزادیٔ فلسطین کے اس آخری سرگرم رکن کے قتل کے بعد اسرائیل کے لئے یاسر عرفات کے اردگرد اب میدان صاف تھا۔ اب فلسطینی کاز سے متعلق ''امن پسند'' گروپ یاسر عرفات کے گرد گھیرا تنگ کر چکا تھا اس لئے امریکہ کی زیر سرپرستی اسرائیل فلسطین مذاکرات جنیوا میں شروع کئے گئے۔ ان مذاکرات میں عاطف کا قریبی ساتھی نزار عمار بھی شریک رہا۔ اس دوران اس نے ایک اسرائیلی عہدیدار سے عاطف بسیسو کے قتل کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہیں جس پر اسے جواب دیا گیا کہ ''میں واپس جا کر ایجنسی کے سربراہ سے پوچھوں گا''۔ مذاکرات کے دوسرے دور میں جب نزار عمار نے دوبارہ اسی اسرائیلی عہدیدار سے اس قسم کا سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ ''کیا عاطف بسیسو کا میونخ اولمپکس کی واردات سے تعلق تھا؟ اگر تھا تو سمجھو اسے موساد نے ہی قتل کیا''۔

آزادیٔ فلسطین کی جدوجہد میں پیکر وفا کے طور پر اپنی جان نچھاور کرنے والے اس ہیرو کے قتل میں اپنوں کا بھی ہاتھ رہا۔ پی ایل او کے سابقہ رکن عدنان یاسین کا کردار اس میں سب سے نمایاں تھا۔ اس کے موساد سے دیرینہ تعلقات تھے اور یہی غدار عاطف کی سرگرمیوں کے بارے میں موساد کو باخبر کرتا تھا۔ اس بات کا انکشاف فرانس کی خفیہ ایجنسی نے اپنی تحقیقات مکمل ہونے پر کیا کیونکہ انہیں رنج تھا کہ قتل کی اس واردات کے لئے فرانس کی سرزمین استعمال کی گئی ہے۔ فرانس کے انکوائری جج طویل عرصے تک عدنان یاسین اور موساد کے تعلق کی گتھیاں سلجھاتے رہے۔

امریکی ایٹمی راز چین کیسے پہنچے؟

چند سال قبل امریکن سی آئی اے کے ذرائع نے اعلان کیا ہے کہ چین ایک موبائل بین البراعظمی میزائل کے تجربے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ سی آئی اے کے مطابق یہ میزائل امریکہ کے چوری شدہ وار ہیڈ اور میزائل ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کیا جا رہا ہے۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے سی آئی اے کے ذرائع سے خبر دی ہے کہ امریکی جاسوس سیٹلائٹ سسٹم کے مطابق میزائل تجربے کے لئے وسطی چین میں تیاریاں کی جارہی ہیں۔ امریکی حکام کے مطابق یہ تجربہ دسمبر 2001ء میں ہونا تھا مگر اسے ملتوی کر دیا گیا تھا امریکی اخبار کے مطابق سی آئی اے کے ایک افسر کے مطابق یہ میزائل آٹھ ہزار کلومیٹر تک مار کرسکتا ہے اور اڑھائی میگاٹن وزنی وار ہیڈ ساتھ لے جاسکتا ہے۔ ایک میگاٹن دس لاکھ ٹی این ٹی بارودی طاقت کے برابر ہوتا ہے۔ سی آئی اے کے مطابق چینی میزائل ڈی ایف 31 کی ٹیکنالوجی جدید امریکی وار ہیڈ ڈبلیو 88 یا اس سے کم جدید ڈبلیو 70 جیسی ہوسکتی ہے۔ ان خبروں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چینی عسکری قوت سے امریکیوں کی نیندیں کس طرح اڑی ہوئی ہیں۔

امریکہ اور یورپ نے دنیا پر بالادستی کے لئے ایٹمی توانائی کو ہتھیار سازی کے لئے ستعمال کیا اور اس ٹیکنالوجی کے دروازے ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر بند کر دیئے تو ہر طرف ل کے حصول کی جستجو شروع ہوگئی۔ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں نے اس ٹیکنالوجی کے حصول کے

لئے خفیہ راستے اپنائے مگر ان میں سے چند ملک ہی اس کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔ان ممالک کے لئے یورپ اور امریکہ سے اس ٹیکنالوجی کو لے اڑنا ایسا ہی تھا جیسے شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا۔ایسا ہی ایک کارنامہ چین کے ایک سائنسدان پروفیسر ''وین ہولی'' نے چین کے لئے انجام دیا جس پر امریکہ بری طرح زخم چاٹ رہا ہے۔بہرحال لی نے جو کارنامہ چین کے لئے انجام دیا ہے اس نے اسے چین کا قومی ہیرو بنا دیا۔امریکہ کے خلاف لی کا کارنامہ اتنا تباہ کن تھا کہ امریکی سینیٹر رچرڈ شلبی چیئرمین امریکن سیکورٹی وخفیہ امور برائے امریکن کانگریس کو امریکی کانگریس میں یہ کہنا پڑا کہ ''امریکہ کے ایٹمی رازوں کا چینی خفیہ ایجنسی کے ہاتھ لگنا کس قدر مہلک ثابت ہوا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اب تک جو کچھ میڈیا کے ذریعے منکشف ہو چکا ہے نقصان اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چینی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کرنے والا تائیوانی نژاد پروفیسر وین ھولی کس طرح امریکہ کے ایٹمی ہتھیاروں اور ان سے متعلق ٹیکنالوجی کے اسرار اڑانے میں کامیاب ہوا؟

اس کہانی کی ابتداء 1994ء میں اور ڈراپ سین 1999ء میں ہوتا ہے۔جس پر امریکی میڈیا میں بے تحاشا شور مچایا گیا چین کے خلاف نہ صرف سی این این میں بلکہ واشنگٹن پوسٹ، نیویارک ٹائمز، نیوز ویک اور ٹائم میں چین مخالف مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔کبھی تبت کے مسئلے کو ہوا دی گئی تو کبھی چین کی نئی نسل کے حوالے سے چین مخالف پروپیگنڈہ کیا گیا۔مگر اس تمام صورتحال کے باوجود چین نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب نہ دینے کی پالیسی اپنائے رکھی اور امریکہ اس سلسلے میں زخم چاٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

پروفیسر لی اگر صرف چین سے ہی تعلق رکھتا تو اسے کبھی نیو میکسیکو میں واقع نیشنل لوس اموس کی ایٹمی تجربہ گاہ میں گھسنے نہ دیا جاتا مگر اس کے پاس چین کے باغی علاقے تائیوان کی شہریت تھی جسے امریکہ کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے اس لئے پروفیسر لی کو امریکہ کی اس حساس ترین لیبارٹری میں کام کرنے کی مکمل آزادی تھی۔یہ سب کچھ ان معاملات کے ضمن میں ممکن ہو سکا جس کے تحت امریکہ تائیوان کو چین کے مقابل ایٹمی طاقت بنانے کے پروجیکٹ پر کام کر رہا

چین کی خفیہ ایجنسی کو اپنا کام کرنے کے سلسلے میں دوسری عالمی ایجنسیوں کے مقابلے میں مختلف نوعیت کی دشواری کا سامنا رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کے اس کے مقامی کارندے بآسانی پہچانے جاتے ہیں اس لئے عالمی سطح پر چینیوں کو اس نوعیت کے کام کرنے میں دوسروں کی نسبت خاصی دقت کا سامنا رہتا ہے۔مگر پروفیسر لی کا معاملہ اس سے مختلف تھا اس کی تائیوان سے نسبت اس کے کام میں آسانی کا سبب بنی۔

امریکہ کی فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن FBI میں کچھ لوگ فرضی ناموں سے بھی خدمات انجام دیتے ہیں ان میں سے چند افراد نے FBI کی ہائی کمان کو پروفیسر لی کی مشکوک سرگرمیوں سے آگاہ کیا جس کے بعد پروفیسر لی کی FBI کی جانب سے سخت نگرانی شروع کر دی گئی۔ پروفیسر لی نے تائیوان سے امریکہ آنے کے بعد امریکن شہریت بھی حاصل کر لی تھی ایٹمی شعبے میں ریسرچ مکمل کرنے کے بعد وہ ایک مکمل ایٹمی سائینسدان بن چکا تھا اور ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں اسے خاص مہارت حاصل ہو چکی تھی۔FBI نے اس سلسلے میں جو ابتدائی رپورٹ تیار کی تھی اس کے مطابق'' پروفیسر لی کے امریکہ میں ایک ایسے شخص سے براہ راست تعلقات ہیں جس پر چین کے لئے جاسوسی کرنے کا شبہ کیا جا رہا ہے۔''اس وقت تک پروفیسر لی نیو میکسیکو میں لاس اموس کے مقام پر واقع امریکہ کی نیشنل اٹامک لیبارٹری میں امریکہ کے دور مار میزائلوں کے لئے اٹامک وار ہیڈ تیار کرنے کے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔

اس پروجیکٹ کو امریکہ نے انتہائی راز میں رکھا ہوا تھا اس پروجیکٹ میں جو ایٹمی وار ہیڈ تیار ہو رہے تھے انہیں ایسے بین البراعظمی امریکی میزائلوں پر نصب ہونا تھا جن کی رینج چھ ہزار کیلومیٹر بنتی ہے۔اس پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے لی کی رسائی پروجیکٹ کے حساس ترین کمپیوٹروں تک ہو چکی تھی جن میں میزائلوں کے نقشے اور وار ہیڈ کی تمام تفصیلات محفوظ تھیں۔اس لئے FBI کو شروع شروع میں شک گذرا کہ اس قسم کی ٹاپ سیکرٹ معلومات پروفیسر لی کے ذریعے چین کے ہاتھ لگ چکی ہیں مگر اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ FBI کے مخبروں نے ان خدشات کا اظہار 1994ء میں کیا تھا جس کے بعد لی کی نگرانی سخت کر دی گئی۔اس دوران FBI کے ایجنٹوں نے لی کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت سی رپورٹیں مرتب کیں جنہیں ہیڈ آفس بھیجا جاتا رہا۔اس نگرانی کے دوران دیکھا گیا کہ لی کام کے بعد

کہاں کہاں جاتا ہے اور کن لوگوں سے ملتا ہے اس کے دوستوں کا حلقہ کیسا ہے۔ مگر اس سلسلے میں انہیں کوئی بھی قابل اعتراض سرگرمی نظر نہیں آئی جس پر FBI نے یہ معاملہ اوپر کی سطح پر وزارت توانائی اور وزارت قانون تک پہنچا دیا مگر لی پھر بھی اپنے سابقہ منصب پر کام کرتا رہا جہاں وہ لاس اموس کی ایٹمی لیبارٹری میں اس نیٹ ورک اور حساس کمپیوٹروں کے درمیان پھرتا رہا جن میں امریکہ کے ایٹمی اسلحے سے متعلق حساس ٹیکنالوجی اور معلومات موجود تھیں۔

1999ء کو یہ مسئلہ ایک مرتبہ پھر ابھرا اور FBI نے وزارت توانائی اور عدل کو پروفیسر لی کی مشکوک سرگرمیوں سے آگاہ کرتے ہوئے باور کرایا کہ لاس اموس جیسی حساس ایٹمی تنصیبات میں لی کی موجودگی امریکہ کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ جس کے فوراً بعد لی کو لاس اموس کی ایٹمی لیبارٹری سے تبدیل کر کے دوسری جگہ ٹرانسفر کر دیا گیا۔ مگر اسے پروفیسر لی کی ذہانت کہئے کہ آخری وقت تک FBI کے ہاتھ ایسا ثبوت نہ لگ سکا جس کی بنیاد پر لی پر ہاتھ ڈالا جاسکتا پروفیسر لی آخری وقت تک محفوظ رہا بلکہ اس نے لاس اموس کی ایٹمی لیبارٹری سے رابطہ برقرار رکھا۔ جہاں وہ آخری وقت تک حساس کمپیوٹروں سے معلومات حاصل کرتا رہا۔

چین کے متعلق امریکی خدشات شروع سے ہی جڑ پکڑ چکے تھے نومبر 1998ء میں وائٹ ہاوس کی ایک میٹنگ میں FBI کے ایک ایجنٹ کی رپورٹ جس مین واضح کیا گیا تھا کہ چین امریکہ کی عسکری جاسوسی میں ملوث ہے پر کافی بحث کی گئی تھی جسے نیویارک ٹائمز میں اس وقت شائع بھی کیا گیا مگر امریکی اخبارات کے مطابق امریکہ کے ذمہ دار اداروں نے اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ سینٹر رچرڈ شلبی نے کانگریس میں اس مسئلے کا سامنا کرتے ہوئے امریکی وزارت توانائی اور عدل کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا رچرڈ شلبی کے مطابق ان وزارتوں کو انہوں نے شروع میں ہی پروفیسر لی کے بارے میں خبردار کر دیا تھا مگر اس مسئلے کے سدباب کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظامات نہیں کئے گئے جو سراسر امریکی سیکورٹی کے خلاف جاتا ہے۔

لاس اموس کی ایٹمی لیبارٹری سے الگ ہونے کے باوجود FBI کے کارندے پروفیسر لی کی نگرانی کرتے رہے مگر ان کے ہاتھ جاسوسی کا کوئی سرا نہیں آرہا تھا۔ یہاں پروفیسر لی کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے کہ امریکی تفتیشی ادارے اس بات کا یقین ہوجانے کے بعد بھی کہ

چین لی کے ذریعے امریکہ کی ٹاپ کلاس عسکری ٹیکنالوجی حاصل کر رہا ہے انہیں کہیں سے بھی پروفیسر لی پر مضبوط ہاتھ ڈالنے کے لئے ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ پروفیسر لی نے اپنے گھر میں ذاتی استعمال کے لئے ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا ہائی ڈیوائس کا حامل یہ کمپیوٹر ان کمپیوٹروں سے تکنیکی مطابقت رکھتا تھا جو لاس اموس کی تجربہ گاہ میں استعمال ہو رہے تھے۔ پروفیسر لی تجربہ گاہ سے حاصل کردہ تمام معلومات اس کمپیوٹر میں فیڈ کر کے اسے مختلف شکلوں میں چینی ایجنٹوں کے حوالے کرتا تھا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ شاطر کی غلطی بھی دوسروں کی نسبت ہزار گنا بڑی ہوتی ہے۔

پروفیسر لی کا معمول تھا کہ وہ لاس اموس کی لیبارٹری سے معلومات ہمیشہ کمپیوٹر فلاپی میں حاصل کرتا تھا جسے بعد میں اپنے ذاتی کمپیوٹر میں منتقل کر کے ایٹمی میزائل کی ٹیکنالوجی کو چینی زبان میں طے شدہ کوڈ کے تحت منتقل کرتا تھا۔ FBI کے کارندوں نے ایک مرتبہ لی کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کی تلاشی کے دوران اس کے ذاتی کمپیوٹر کی پڑتال کی تو انہیں کچھ معلومات کے ذریعے شک گذرا کہ اس کمپیوٹر میں حساس معلومات موجود ہیں۔ FBI کی ٹیم میں شامل کمپیوٹر ماہر نے ان تمام فائلوں کی کاپی تیار کی جسے بعد میں چینی زبان کے ماہر سے پڑھوایا گیا تو اصل بھید کھل کر سامنے آگیا۔ مگر اس سے پہلے FBI دور مار میزائلوں اور ایٹمی وار ہیڈ کی حساس معلومات کہیں اور منتقل ہونے سے روکتی پروفیسر لی ان کو چین منتقل کر چکا تھا۔ چینی خفیہ ایجنسی نے اس سلسلے میں کمال مہارت کا ثبوت دیا انہوں نے براہ راست ان معلومات کو چین بھیجنے کا خطرہ مول لینے کی بجائے اسے پہلے نیویارک منتقل کیا جہاں چین کی خفیہ ایجنسی کے خفیہ ٹھکانے میں ان معلومات کو چینی زبان میں مختصر نویسی کے ماہر کے حوالے کیا جاتا جو ان تفصیلات کو مختصر انداز میں کوڈ کر کے ایجنسی کے حوالے کرتا تھا۔ بعد میں یہی ماہر تھوڑے عرصے بعد بیجنگ پہنچ کر ان تفصیلات کو دوبارہ تفصیلی شکل میں لے آتا تھا اس طرح امریکیوں کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی کہ امریکی تاریخ کی یہ حساس ترین معلومات کس طرح امریکہ سے باہر منتقل ہو رہی ہیں۔

FBI نے جیسے ہی پروفیسر لی کا کمپیوٹر اپنے قبضے میں لیا اور اس کے چینی خفیہ ایجنسی سے تعلق کو بے نقاب کیا امریکی جریدے ٹائم نے فوراً اس پر ایک تفصیلی اسٹوری شائع کر دی جس میں FBI کی رپورٹوں پر مبنی بہت سے شواہد منظر عام پر لائے گئے۔ اس سلسلے میں واضح طور پر اعتراف کیا گیا تھا کہ چینیوں نے امریکی تاریخ کی حساس ترین ترین عسکری ٹیکنالوجی چرا لی ہے

جس میں سب سے اہم معاملہ (W-88-Nuclear Warhead) کا تھا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد جو سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں ان کے مطابق شک پڑنے کے باوجود پروفیسر وین ہو لی کس طرح امریکہ کی حساس ترین عسکری لیبارٹری میں کام کرتا رہا؟ اس کے خلاف تحقیق میں دیر کیوں کی گئی؟ شک پڑنے کے باوجود اسے لیبارٹری کا کمپیوٹر استعمال کرنے کی کیوں اجازت دی گئی تھی؟ لیبارٹری سے الگ کئے جانے کے بعد بھی وہ کس طرح معلومات حاصل کرتا رہا؟ آخر میں جب FBI نے وزارت قانون اور توانائی کو لی کے بارے میں اپنے شبہات پہنچا دیئے تھے پھر کارروائی میں دیر کیوں کی گئی؟

ان باتوں کا جواب 2 مئی 2000ء کو امریکہ کے وزیر توانائی بل رچرڈسن نے کانگریس کی تحقیقی کمیٹی کے سامنے اس طرح دیا کہ ''ہماری تحقیق کے مطابق پروفیسر لی جو معلومات لاس اموس کی لیبارٹری سے حاصل کرنا چاہتا تھا اسے E-Mail کے ذریعے اپنے ذاتی کمپیوٹر میں منتقل کر لیتا تھا'' لی کی آزادانہ نقل وحمل کے بارے میں جواب دیتے ہوئے رچرڈسن نے کہا کہ ''پروفیسر لی کو اپنی قابلیت کی بنیاد پر لیبارٹری کے حساس ترین کمپیوٹر استعمال کرنے کی مکمل آزادی تھی ایسا کافی عرصے سے ہو رہا تھا'' رچرڈسن نے اعتراف کیا کہ جیسے ہی FBI کی رپورٹ 1996ء میں وزارت توانائی کو موصول ہوئی تھی اس وقت ہی لی کو سخت نگرانی میں لے لینا چاہئے تھا مگر امریکی وزیر نے اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ پروفیسر لی نے لاس اموس کی لیبارٹری میں موجود سپر کمپیوٹروں کے کوڈ کس طرح توڑے؟ کیونکہ ان کمپیوٹروں کا تعلق اس وقت دنیا میں رائج کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی جدید ترین قسم میں ہوتا ہے۔ اگر ان کمپیوٹروں کے کوڈ توڑے جا سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس قسم کے دوسرے کمپیوٹر بھی چینی خفیہ ایجنسی کی زد میں ہوں گے!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چینی ماہرین نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے متعلق امریکہ کے حساس اداروں میں اہم افراد سے روابط استوار کر رکھے ہیں جو سپر کمپیوٹروں کے Password کھولنے کا ہنر جانتے ہیں جن کے کھل جانے کے بعد کمپیوٹر کی حساس فائلوں تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ اسی دوران جب پروفیسر لی حساس معلومات چینیوں کو منتقل کر رہا تھا امریکی حکام نے ایک تائیوانی نژاد کمپیوٹر ماہر کو گرفتار کیا تھا اس نے ''چرنوبل'' نامی وائرس

تخلیق کیا تھا جس نے دنیا بھر کے حساس کمپیوٹروں کو متاثر کر دیا تھا۔ امریکی حکام اس معاملے کے پیچھے بھی چینیوں کا ہاتھ تلاش کر رہے تھے۔

امریکہ میں اس خبر کے عام ہونے کے بعد کہ چینی امریکہ کی حساس ٹیکنالوجی لے اڑے ہیں کانگریس میں ری پبلکن پارٹی نے برسر اقتدار ڈیموکریٹک پارٹی پر زبردست تنقید شروع کر دی ری پبلکن پارٹی کے مطابق کلنٹن انتظامیہ کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے آج امریکہ کو ایسی خطرناک صورتحال کا سامنا ہے جس میں خود اس کی سلامتی خطرے میں پڑ چکی ہے۔ ری پبلکن کا دعویٰ ہے کہ صدر کلنٹن نے 1996ء میں اپنی دوسری مدت صدارت کے الیکشن میں چین سے مالی معاونت حاصل کی تھی اس کے بعد سے ہی چینیوں کو امریکہ کے حساس امور میں دخیل ہونے کا بھرپور موقعہ میسر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ چین کی اس تردید کے بعد کہ وہ امریکہ کے حساس اداروں کی جاسوسی میں ملوث نہیں صدر کلنٹن چین کے خوف سے جس نے انہیں انتخابات میں مالی معاونت فراہم کی تھی تائیوانی الاصل پروفیسر کے خلاف کوئی کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ری پبلکن پارٹی نے اس دعوی کے بعد اعلان کیا کہ چونکہ امریکی قانون انتخابی مہم کے لئے باہر سے مالی معاونت کے حصول کو ممنوع قرار دیتا ہے اس لئے بھی صدر کلنٹن نے امریکی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر صدر کلنٹن کی شامت اعمال ان کے سامنے آئی مگر خوش قسمتی سے اس سلسلے میں امریکی سلامتی لاحق خطرات کے پیش نظر داخلی سطح پر اس مسئلے کو زیادہ ہوا نہیں دی گئی۔

امریکہ کے خلاف چینی جاسوسی کی اس کارروائی کے بعد FBI کے علاوہ دوسرے تفتیشی اداروں نے بھی چین کے طریقہ جاسوسی پر تحقیق شروع کر دی ہے۔ ان اداروں کے مطابق چین نے عالمی سطح پر جاسوسی کا انوکھا طریقہ اپنایا ہوا ہے جس کے تحت وہ کبھی بھی ایک اسائنمنٹ پر ایک شخص کو مقرر نہیں کرتے بلکہ وہ مختلف مخبروں اور ایجنٹوں کو ایک اسائنمنٹ کے مختلف حصے تقسیم کرتے ہیں ان ایجنٹوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا بسا اوقات ایک ہی مقام پر دو ایجنٹ کام کر رہے ہوتے ہیں مگر وہ اس بات سے لاعلم ہوتے ہیں کہ ان کی ذمہ داریوں میں ایک ہی مہم ہے یا وہ ایک ہی مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان تمام کے ساتھ چینی ایجنسی کے صرف دو یا تین اہلکاروں کا رابطہ ہوتا ہے جو مطلوبہ اسائنمنٹ کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور یہی افراد دیگر

جواب دہ ہوتے ہیں۔ بعد میں مطلوبہ اسائنمنٹ کے حاصل شدہ مختلف حصوں کو مربوط کر کے اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس پیچیدہ طریقہ واردات کی وجہ سے ہی امریکی چینیوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کر سکے۔ اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ پروفیسر لی بہت سی حساس معلومات ایک اور چینی نژاد امریکی سائنسدان کو مہیا کرتا تھا یہ طریقہ معلومات کے زمرے میں آتا تھا جس کی امریکی قانون میں کوئی ممانعت نہیں۔ مگر FBI کی تحقیق کے بعد وہ چینی بھی جاسوس نکلا۔ اس کے علاوہ FBI نے ایک ایسے شخص کو بھی نگرانی کے بعد اپنی تحویل میں لیا تھا جو کیلی فورنیا کی ایٹمی لیبارٹری لارنس لائف مور میں نیوٹران بم تیار کرنے والی ٹیم کا رکن تھا اس کے متعلق بھی کہا گیا کہ یہ چینی خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا۔ چینی امور سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر نے ٹی وی چینل (MSNBC) کو اپنا نام ظاہر کئے بغیر بتایا کہ امریکہ اور چین کے درمیان ایٹمی وار ہیڈ اور بین البراعظمی میزائل ٹیکنالوجی کے معاملے میں ترقیاتی فاصلہ 25 سال پر محیط تھا مگر پروفیسر لی کی کارروائی کے بعد یہ فاصلہ سمٹ کر صرف 2 سال کا رہ گیا۔

موجودہ قضیئے کو اگر ترتیب وار دیکھیں تو اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں رہے گا کہ امریکہ جیسے ملک میں عسکری نقب لگا کر چین نے اس سپر پاور کا بھرم کس بری طرح کھولا ہے۔

اپریل 1995ء: امریکی وزارت توانائی نے چین کے بین البراعظمی میزائل کے تجربے کے بعد انکشاف کیا کہ یہ امریکی میزائل سسٹم (W-88) کے مشابہ ہے جس کی ٹیکنالوجی امریکہ سے چرائی گئی۔

جون 1995ء: امریکن سی آئی اے نے ثابت کیا کہ (W-88) کی ٹیکنالوجی امریکہ میں چینی ایجنٹوں نے چرا کر چین کے حوالے کی ہے۔

فروری 1996ء: امریکی وزارت توانائی نے FBI کی مدد سے وزارت کے مختلف اداروں میں چھان بین کا کام شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پہلی مرتبہ پروفیسر لی کو بھی مشکوک قرار دیا گیا۔

جولائی 1996ء: چین نے امریکی عسکری ٹیکنالوجی سے متعلق مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے۔

اگست 1996ء: FBI نے لاس اموس کی حساس فائلیں اپنے قبضے میں لے لیں اور

مشتبہ لوگوں کے نام کانگریس کی تحقیقی ٹیم کو ارسال کر دیئے۔

اپریل 1997ء: FBI نے امریکی توانائی سے متعلق حساس اداروں میں ان غیر ملکی ماہرین کی فہرست تیار کرنا شروع کر دی جنہوں نے بعد میں امریکی شہریت حاصل کر لی تھی۔ یہ فہرست بھی بعد میں کانگریس کی تحقیقی کمیٹی کے حوالے کی گئی۔

جولائی 1997ء: کانگریس کی ٹامسن کمیٹی نے باضابطہ طور پر جاسوسی کے اس بڑے مسئلے پر اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

مگر اس تمام اہتمام کے باوجود چین نے جو کام شروع کیا تھا اس نے اس میں سو فیصد کامیابی حاصل کی اور اب اس کی میزائل ٹیکنالوجی تیزی کے ساتھ امریکہ کی ہم پلہ ہوا چاہتی ہے۔

موساد کے خفیہ ایجنٹ

دنیا بھر میں خفیہ ایجنسیاں اپنے اپنے ملک کی بقا اور سلامتی کے لئے زیر زمین خفیہ جنگیں لڑتی ہیں، مگر اس جنگ کے دوران اپنے ملکی مفاد کی خاطر وہ جس طرح دوسری قوموں اور ملکوں کے لئے تباہی کا جال بچھاتی ہیں اس سے عام آدمی کم ہی واقف ہوتا ہے۔اس کے علاوہ جس ملک کی خفیہ ایجنسی بین الاقوامی سطح پر جتنے لمبے ہاتھ رکھتی ہے اس ملک کی دھاک دوسرے ممالک پر اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ایسی ہی ایجنسیوں میں ایک اسرائیل کی بدنام زمانہ بین الاقوامی ایجنسی ''موساد'' ہے۔موساد کے پراسرار اور دیو مالائی کردار کے بارے میں اب تک بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ان کتابوں کے مصنفین میں موساد کے سابق اہلکار بھی شامل ہیں اور غیر اسرائیلی بھی، موساد کے ایک سابق اہلکار اور ایجنٹ وکٹر اسٹروسکی نے بھی چند سال پہلے اس موضوع پر ''By Way of Desiption'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں موساد کی چند بین الاقوامی کارروائیوں سے پردہ اٹھانے کے علاوہ اس کے انتظامی ڈھانچے پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی

کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی مصنف گورڈن تھامس نے موساد پر ایک مرتبہ پھر قلم اٹھایا، گورڈن تھامس کی کتاب GIDEON'S SPIES (MOSSAD'S SECRET WARRIORS) میں جہاں موساد کی بہت سی کارروائیوں اور آپریشنز سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہاں بہت سی باتوں پر شکوک وشبہات کے پردے بھی ڈال دیئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر قلم اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔اس کتاب کے

سرورق سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کام نہ صرف مشکل ہے بلکہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ موساد سے متعلق ایسے اسرار بھی اس کتاب میں منکشف کئے گئے ہیں جو اسرائیلی مفادات کے خلاف بھی جا سکتے ہیں اس کی کیا قیمت ادا کی جا سکتی ہے موساد کی فطرت سے واقف افراد اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ان سربستہ رازوں میں سے ڈیانا اور ڈوڈی کے قتل میں موساد کے ملوث ہونے کا بھی اشاروں میں ذکر ملتا ہے۔قاری یقیناً اسے پڑھتے ہوئے محسوس کرے گا کہ ڈیانا کی حادثاتی موت کے پردے کے پیچھے طاقتور ذرائع کام کر رہے ہیں۔

عام طور پر کتاب کا تاثر اس طرح ملتا ہے کہ مصنف نے موساد سے متعلق بعض چیزوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً کتاب لکھنے سے پہلے مصنف نے اعلان کیا تھا کہ وہ ستمبر 1997ء میں عمان میں حماس کے لیڈر خالد مشعل پر ہونے والے موساد کے ناکام حملے اور چند ماہ بعد یعنی فروری 1998 میں جنوبی میونخ کے مقام پر فلسطینی رہنما عبداللہ زین کے گھر میں الیکٹرانک جاسوسی آلات کی تنصیب کی کارروائی سے مکمل طور پر پردہ اٹھائے گا مگر کتاب کے مارکیٹ میں آنے کے بعد یہ تاثر مکمل طور پر سامنے نہیں آ سکا بلکہ اس میں بنیامین نیتن یاہو کو کور دیتے ہوئے سارے کا سارا ملبہ موساد کے سر ڈال دیا گیا ہے یہ صحیح ہے کہ ساری کارروائی موساد کے ذریعے ہی ہوئی مگر اس میں ماسٹر مائنڈ نیتن یاہو ہی تھا۔

کتاب کا مجموعی تاثر کچھ ایسا ہے جیسے دنیا کو موساد سے ڈرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چند طویل باب بھی شامل کئے گئے ہیں جس میں تفصیل سے موساد کی بعض کارروائیوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ موساد ایک خوفناک بین الاقوامی ایجنسی ہے جس کے خفیہ لمبے ہاتھ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں یہ وہ ایجنسی ہے جس نے اسرائیل سے ہزاروں میل دور ارجنٹائن میں ایخمان کو اس کی وین سمیت غائب کر کے زندہ اسرائیل پہنچا دیا تھا۔ایخمان وہ شخص تھا جس نے عالمی سطح پر بہت سے ایٹمی راز حاصل کر لئے تھے۔اس کے علاوہ موساد نے 1966ء میں گھانا کے صدر نکروما کی حکومت کے خلاف اس وقت انقلاب برپا کروا دیا تھا جب وہ چین کے دورے پر تھے اس وقت عکرہ اور بیجنگ کے درمیان تعلقات اسرائیل کے مفاد میں نہیں تھے۔یہی موساد ہمیشہ عرب ممالک کی ان کوششوں کے درمیان حائل رہی جو انہوں نے ایٹمی قوت بننے کے لئے انجام دیں۔کتاب کے

مصنف کے مطابق موساد نے بین الاقوامی سطح پر جتنی بھی قتل وغارت کی کارروائیاں کیں اس میں اسے بہت ہی کم ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے یہ کارروائیاں چاہے ہزاروں میل دور کی گئی ہوں جہاں پر سیکورٹی کا نظام بھی سخت ہو مگر موساد کے لئے یہ رکاوٹیں کوئی معنی نہیں رکھتیں بلکہ موساد ہمیشہ ان رکاوٹوں پر غالب آئی ہے۔ اس کے علاوہ اس ایجنسی کی خصوصیت یہ ہے کہ برطانیہ، فرانس، امریکہ، چین اور جرمنی کی ایجنسیوں کے مقابلے میں موساد کا شمار فکری سطح پر زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق موساد نے نہ صرف بین الاقوامی سطح پر اسرائیل دشمن قوتوں سے مقابلہ کیا ہے بلکہ مندرجہ بالا مغربی ایجنسیوں سے بھی اپنے مفادات کی خاطر اس نے خفیہ جنگ کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ کتاب کا نام **GIDEON'S SPIES** عہد نامہ قدیم (تورات) کے ایک باب ''القضاۃ'' پر رکھا گیا ہے اس باب میں یہودی فوج کی ایک ایسی مہم کا ذکر کیا گیا تھا جس میں لڑنے والوں کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں تھی اور انہوں نے اس مہم میں فتح بھی حاصل کی تھی اس لئے قاری آسانی کے ساتھ اس کتاب کے عنوان کا پس منظر اور مطلب جان سکتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ اسرائیل ایک امن پسند ملک ہے اور اس کے گرد دشمنوں کا گھیرا ہے جو اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر **GIDEON'S Spies** یعنی جدعون کے جاسوسوں کی موجودگی میں اسرائیل امن وامان کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ جو اپنے لمبے ہاتھوں کی وجہ سے تمام دنیا کو اپنے نرغے میں لئے ہوئے ہے۔ موساد کا دائرہ اثر عرب ممالک کے اہم شعبوں تک وسیع ہے اس سلسلے میں موساد نے ہزاروں فلسطینیوں کی خدمات بھی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر اس میں اسے بہت کم کامیابی حاصل ہوسکی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو موساد کے حساب میں تو موجود ہیں مگر ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آسکی ہیں۔ مصنف کے مطابق ان میں سب سے اہم امریکی صدر کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کے درمیان ہونے والی جنسی گفتگو کو ریکارڈ کرنا اور لاکر بی کے طیارے کے حادثے کی تمام خفیہ تفصیلات بھی موساد کے پاس محفوظ ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد قاری کے دماغ میں کئی اہم سوالات بھی ابھرتے ہیں مصنف نے اتنی دقیق قسم کی معلومات جو بظاہر خود موساد کے حق میں نہیں جاتیں کس طرح

KURF

حاصل کیں ہیں؟ اس سوال کا جواب مصنف نے کتاب کے دیباچے میں اس طرح دیا ہے کہ اس نے اس کتاب کی تیاری میں تقریبا 38 کتابوں سے استفادہ کیا جو اس موضوع پر مختلف ادوار میں لکھی گئی تھیں۔ اگر صرف اس بات کو من وعن تسلیم کرلیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ اگر پہلے سے یہ تفصیلات سابقہ کتب میں موجود تھیں تو اس نئی کتاب کی ضرورت کیونکر پیش آئی!؟ بہرحال جواب کچھ بھی ہو اس کتاب میں کچھ ایسے حقائق بھی ہیں جو اپنے وقوعہ کی نسبت نئے ہیں اور ان کا سابقہ کتابوں میں ملنا ناممکن ہے۔ مثلا ڈیانا اور ڈوڈی کی موت، وائٹ ہاوس میں اسرائیلی جاسوس میگا اور امریکہ میں گرفتار امریکی نژاد اسرائیلی جاسوس جوناتھن بولارڈ وغیرہ۔

اس سلسلے میں مصنف کے مطابق ان چند واقعات کو قدرے تفصیل سے دیکھنا ہوگا۔ مثلا ڈیانا اور ڈوڈی الفائد کی موت میں موساد کا کیا کردار ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے یہ بات شدومد کے ساتھ کہی جارہی تھی کہ اس قتل کے پیچھے برطانیہ کی خفیہ ایجنسی 'MI 6' کا ہاتھ ہے۔۔۔ مگر معاملہ زیادہ تحقیق کی طرف نہیں جاسکا۔ مگر اس کتاب نے اس مسئلے کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں پیرس کے رٹز ہوٹل کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔ ڈوڈی کے باپ محمد الفائد کا ملکیتی پیرس کا مشہور زمانہ فائیوسٹار رٹز ہوٹل ارب پتی اسلحے کے عرب تاجروں کی آئیڈیل قیام گاہ ہے جس کی وجہ سے اس ہوٹل کی نگرانی کے لئے موساد نے باقاعدہ نیٹ ورک قائم کررکھا تھا اس سلسلے میں پیرس میں موساد کے ایک افسر کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ ہوٹل کی سیکورٹی میں سے موساد کے لئے کام کرنے والے افراد بھرتی کرے اس سلسلے میں ہوٹل کی سیکورٹی کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے ہامی بھری یہ وہی ہنری پال تھا جو ڈوڈی کی کار چلا رہا تھا جس نے موریس سے رابطہ کرکے اس سے رقم طلب کی جو اسے ادا کردی گئی تھی۔ بعد میں ہنری پال کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ڈرائیونگ کے دوران اپنی کار کو تیز رفتاری سے اس طرح حادثے کا شکار کرے کہ اس کی زندگی تو محفوظ رہے مگر ڈیانا اور ڈوڈی نہ بچ سکیں مگر اس مشن سے پہلے منصوبے کے تحت اسے کثیر تعداد میں شراب پلادی گئی جس کی وجہ سے اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

مصنف نے اس کتاب کی تالیف سے پہلے دعوی کیا تھا کہ وہ اس معمے سے پردہ اٹھائے گا جس میں موساد کے ملوث ہونے کو ثابت کیا جائے گا مگر قاری کو اس وقت شدید حیرت ہوتی ہے جب مصنف کتاب میں صاف دعوی کردیتا ہے کہ ڈیانا اور ڈوڈی کے معاملے سے موساد کا کوئی تعلق

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

نہیں ہے اور اصل معاملہ صرف ہنری پال ہی جانتا تھا جو ہوٹل کے اندر کے معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔۔۔! یوں وہ حقائق سامنے نہیں آسکے جن کا وعدہ مصنف نے کتاب کی تالیف سے پہلے کیا تھا۔

اس کے بعد اس کتاب میں موساد سے متعلق دوسری بڑی کارروائی وائٹ ہاؤس میں اپنے ایجنٹ تعینات کرانے سے متعلق ہے۔ جن کی مدد سے صدر کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کے درمیان ہونے والی جنسی گفتگو کی ریکارڈنگ کی گئی تھی اس معاملے کا تعلق 1984ء کے ایک اہم واقعے سے ہے جب امریکی بحریہ کے ایک یہودی رکن جوناتھن بولارڈ کو اسرائیل کے لئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا جوناتھن کی خدمات موساد نے کافی عرصے سے حاصل کر رکھی تھیں۔ امریکی سی آئی اے روس اور عرب ممالک کے درمیان عسکری تعاون سے متعلق جو معلومات حاصل کرتی تھی جوناتھن اپنے ذرائع سے انہیں حاصل کر کے موساد کو مہیا کرتا تھا۔ ان معلومات میں روسی اسلحے کی شام اور دوسرے عرب ممالک کو سپلائی، عراق، شام اور ایران میں ss-21 اور SAS میزائلوں کی جائے تنصیب، جنوبی افریقہ میں امریکن سی آئی اے کے جاسوسی نیٹ ورک سے متعلق تفصیلات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ 14 ستمبر 1979ء میں بحیرۂ ہند کے مقام پر ہونے والے خفیہ ایٹمی دھماکے کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔ گیارہ ماہ کے دوران موساد نے جوناتھن بولارڈ سے ایک ہزار سے زائد حساس دستاویزات حاصل کی تھیں۔ ان کارروائیوں کا دورانیہ اسرائیل میں شمعون پیریز کی حکومت کے دور کا ہے۔ جو اس وقت شرق الاوسط امریکی پالیسی سے متعلق زیادہ مطمئن نہیں تھا مگر جوناتھن بولارڈ کی ان کارروائیوں کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ رنگے ہاتھوں دھرلیا گیا بعد میں اسے جاسوسی کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

اس واقعے کے بعد یہ مسئلہ پھر اس وقت اٹھا جب اسرائیل نے باقاعدہ طور پر امریکہ سے بولارڈ کی رہائی کا مطالبہ کر دیا مگر صدر ریگن نے اس اپیل کو رد کر دیا تھا۔ 16 فروری 1997ء کی ایک درمیانی رات کو FBI نے واشنگٹن میں اسرائیلی سفارتخانے میں تعینات موساد کے ایک افسر (دوف) کی تل ابیب میں موساد کے سربراہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو ٹیپ کی تھی جس میں دوف اپنے چیف سے کہہ رہا تھا کہ اگر اسے اجازت ہو تو وہ وائٹ ہاؤس میں

موجود موساد کے ایجنٹ میگا سے وارن کرسٹوفر اور یاسر عرفات کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیلات حاصل کر لے جس میں الخلیل اور دریائے اردن کے مغربی کنارے سے اسرائیلی فوج کے انخلاء سے متعلق بات چیت کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں دوف کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میگا کے معاملے میں ان تفصیلات کو بھول جائے کیونکہ اس کی ذمہ داریاں کچھ اور ہیں۔ اس گفتگو کی ریکارڈنگ کے فوراً بعد FBI نے میگا سے متعلق تحقیقات شروع کر دیں۔ FBI کا خیال تھا کہ میگا کے علاوہ وائٹ ہاؤس میں ایک اور اسرائیلی جاسوس موجود ہے جو انتہائی حساس مقام پر تعینات ہے اور جس نے جوناتھن بولارڈ کے معاملے میں بھی کافی کام کیا تھا۔ مگر باوجود کوشش کے اس بات کا سرا FBI کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔

7 مارچ 1997ء میں موساد نے اسرائیل سے اپنا ایک ماہر واشنگٹن بھیجا جس کو کلنٹن اور مونیکا کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے لئے آلات کی تنصیبات کی ذمہ داری سونپی گئی تھی موساد کے اس ماہر نے اسرائیلی سفارتخانے کے قریب واقع واٹر گیٹ بلڈنگ میں مونیکا کے فلیٹ میں آلات نصب کر دیئے تھے۔ اس بات کا شک کلنٹن کو بھی ہو چکا تھا 27 مارچ کو کلنٹن نے مونیکا سے گفتگو کے دوران اس شک کا اظہار کیا تھا کہ کوئی غیر ملکی سفارتخانہ ان کی گفتگو ریکارڈ کر رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف تل ابیب میں یہ بحث جاری تھی کہ کلنٹن کو بے نقاب کرنے کے لئے ان ریکارڈنگز کو کس طرح کھولا جائے۔ دوسری طرف جب FBI نے میگا سے متعلق تحقیقات کا دائرہ وسیع کیا تو موساد نے اپنے ذرائع سے FBI تک یہ خبر پہنچائی کہ اگر وائٹ ہاؤس میں میگا پر ہاتھ ڈالا گیا تو امریکی صدر کی شرمناک گفتگو عام کر کے اسے سرعام ننگا کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد FBI کی تحقیق کا دور دور تک نام ونشان نہیں رہا۔

لاکربی کے حادثے کے بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ دسمبر 1988ء میں ہونے والے اس حادثے کی خفیہ تفصیلات موساد نے حاصل کر لی تھیں جو تمام کی تمام امریکہ کے خلاف جاتی تھیں مگر موساد نے اس حادثے کی معلومات کو محض اس لئے محفوظ کر رکھا تھا کہ اگر امریکہ میں موساد کی سرگرمیاں محدود کرنے پر زور ڈالا گیا تو اسرائیل ان حقائق کو امریکہ کے خلاف استعمال کرے گا۔

اس کتاب میں ایک اور اہم واقعے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جس میں ایک مرتبہ

پھر موساد پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ یہ واقعہ نزار ھنداوی اور اس کی آئرش دوست این میری مرفی کا ہے۔ این میری کو سکاٹ لینڈ یارڈ نے اس وقت گرفتار کیا تھا جب عال کمپنی کے ایک طیارے میں اسرائیل کے لئے روانہ ہو رہی تھی اس کے ہینڈ بیگ میں دھماکہ خیز مواد تھا۔ بعد میں اس واقعے کا موساد سے تعلق ظاہر ہو گیا جس نے موساد کے سربراہ ناحوم ادمونی کو برانگیختہ کر دیا۔ اس کے بعد موساد نے لندن میں واقع اسرائیلی سفارتخانے میں تعینات موساد کے افسر توف لیفی اور موساد کے فلسطینی ایجنٹ جس کا کوڈ نام ''ابو'' تھا کے ذریعے یورپ میں ایک تباہ کن پلان ترتیب دیا موساد نے ابو کو کاروباری شخص کے کاغذات تیار کرا کر یورپ میں ایک بڑے مشن پر مقرر کر دیا۔ صرف چند ہفتوں کے دوران موساد نے ابو کی مخبری پر یورپ میں 51 فلسطینی ٹھکانے لگا دیئے تھے۔ اس کے علاوہ موساد ابو کے ذریعے لندن میں ایسی کارروائیاں ڈلوانا چاہتی تھی جو شام کے کھاتے میں ڈالی جاسکیں اور حکومت برطانیہ احتجاجاً شام کو لندن میں اپنا سفارتخانہ بند کرنے کا حکم سنا دے۔

مصنف کے مطابق موساد نے لندن میں مشہور عرب مصنف کو بھی جون 1987ء میں اس لئے قتل کر دیا تھا تاکہ اسے PLO کے کھاتے میں ڈال کر برطانیہ سے احتجاج کرایا جاسکے اس کام کے لئے موساد نے اسماعیل صوان نامی فلسطینی نوجوان کا انتخاب کیا جو بظاہر PLO کا ہمدرد بن کر بیروت میں PLO کی ذیلی تنظیم باور 17 کے ٹریننگ کیمپ میں تربیت حاصل کرتا رہا۔ اس کیمپ کا انچارج عبدالرشید مصطفیٰ تھا جو موساد کی ہٹ لسٹ میں تھا۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد صوان کو تنظیم چھوڑنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ فرانسیسی زبان سیکھنے کے بہانے پہلے فرانس اور بعد میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے برطانیہ آگیا اس تعلیم کے دوران اس نے بم بنانے کی تربیت بھی حاصل کی۔ بعد میں موسا نے اسے اردنی پاسپورٹ پر لندن بھیجا اس کے علاوہ اس کو کینیڈا کا پاسپورٹ بھی دیا گیا تھا تاکہ اسے ایمرجنسی میں استعمال کرتے ہوئے برطانیہ سے آسانی سے نکالا جاسکے۔ اس سے مقاصد پورے ہونے کے بعد برطانیہ میں موساد کے رکن ریجیف اور جیکب بارارد نے اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

کتاب میں موساد سے متعلق اور بھی بہت سے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں مگر بہت سے واقعات کو اشاروں کنایوں میں بیان کرکے ادھوری شکل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔

مصری جاسوس جس نے
عرب اسرائیل جنگ کا پانسا پلٹ دیا

دنیا میں اب تک لوگ اسرائیلی موساد اور امریکن سی آئی اے کی کارروائیاں سنتے اور پڑھتے آئے ہیں جنہیں مغربی میڈیا بڑھا چڑھا کر پیش کرتا رہا ہے مگر ایسا ہی ایک حیرت انگیز کردار مصری خفیہ ادارے کے رکن احمد محمد عبدالرحمٰن الھوان کا ہے جس نے اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب میں بیٹھ کر اور سابق اسرائیلی وزیراعظم اور وزراء خارجہ کے ساتھ کام کرکے اپنے ملک مصر کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں جبکہ موساد کی فائلوں میں یہ مصری نژاد اسرائیلی جاسوس تھا! اس جاسوس کا سب سے بڑا کارنامہ 1973ء کی جنگ رمضان میں مصر کو اسرائیل کے مقابلے میں عسکری برتری دلوانا تھا جس نے اسرائیل کی عسکری قوت اور موساد کے دیومالائی طلسم کو پاش پاش کرکے رکھ دیا تھا۔

کچھ عرصہ پیشتر مصر کے اس خطرناک ترین جاسوس کی حقیقت خفیہ ادارے کی فائلوں سے نکل کر پہلی مرتبہ ایک مصری فلم (دموع فی عیون وقحۃ) کی شکل میں عوام کے سامنے پیش کی گئی ہے جس میں شروع سے لے کر اکتوبر 1973ء میں لڑی جانے والی عرب اسرائیل جنگ کے واقعات بیان کئے گئے مگر یہ انتہائی مختصر انداز میں تھے اس جنگ کے دوران مصری جاسوس نے موساد سے حاصل کردہ ایسا ''آلہ'' مصر بھیجا تھا جس نے جنگ کا نقشہ مصر کے حق میں پلٹ

www.kurfku.blogspot.com

یا تھا اور موساد تمام تر وسائل کے باوجود منہ تکتی رہ گئی تھی۔اس فلم میں جمعہ الشوان کے نام سے کردار مصر کے صف اول کے اداکار عادل امام نے کیا ہے۔جسے اسرائیلی خفیہ ادارہ موساد یونان میں بھرتی کرتا ہے اور مختلف یورپی ممالک سے ہوتے ہوئے آخر کار وہ اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب جا پہنچتا ہے۔اس فلم میں موساد کی یہودی جاسوسہ ''جوجو'' کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اپنی خوبصورتی کے باعث مصر کے اعلیٰ حلقوں میں خاصی مشہور تھی مگر مصری جاسوس جمعہ الشوان (احمد محمد عبدالرحمٰن الھوان) نے اسے مصری خفیہ ادارے کے سامنے پیش کر دیا تھا جہاں اس نے اسرائیلی جاسوسہ ہونے کا اعتراف کیا تھا ''جوجو'' نے بعد میں مسلمان ہو کر مصر میں ہی شادی کر لی تھی اور آج بھی وہیں مقیم ہے۔مگر مصری انٹیلی جنس اداروں کی مصلحتوں کی وجہ سے ''فلم میں ''جوجو'' کا کردار بھی انتہائی محدود دکھایا گیا۔اس فلم کے منظر عام پر آنے کے بعد مصری صحافتی حلقوں نے دیگر مصری جاسوسوں سے رابطے استوار کئے جواب فرائض سے سبکدوشی کے بعد اپنے وطن ہی میں قیام پزیر ہیں ان میں مشہور مصری جاسوس احمد محمد عبدالرحمٰن نے مصری اخبارات کو بتایا کہ اس فلم میں اسرائیل کے بارے میں جو معلومات دی گئی ہیں وہ صرف سو میں سے چھ فیصد ہیں ورنہ اس سلسلے میں ان مصریوں کی کامیابیاں کئی گنا زیادہ ہیں جو اپنے وطن کے لئے سالہا سال دشمن ملک میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔احمد محمد عبدالرحمٰن کے مطابق اسرائیلی جاسوسہ ''جوجو'' موساد میں ایک بڑے رینک کی آفیسر تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ بلا کی خوبصورت تھی جو یہودیوں کا اہم ہتھیار ہوتا ہے مگر وہ مصر کے خلاف جاسوسی کے لئے یہاں آئی اور یہاں آکر مسلمان ہوگئی آجکل وہ فاطمہ الزہراء کے نام سے مصر میں ہی شادی شدہ زندگی گذار رہی ہے۔

ان انکشافات کے حوالے سے جو دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں ان میں اسرائیل کی سیاسی شخصیات کے بارے میں معلومات ہیں ان میں اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز، اسرائیلی وزیر دفاع بنیامین الیعازر اور ایزرا وائزمین کے ساتھ بھی مصری جاسوس کام کرتا رہا ہے۔احمد محمد جمال عبدالناصر کی ہدایت پر موساد میں کام کرتا رہا بعد میں مصری صدر انور السادات نے اسے خصوصی احکامات کے تحت تل ابیب میں اپنی خدمات جاری رکھنے کی ہدایات دیں جو 1978ء تک جاری رہیں۔ اس دوران موساد کو اس پر کبھی شک نہیں ہوا اور تل ابیب اس کے لئے ہمیشہ

KURF

www.facebook.com/kurf.ku

کھلا رہا۔ان دلچسپ اور مختصر تفصیلات کے بعد مصر کے ساتھ ساتھ دیگر عرب میڈیا بھی حرکت میں آ گیا جنہوں نے مصری جاسوس احمد محمد عبدالرحمٰن سے براہ راست رابطے کی مہم چلائی تاکہ اس کی کارروائیوں کی مکمل تفصیلات سامنے لائی جاسکیں۔اس سلسلے میں اس سے جو سوال جواب ہوئے وہ اپنی جگہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

احمد محمد عبدالرحمٰن سے جب پوچھا گیا کہ مصری فلم ''دموع فی عیون وقحتہ'' کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب دیا کہ یہ سیکورٹی اور حکومتی مصلحتوں کے پیش نظر انتہائی مختصر فلم تھی جس میں حقیقی تفصیلات پانچ دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ ''میں سویز کے علاقے میں پیدا ہوا، نہر سویز کے علاقے میں چونکہ دنیا بھر کے بحری جہاز آتے جاتے ہیں اس لئے یہاں کے لوگوں کا مختلف قوموں کے افراد سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ بیک وقت کئی زبانوں میں بات کرسکتے ہیں میں بھی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔1967ء میں جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تو میں بھی ان نوجوانوں میں شامل تھا جنہوں نے مصری فوج میں شامل ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کیا تھا مگر اس وقت کئی علاقے مصر کے ہاتھ سے نکل گئے جن میں سویز کا علاقہ بھی شامل تھا مجھے ہجرت کر کے قاہرہ آنا پڑا۔ابھی جون 1967ء کی جنگ نہیں ہوئی تھی میں نے سویز کے علاقے میں ایک یونانی بحری جہاز میں خدمات انجام دینے کے لئے درخواست دے رکھی تھی، اس جہاز کے مالک کے ذمے میرے ایک ہزار گنی تھے جو اس نے مجھے ادا کرنے تھے اس لئے میں اس سے ملنے ایتھنز چلا گیا مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں ہے میں نے وہیں اس کا انتظار کرنے کا پروگرام بنایا۔تھوڑے عرصے بعد وہ یونانی واپس آ گیا مگر اس کے ساتھ کئی مصری بھی تھے جو کام حاصل کرنے کی غرض سے اس کے ساتھ یہاں آئے تھے ان میں سے کچھ کو میں جانتا بھی تھا۔ میں نے اس سے اپنے پیسوں کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ میں اس کے بحری جہاز میں منیجر کے طور پر کام کروں اور وہ مجھے 185 آسٹریلین گنی ماہانہ تنخواہ دے گا۔تب مجھے ہرگز نہیں معلوم تھا کہ مجھے موساد کے ذریعے گھیرا جارہا ہے۔''برلیں'' جو ایتھنز کے نواح میں واقع ایک قصبہ ہے یہاں موساد کا ایک مرکز تھا میرے قیام کے دوران وہ وہاں میری نگرانی کرتے رہے۔میں نے یہاں دو ہفتے قیام کیا اس دوران دیگر مصریوں کے بارے میں بھی مجھے خاصی آگاہی ہو چکی تھی

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

ان میں ایک الریس زکریا بھی تھا جس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مصر کے شہر دمیاط سے تعلق رکھتا ہے میرے پاس اس وقت پیسوں کی کمی تھی اس لئے میں نے الریس زکریا کو پیش کش کی کہ وہ میری گھڑی خرید لے اس نے میری ضرورت کے پیش نظر اسے خرید لیا یہ بات نہ میرے علم میں تھی اور نہ کوئی دوسرا مصری جانتا تھا کہ الریس زکریا مصری انٹیلی جنس کا ایک آفسر ہے۔وہ ہمارے ساتھ دیگر مصریوں کی طرح کام کی تلاش میں رہتا تھا ہم لوگ اکٹھے قہوہ خانوں میں بیٹھتے اور کام کے سلسلے میں گفتگو کرتے۔تھوڑے عرصے بعد دیموس نامی ایک یونانی نے ہمیں کام دیا مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دیموس موساد کا ایجنٹ ہے اس کے علاوہ 1967ء تک موساد کا نام مصریوں میں اتنا عام بھی نہیں تھا یونان سے ہمارا چھوٹا بحری جہاز جرمنی آگیا یہاں آکر میں نے جہاز کو چھوڑ دیا مجھے اس وقت حیرت کا سامنا ہوا جب دیموس بھی میرے ساتھ آگیا وہ اب میرا دوست تھا اسے بعد میں میرا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا تھا ہم جرمنی میں کچھ دیر قیام کے بعد پھر واپس جہاز پر آگئے اب اس جہاز کی اگلی منزل برطانیہ میں لنکا شائر کی بندرگاہ تھی دیموس اور اس بحری جہاز میں اس کا پارٹنر دونوں موساد کے لئے کام کرتے تھے۔میں دیموس کے ساتھ برطانیہ کی سیر کرتا رہا اس وقت میں بالکل نوجوان تھا ہم اکثر نائٹ کلبوں اور باروں میں جایا کرتے مجھے شراب سے رغبت نہیں تھی اس لئے میں ہمیشہ ٹھنڈے مشروبات منگواتا ایک مرتبہ ہم ایک بار میں بیٹھے تھے کہ ایک نوجوان ہمارے قریب آیا اس کا نام الاسمر تھا اس نے ہمارے نام اور کام کے بارے میں سوال کیا میں نے اسے اپنا کارڈ دیا جس میں میرا نام اور مصر کا پتا تھا اس کارڈ پر میں نے اپنا پیشہ مصر کے ایک سیاحتی ادارے کے سربراہ کے طور پر لکھا ہوا تھا اس نے کہا کہ اس میں لکھا ہے کہ تم سیاحتی ادارے کے ڈائریکٹر ہو جبکہ تم تو جہاز کے عرشے پر کام کرتے ہو میں نے اسے جواب دیا کہ جنگ (1967ء کی عرب اسرائیل جنگ) کی وجہ سے مجھے یہ کام کرنا پڑ رہا ہے میں چونکہ شادی شدہ ہوں اور میرے بچے ہیں اس لئے مجھے کام کرنا پڑتا ہے۔میں نے اسے جنگ کی وجہ سے مصر کے حالات کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔اس نوجوان الاسمر نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کتنا کما لیتا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ سویز کے علاقے میں کام کرنے کی وجہ سے میں سات زبانیں بول سکتا ہوں، جبکہ میری آمدنی انتہائی کم ہے اس نے کہا کہ میں اس سے اسی دن شام چار بجے ملوں وہ مجھے ایسا کام

KURF

دلوائے گا جس میں زبانوں کے ماہر شخص کی ضرورت ہے اور میری تنخواہ ایک ہزار گنی ہوگی 1967ء میں یہ تنخواہ بہت زیادہ تصور کی جاتی تھی کوئی اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔
میں نے پوچھا کہ مجھے کیا کام کرنا ہوگا تو اس نے کہا کہ میں ایک انٹرنیشنل ہوٹل میں کام کروں گا میں اور دیموس مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہاں پہنچ گئے مگر انتظار کے باوجود الاسمر نہیں آیا میں ساری رات ایک ہزار گنی کے خواب دیکھتا رہا تھا اس وجہ سے مجھے خاصی پریشانی تھی۔
میں اس سوچ میں گم تھا کہ ہوٹل کا بیرا دو کولڈ ڈرنک لے آیا ہم نے اسے کہا کہ ہم نے تو آرڈر نہیں دیا تو اس نے کہا کہ یہ ان دو نوجوان لڑکیوں کی جانب سے ہے مڑ کر دیکھا تو ہمارے دائیں جانب کی میز سے دو لڑکیاں ہمیں گھور رہی تھیں ڈرنک کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا جس میں لکھا تھا کہ ''ہم آپ کی طرف آئیں یا آپ ہماری جانب آئیں گے''میں نے ایسا حسن نہ تو سویز میں دیکھا تھا اور نہ ہی قاہرہ میں۔موساد ایسی ہی ہلاکت خیز حسن کی مالک لڑکیوں کو اپنے ہاں آفیسر کے رینک پر تعینات کرتی ہے۔ان میں سے ایک کا نام میری اور دوسری کا نام جوجو تھا جس کا کردار مصری فلم میں مشیرہ اسماعیل نے ادا کیا ہے۔جوجو نے ہمیں بتایا کہ اس کا باپ مسٹر ڈیوڈ ارب پتی تاجر ہے جبکہ میں پہلے سمجھ رہا تھا کہ یہ دونوں کال گرل ہیں مگر صورتحال بالکل مختلف تھی۔میری باتیں کر رہی تھی جبکہ جوجو خاموش تھی اور مسلسل میری جانب دیکھے جا رہی تھی میری نے ہنستے ہوئے کہا کہ لگتا ہے جوجو تم کو پسند کرنے لگی ہے۔میں نوجوانی میں خاصا وجیہہ تھا اس لئے میرے لئے ایسا محسوس کرنا پہلی مرتبہ نہیں تھا۔جوجو نے مجھے کہا کہ ''کیا میں چرس پیتا ہوں'' میں بھلا اپنے پیر پر کلہاڑی کیوں مارتا میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔تھوڑی دیر بعد ہم نیچے اترے میں جوجو سے تھوڑا پیچھے تھا کہ اچانک الاسمر جوجو کے قریب آیا جوجو نے اس سے سوال کیا کیا تمہارے پاس ''کچھ'' ہے؟ الاسمر نے اسے اس کی مطلوبہ شے دے دی اس کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر دیر سے آنے کی معذرت کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں جوجو کے ساتھ ''بہترین وقت'' گذاروں گا یہ کہہ وہ واپس چلا گیا میں جوجو کے ساتھ چلا گیا بعد میں اس نے بحری جہاز پر ملاقات کا وعدہ کیا اور وہ ایک مرتبہ وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے بھی آئی۔اس مرتبہ وہ بہت سے قیمتی تحائف بھی ساتھ لائی تھی جو اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھے تھے اس نے تحائف میرے حوالے کرتے ہوئے کہا ''کیا تم مجھ سے شادی کرو گے'' میں

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

فوراً کہا "ہاں میں تیار ہوں" اس نے مصر میں میری بیوی کے بارے میں سوال کیا میں نے اسے مطمئن کر دیا تو اس نے کہا کہ میں اس کے باپ سے ملوں اس وقت تک میں یہ سمجھتا تھا کہ جوجو انگریز ہے۔ وہ مجھے مانچسٹر میں اپنے باپ مسٹر ڈیوڈ کے پاس ایک بہت بڑی فیکٹری میں لے گئی اس کا دفتر خاصا عالیشان تھا۔ مسٹر ڈیوڈ نے مجھ سے سوال کیا۔ کیا تم جوجو سے شادی کرو گے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اس سلسلے میں تم کو کوئی مشکل تو پیش نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کہا کہ مصر میں تمھاری بیوی فاطمہ اور ایک بیٹا محمد اور ایک بیٹی ماہا ہے اگر ہم انہیں مصر میں خرچہ بھیجیں تو تمہارے خیال میں ان کا ماہانہ خرچہ کتنا ہوگا؟ میں نے کہا کہ جتنا آپ مناسب سمجھیں۔ جس پر اس نے کہا کہ ہم انہیں ایک ہزار گنی ماہانہ مصر میں ہی بھیج دیا کریں گے تا کہ وہ وہاں سکون سے زندگی گذار سکیں۔ اس کے ساتھ اس نے کہا کہ تم ہماری فیکٹری میں کام کرو گے اور میں یہاں تمہاری تنخواہ بھی ایک ہزار گنی کے برابر مقرر کر رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ تم جہاز کی نوکری چھوڑ دو۔ میں نے اسے کہا کہ جہاز کا کپتان مجھے اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک کوئی دوسرا میری جگہ کام کرنے والا مل نہیں جاتا اور ایسا ہی ہوا کپتان نے کہا جب تک تمہاری جگہ کوئی اور نہیں آتا اس وقت تک تم یہیں کام کرو گے یورپ کی جس بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہوتا میں جوجو کو اپنا منتظر پاتا مگر ایک مرتبہ جب بیلجئم میں انٹورپ کی بندرگاہ پر میرا جہاز لنگر انداز ہوا تو جوجو وہاں نہیں تھی میری حالت دیوانوں جیسی ہوگئی کیونکہ بہت تھوڑے عرصے میں، میں جوجو کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو چکا تھا اور اس کا یہاں نہ ہونا میرے لئے کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔

بیلجئم میں میرے ساتھ کئی کام کرنے والے افراد جہاز سے اتر کر شہر میں آگئے تھے۔ یہاں میری زندگی کا دوسرا اہم مرحلہ شروع ہوا۔ ہم چند دوست ایک قہوہ خانے میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرایا اگلے دس منٹ تک وہ اس غلطی کی معافی مانگتا رہا۔ اس نے میرے لئے اور جو میرے ساتھ تھے ان کے لئے مشروبات منگوائے اس شخص کا نام ابراہام تھا اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جسے وہ جاک کہہ کر پکار رہا تھا اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ ایک لوہے کی فیکٹری کے مالک کا بیٹا ہے انہوں نے میری قومیت پوچھی: میں نے ان سے اسی قسم کا سوال کیا تو ایک نے کہا وہ پاکستان سے تعلق رکھتا ہے جبکہ دوسرا یہاں کا

باشندہ ہے انہوں نے کہا کہ وہ یہاں کی قومیت لینے کی کوشش کر رہے ہیں انہوں نے مجھ سے قاہرہ اور مصر کے دوسرے شہروں کے بارے میں کئی سوالات کیے وہ شاید یہ بتانا چاہ رہے ہوں کہ جیسے انہوں نے یہ شہر پہلے دیکھے ہیں۔ ان کے ساتھ پارٹی خاصی دلچسپ رہی۔ یہاں ان موساد کے اہلکاروں سے ایک غلطی ہوئی یعنی تمام باتوں کے باوجود انہوں نے میرے جہاز اور اس کے قیام کی جگہ کے متعلق سوال نہ کیے اس کا مطلب تھا کہ انہیں اس کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد وہ میرے ساتھ ہی بندرگاہ میں جہاز کی جانب آگئے میں نے بھی اس وقت اس جانب زیادہ توجہ نہیں دی حالانکہ ان کے نام یعنی ابراہام اور جاک دونوں خالصتاً یہودی نام تھے۔ جہاز پر پہنچ کر میں نے ارادہ کیا کہ انہیں اوپر لے جا کر کافی پلاؤں۔ انہوں نے کافی کی دعوت قبول کی اور میرے ساتھ جہاز کے عرشے پر آگئے، میں نے انہیں بتایا کہ میں جوجو نامی ایک لڑکی کو جانتا ہوں ہم نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا مگر کافی عرصے سے وہ مجھے مل نہیں رہی۔ انہوں نے کہا کہ میں انہیں جوجو کا پتا بتاؤں وہ اسے میرے لئے ڈھونڈ نکالیں گے۔ جاک نے مجھے کہا کہ میں اس کے باپ کی لوہے کی فیکٹری میں کام کروں وہاں مجھے پانچ ہزار ڈالر ماہانہ ملیں گے۔ انہوں نے مجھ سے جوجو کے خطوط مانگے میں نے اس کے خطوط کا پورا بیگ ان کے حوالے کر دیا اور خود پلیٹیں صاف کرنے میں مصروف ہو گیا، ابراہام نے بیگ میں سے چند خطوط منتخب کیے اور اپنی جیب میں رکھ لئے، دوسری جانب میں نے لوہے کی فیکٹری میں کام کرنے پر کوئی رغبت ظاہر نہ کی۔

دوسرے روز ابراہام میرے پاس آیا تو اس کے ساتھ جاک نہیں تھا میں نے جاک کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہے اس کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر میکسم ریستوران لے گیا۔ ہم جس نشست پر بیٹھے تھے اس کے قریب ہی ایک اور نشست پر انتہائی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی یہ جوجو سے زیادہ حسین تھی، میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا اس نے اچانک میری جانب نظریں کی تو میں خجالت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ابراہام نے نظر گھما کر میری جانب دیکھ کر کہا تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اس کے بعد اس نے کہا کہ اس لڑکی کو اپنی سیٹ پر آنے کی دعوت دو، میں نے جب اسے اپنی نشست پر آنے کی دعوت دی تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی اس نے اپنا تعارف کرایا اس کا نام

www.kurfku.blogspot.com

راسئیل ہے۔ اس وقت تک جاک بھی پہنچ چکا تھا آتے ہی اس نے خبر سنائی کہ اس کا باپ مجھے نوکری دینے پر راضی ہو چکا ہے اور میری تنخواہ پانچ ہزار ڈالر ہوگی جس میں اوور ٹائم شامل نہیں ہوگا اس کے بعد اس نے مجھ سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں اور کہا کہ میں اسے اپنا پاسپورٹ دے دوں، میں نے کہا کہ میرا پاسپورٹ کپتان کے پاس ہے اس نے کہا کہ جہاز کی نوکری فوراً چھوڑ دو میں اسے پاسپورٹ دیتے ہوئے ڈر بھی رہا تھا کیونکہ اسرائیل کے خلاف مصر کے عزائم اور جمال عبدالناصر کی پالیسیوں کی وجہ سے اس وقت مصریوں کو یورپ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور جس کے پاس مصری پاسپورٹ ہوتا اس سے امتیازی سلوک کیا جاتا مگر اس نے مجھے تسلی دی کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میرے ساتھ ایسا ہی ہوا میں آسانی کے ساتھ جہاز کے کپتان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا برطانوی پولیس آئی اور اس نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگا دی جاک نے کپتان سے میرے سارے حقوق حاصل کر لئے تھے یہ تمام سہولتیں مجھے شک میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھیں۔

میں بحری جہاز سے نکل کر باہر آیا تو ابراہام میرے انتظار میں تھا وہ مجھے کار کے ذریعے جرمنی کے شہر فرینکفرٹ لے گیا یہاں ہم نے دو تین روز ہی گذارے تھے کہ ابراہام نے مجھ سے سوال کر دیا کہ کیا میں اپنے بچوں سے ملنا چاہوں گا؟ اس نے کہا کہ اس کی کمپنی نے قاہرہ میں اپنی ایک شاخ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں اس نئے دفتر کا افتتاح کروں گا۔

ابراہام نے مجھے ایک لاکھ 85 ہزار ڈالر کی رقم دی یہ رقم 1967ء کے زمانے میں کئی ملین ڈالر کے برابر تھی جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس رقم کو ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھا گیا تھا اس نے کہا کہ اس میں سے 30 ہزار ڈالر میرے ہیں یعنی چھ ماہ کی ایڈوانس تنخواہ۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ میں کوئی مناسب سیکنڈ ہینڈ کار خریدوں اور قاہرہ کی اہم اور تجارتی شارع پر کمپنی کا دفتر کھولنے کی کوشش کروں اس کے بعد اس نے مجھے تین پتے دئے جو جرمن، برطانیہ اور آسٹریا کے تھے مگر ان تینوں پر نام ایک ہی تھا یعنی "محمد سلیم" اس نے کہا کہ میں ان تینوں پتوں پر محمد سلیم کے نام جو بھی خط ارسال کروں گا وہ ان تک پہنچ جائے گا اس نے کہا کہ محمد سلیم کو اس انداز میں مخاطب کرنا ہے کہ جیسے وہ تمہارا خالہ زاد یا چچا زاد ہو۔ اس کے ساتھ اس نے کہا ا۔

KURF

www.facebook.com/kurf.ku

مصر کے ساحلی علاقوں پر جو چند کمپنیوں کے بحری جہاز آتے ہیں ان کے بارے میں معلومات ارسال کرنی ہیں ان میں سے ایک کمپنی کے جہاز پر میں کام بھی کر چکا تھا یہ سب غیر مصری تھے۔ میں نے سوال کیا کہ تمہیں ان کی معلومات کیوں چاہئیں تو اس نے کہا کہ ہماری کمپنی کا ایک شعبہ ان جہازوں کی تجارتی حیثیت جاننا چاہتا ہے تا کہ ان کے وزن اور لمبائی کے حساب سے ہم بھی ایسے جہاز استعمال کر سکیں مگر اس کے ساتھ اس نے کہا کہ اس قسم کی معلومات دیئے گئے پتوں پر بالکل ارسال نہ کروں بس محمد سلیم کے نام اس طرح لکھنا ہے کہ میرے حالات ٹھیک نہیں وہاں میرے لئے کام تلاش کرو اور مجھے سفر کے لئے ٹکٹ بھیج دو وغیرہ وغیرہ یہ خطوط عام ڈاک سے بھیجنے ہیں اس کے بعد وہ مجھے ائرپورٹ تک لے کر آیا اور مجھے جہاز میں قاہرہ کے لئے سوار کر دیا۔ قاہرہ تک کا سفر چار گھنٹے کا تھا جس کے دوران میں اس خطیر رقم کے بارے میں سوچتا رہا جو ایک بیگ میں ڈال کر مجھے دی گئی تھی کہ کیا اس رقم کے بدلے میں، میں نے اپنے آپ کو، اپنے دین اور وطن کو فروخت کر دیا ہے؟ میں اپنی ماں، بہن اور دیگر گھر والوں کے ساتھ ساتھ سویز کے علاقے کے بارے میں سوچتا رہا مصر، میرے وطن کی اسرائیل کے ہاتھوں تباہی میرے سامنے تھی۔

جب میں قاہرہ پہنچا تو اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ میں سیدھا ائرپورٹ سے اپنے گھر پہنچا اپنی بیوی فاطمہ بیٹے محمد اور بیٹی ماہا کے لئے بہت سے تحائف تھے۔ گھر والوں سے ملنے کے بعد میں نے کچھ دیر آرام کیا اور سوچنے لگا کہ صدر جمال عبدالناصر سے کس طرح ملاقات کی جائے۔ میں گھر سے فارغ ہو کر قاہرہ کے تعلقات عامہ کے ادارے میں پہنچا اور یہاں سے صدر کے دفتر کا پتا معلوم کیا یہاں میں نے پانچ گھنٹے صرف کئے ادارے کے ڈائریکٹر جس کا نام احمد صالح تھا نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا اور پوچھا کہ میں صدر سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں آج ہی یورپ سے آیا ہوں اور صدر صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ اس نے سخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم صدر سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟ اس نے مجھے تین روز تک اپنے پاس رکھا اور میرے بار بار اصرار پر آخر کار پریذیڈنسی رابطہ کیا جس پر مجھے صدر جمال عبدالناصر سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔

اجازت ملنے کے فوراً بعد مجھے جمال عبدالناصر کے دفتر بھیج دیا گیا میں تین گھنٹے اس کے

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

www.kurfku.blogspot.com
www.facebook.com/kurf.ku

ساتھ رہا جس میں جمال عبدالناصر نے مجھ سے سوال کیا کہ مجھے تین روز تک کیوں روکا گیا؟ میں نے ساری تفصیلات سے اسے آگاہ کیا اس کے بعد میں نے اسے آگاہ کیا کہ اس بیگ میں ایک لاکھ 85 ہزار ڈالر ہیں جو مجھے دیئے گئے ہیں، جمال عبدالناصر نے پوچھا کہ "کیا یہ بیگ اس وقت تمہارے پاس تھا جب تین روز تک تم سے پوچھ گچھ ہوتی رہی؟" میں نے جواب دیا کہ جی ہاں جب آپ سے ملاقات کا ٹائم مقرر ہوگیا تو انہوں نے یہ بیگ مجھے واپس کردیا۔ جاک اور ابراہام نے جس طرح مجھے بتایا تھا میں نے اس طریقے سے یہ بیگ جمال عبدالناصر کے سامنے کھولا۔ جمال عبدالناصر نے کہا کہ کیا سکیورٹی والوں کو علم تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے صدر جمال عبدالناصر کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا جس پر انہوں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور مجھے مصری انٹیلی جنس کے مرکزی دفتر روانہ کردیا جہاں میری ملاقات خفیہ ادارے کے ایک بڑے آفیسر سے ہوئی وہ مجھ سے ایسے ملا جیسے میں اس کو اور وہ مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ میری ضروری جامہ تلاشی کے بعد یہ آفیسر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور اپنی میز کی دراز کھول کر اس میں سے وہ گھڑی نکال کر میرے سامنے رکھ دی جو اس نے مجھ سے ایتھنز میں خریدی تھی یہ الریس زکریا تھا۔ اس نے کہا الحمدللہ تم ہم تک پہنچ گئے ہمارا خیال تھا کہ تم ایک دن ضرور آؤ گے میں نے اس کے سامنے جوجو، جاک، ابراہام دیموس اور راشیل کا تمام قصہ تفصیل سے بیان کیا۔

اس مرحلے کے بعد مصری انٹیلی جنس نے مجھے ہدایت کی کہ میں منصوبے کے تحت قاہرہ میں دفتر قائم کرلوں۔ میں نے قاہرہ کی مشہور شارع شریف پاشا پر الایموبیلیا بلڈنگ میں دفتر قائم کرلیا اس وقت اس کا کرایہ 16 گنی ماہانہ تھا اس کے بعد میں نے موساد کی ہدایت کے مطابق پرانے ماڈل کی ایک کار خریدی اس دوران میں سب سے اہم مرحلہ یہ تھا کہ مجھے موساد کے ساتھ کام کرنا تھا اور اس کی تمام تفصیلات سے مصری انٹیلی جنس کو باخبر رکھنا تھا۔ اس مرحلے سے فارغ ہوکر میں اسکندریہ اور سویز کے علاقے میں گیا اور موساد کی ہدایات پر وہاں 13،12 جہازوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور پھر یہ معلومات "اپنے خالہ زاد" محمد سلیم کے نام لندن روانہ کردیں۔ اس خط میں، میں نے اسے لکھا کہ

"سلیم مجھے امید ہے تم خیریت سے ہوگے۔ مصر میں میرے حالات زیادہ ٹھیک نہیں! اس لئے میں آپ کے پاس لندن آنا چاہتا ہوں مہربانی کرکے میرے لئے کسی کام کا بندوبست کردو تاکہ میں وہاں آکر کام تلاش کرسکوں"۔ اس دور میں مصری بغیر دعوت نامے کے ملک سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔"

موساد نے مجھے ایک بحری جہاز "سائبیریا" کا ٹکٹ ارسال کردیا تاکہ میں اسکندریہ کی بندرگاہ سے اٹلی کے علاقے جنوی آسکوں۔ مصری انٹیلی جنس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ دوران سفر میرے پاس گیارہ ڈالر سے زیادہ رقم نہ ہو یہ رقم ایک مصری کے سفر کے لئے کافی ہوتی تھی۔ الریس زکریا نے مجھے اس دوران مخصوص قسم کی تربیت بھی دی تھی اس کا کہنا تھا کہ میں خود جاکر ویزا حاصل کروں میں نے ایسے ہی کیا میں نے الریس زکریا سے کہا کہ 11 ڈالر میرے لئے کافی نہیں ہوں گے مجھے کم ازکم پانچسو ڈالر درکار ہیں کیونکہ اٹلی پہنچ کر جب میں "محمد سلیم" کو ٹیلی گرام بھیجوں گا تو میرے پاس صرف چھ ڈالر باقی بچیں گے اس پر الریس زکریا نے کہا کہ "ہم تم کو اٹلی میں ہی ایک ملین ڈالر دے سکتے ہیں مگر اس قسم کے کاموں میں خود پر اعتماد کرنا پڑتا ہے قربانی کے لئے دکھ سہنے پڑتے ہیں تمہیں چاہئے کہ جب تک وہ لوگ تم تک پہنچ نہیں جاتے تم انہی چھ ڈالروں میں ایک دو دن گزارو"

بہرحال میں بحری جہاز پر سوار ہوا یہ جہاز اسکندریہ سے اٹلی کی جانب روانہ ہوا اس بڑے بحری جہاز میں تقریباً 1200 مختلف قومیتوں کے افراد سوار تھے مجھ پر یہی ایک بات سوار تھی کہ میں گیارہ ڈالروں کے ساتھ کیسے گزارا کروں گا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اٹلی میں میرے ساتھ کیا ہوگا میں جاک اور ابراہام کے ساتھ کیسے معاملات طے کروں گا؟ مصری انٹیلی جنس نے مجھے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے اچھی خاصی تربیت دی تھی لیکن اس کے باوجود میں اندیشوں میں گرفتار تھا میں ان سوچوں میں ہی گم تھا کہ ایک عورت نے اپنے ہاتھ پیچھے سے میری آنکھوں پر رکھ دیئے اور خوبصورت آواز میں سوال کیا "میں کون ہوں؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا اس نے یہ سوال کئی مرتبہ دہرایا میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا تو اس نے جھلا کر پوچھا کہ میں جواب کیوں نہیں دے رہا؟ میں نے اسے کہا کہ میں جواب دینے کی تیاری کررہا ہوں مگر اس شرط پر کہ تم اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر سے نہیں ہٹاؤ گی۔ اس کے بعد میں نے اسے کہا کہ کیا تم جوجو ہو؟ اس نے جواب دیا "نہیں" اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ میری

www.kurfku.blogspot.com
www.facebook.com/kurf.ku

آنکھوں پر سے اٹھائے میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ ایک حسین ترین عورت تھی جسے میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ یہ بھی موساد کا ایک معروف طریقہ واردات تھا جس سے وہ انسانیت کا پوری بے دردی سے شکار کرتی ہے۔۔۔عورت اور جنس کا ہتھیار۔۔۔۔

میں نے اس سے حیرت سے سوال کیا کہ کیا تم مجھ کو جانتی ہو؟ اس نے کہا نہیں میں تمہیں آدھے گھنٹے سے یہاں بیٹھا دیکھ رہی تھی مگر تم خالی ذہن کے لگتے ہو تم نے مجھے محسوس ہی نہیں کیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ایک سیاحتی ادارے کا رکن ہوں اور مختلف ممالک کا دورہ کرتا رہتا ہوں تا کہ کام حاصل کرسکوں اور اسی سلسلے میں میں سوچوں میں گم تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا میرا نام ''خریستولا'' ہے جنوی میں ہمارا ہوٹل ہے جس کا نام ''فلور'' ہے میں سیر کی غرض سے اسکندریہ گئی ہوئی تھی مجھے مصریوں نے وہاں بہت حیران کیا۔ کیا تم میرے ساتھ کچھ پینا پسند کرو گے؟ میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے کیونکہ قانونی طور پر ہم گیارہ ڈالر سے زیادہ رقم نہیں لے جاسکتے میری کمپنی میرے لئے اٹلی میں رقم کا بندوبست کرے گی اس لئے میں آپ کی دعوت قبول کرنے سے معذور ہوں اس نے کہا کہ دعوت میری طرف سے ہے اس لئے میں پیسوں کے لئے پریشان نہ ہوں ''اٹلی پہنچ کر تم ہمارے ہوٹل میں بلا معاوضہ رہ سکتے ہو''۔ اس نے بڑے انداز سے جسم کو بل دیتے اور لہراتے ہوئے کہا۔ یہ سب موساد کا طریقہ واردات تھا جسے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے لئے کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ اس عورت نے مجھے کہا کہ ''تم پوکر کھیلو گے؟'' میں نے جواب دیا ''میری جیب میں گیارہ ڈالر ہیں اس لئے میں یہ کیسے کھیل سکتا ہوں؟'' اس نے جواب دیا ''دعوت میں نے دی ہے یہ لو دوسو ڈالر اور کھیلو'' اس قسم کے جہازوں میں جوا خا ہوتے ہیں میں بھی اسے ساتھ لے کر جوئے خانے میں داخل ہو گیا میں اس کھیل میں زیادہ ما نہیں تھا مگر کھیل ضرور سکتا تھا کھیل کی میز کے گرد سات آٹھ مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ میں کارڈ اٹھائے اور جب شو کرانے کا وقت آیا تو انہیں میز پر پھینک دیا باقی لوگوں نے بھی ایسا ا میں بازی جیت گیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ میں نے کارڈ اٹھائے اس وقت میرے مقابل ا لڑکی تھی اس نے کارڈ پھینک دیئے اس مرتبہ بھی میں جیت گیا غرض کہ صبح چار بجے تک ہم لو جوا کھیلتے رہے آخر دیگر لوگوں نے کہا کہ اب وہ تھک چکے ہیں کل پھر کھیلیں گے میں اس را

ایک ہزار نو سو ڈالر جیت چکا تھا یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے رقم اٹھائی اور اپنے کیبن میں آ گیا تھوڑی دیر بعد کسی نے میرے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا میں نے سوال کیا کون؟ دوسری طرف سے جواب آیا ''خریستولا'' میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کیسے میرے کیبن کا نمبر معلوم ہوا؟ اس نے جواب دینے کے بجائے کہا کہ میں کچھ بوریت سی محسوس کر رہی تھی اس لئے سوچا کیوں نہ تمہارے ساتھ کچھ باتیں کی جائیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے ساتھ والے کیبن میں مقیم ہے ہر چیز ترتیب کے ساتھ ہو رہی تھی۔۔۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے **1900** ڈالر جیتے ہیں اور تم نے مجھے دوسو ڈالر دیئے تھے اس لئے میرا خیال ہے کہ تم اس رقم سے نصف کی حقدار ہو۔ اس نے کہا ''میں صرف دوسو ڈالر لوں گی'' اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ جوا خانے میں بیٹھ کر خاصی تھک چکی ہے اس لئے میرے ساتھ سکون کے چند لمحات گذارنا چاہتی ہے۔۔۔

ہم جنوی (اٹلی) پہنچے تو اس کا خاوند اس کے انتظار میں بندرگاہ پر موجود تھا اس نے مجھے اس سے ملوایا اور کہا کہ ہوٹل میں میرے قیام کا بندوبست کرے۔ ایک کار کے ذریعے مجھے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ ہر کام طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ ''وہ'' میری آمد کے سلسلے میں پہلے سے ہی باخبر تھے یہاں پہنچ کر میں نے ''محمد سلیم'' کے نام ٹیلی گرام بھیجا اسی روز میرے پاس ایک شخص پہنچ گیا جس کا نام عساف تھا وہ مجھے لے کر میلانو آ گیا جہاں پر میری ملاقات جاک اور ابراہام سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے میرے لئے ہلٹن میلانو میں ایک سویٹ بک کروایا ہوا تھا۔ میں نے انہیں قاہرہ میں دفتر کھولنے کے متعلق تمام معلومات سے آگاہ کیا اس کے ساتھ ساتھ ان تیرہ بحری جہازوں کے بارے میں بھی تمام تفصیلات مہیا کر دیں جو میں نے ان کے کہنے پر سویز اور اسکندریہ سے اکٹھی کی تھیں۔

ان دونوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں سویز کے شمال میں **73,72,71** کلومیٹر کے فاصلے پر تھا وہاں میں نے کیا دیکھا؟ میں نے جواب دیا کہ وہاں میں نے زرد رنگ کی ریت دیکھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا کیا مقصد ہے مصری انٹیلی جنس نے مجھے اس سلسلے میں خاص تربیت دی تھی۔ انہوں نے کہا، زرد ریت؟ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ ''وہاں کوئی متحرک چیز نہیں تھی؟'' میں نے جواب دیا نہیں۔ جس پر وہ برہم ہو گئے اور چیخ کر کہا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ہم دونوں موساد کے آفیسر ہیں اور تم نے کام کے بدلے ہم سے بڑی رقم

www.kurfku.blogspot.com

وصول کی [illegible] انہوں نے موساد کے کارڈ دکھائے جس سے ثابت ہوگیا کہ یہ دونوں موساد کے آفیسر ہیں۔

میں نے ان دونوں کو اسی سختی سے جواب دیتے ہوئے کہا "میں نے کیا تم سے وصول کیا ہے، اور کس کام کی حامی بھری ہے؟ تم مجھے دھمکی دینا چاہتے ہو؟" پھر میں نے دھیمے لہجے میں انہیں کہا کہ تم اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ تمہیں نہیں معلوم جمال عبدالناصر نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس نے میرے باپ کی ساری جائداد ضبط کرلی ہے، میرے ایک بھائی کو قتل کروادیا ہے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم موساد کے آدمی ہو تو میں تمہارے سامنے سارا مصر رکھ دیتا میں مصر کے خلاف اپنا سب کچھ بیچ دینے کے لئے تیار ہوں" یہ وہ کلمات تھے جو مجھے مصری انٹیلی جنس نے سکھائے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے مطمئن ہوگئے اور مجھے لے کر فرانس آگئے یہاں ہم نے پیرس کے نواح میں واقع ایک چھوٹے سے شہر "لیل" میں قیام کیا۔ اس مقام پر پہنچ کر مجھے خفیہ سیاہی سے لکھنے کے فن کے ساتھ ساتھ ٹرانسمیشن کا فن بھی سکھایا گیا۔ میں جلد ہی سب کچھ سیکھ گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے مصری عسکری جاسوسی کا کام لینا چاہتے ہیں میں مصر واپس جا کر اس خفیہ سیاہی سے تمام معلومات لکھا کروں اور "محمد سلیم" کے پتے پر ارسال کیا کروں اور ہر خط کے ساتھ مخصوص نمبر بھی تحریر کیا کروں۔

موساد نے باقاعدگی کے ساتھ مجھ سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا میں واپس مصر آیا اور قاہرہ میں مصری انٹیلی جنس کو تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ اب موساد مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ مصری خفیہ ادارے نے مجھے مصر کے طول و عرض میں آسانی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی تا کہ میں اپنا کام آسانی کے ساتھ انجام دے سکوں ان میں اسوان سے لے کر السلوم تک آسانی کے ساتھ آجا سکتا تھا یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ میرے علم میں تمام جگہیں آسکیں تا کہ اسرائیلی مجھ سے کچھ پوچھیں تو میرے پاس ان علاقوں کی تمام معلومات ہوں۔ میں نے موساد کی ڈیمانڈ پر معلومات ارسال کرنا شروع کردیں۔ میں مہینے میں 15 سے 20 خط موساد کو ارسال کرتا تھا جس کے جواب میں بڑی رقم ادا کی جاتی تھی یہ معلومات مصری فوج اور اس کی عسکری تیاریوں کے بارے میں ہوتی تھی۔ مگر موساد کو یہ معلومات بھیجنے سے پہلے میں،

www.facebook.com/kurf.ku

معلومات انتہائی خاموشی کے ساتھ مصری انٹیلی جنس کے علم میں [illegible] کے بارے میں معلومات اسرائیلیوں کے لئے بہت اہم تھیں۔ یہ معلومات بالکل ٹھیک ہوتی تھیں مگر انہیں موساد کو بھیجنے کے بعد یہ میزائل تنصیبات کہیں اور منتقل کردی جاتی تھیں۔ ان تنصیبات کی منتقلی کے وقت مصری فضائیہ پوری طرح چوکس رہتی تھی تا کہ کسی بھی اسرائیلی ہوائی حملے کا مناسب جواب دیا جاسکے۔

تھوڑے عرصے بعد موساد نے مجھے ہدایت کی کہ میں قاہرہ میں سپر مارکیٹ خرید لوں تا کہ اس جگہ کو میں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرسکوں۔ موساد کے ساتھ میں کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا یہاں تک کہ 1973ء میں ہم نے خاصی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس دوران جن مشہور اسرائیلی شخصیات کے ساتھ میں نے کام کیا ان میں سابق وزیر اعظم اور موجودہ وزیر خارجہ شمعون پیریز، سابق وزیر خارجہ لیوی ایشکول، وزیر دفاع بنیامین الیعازر، ایزرا وائز مین، سابق وزیر خارجہ شلومو بن عامی، سابق وزیر دفاع موشے دایان اور سابق وزیر اعظم گولڈا مئیر شامل ہیں۔ گولڈا میئر اس وقت اسرائیلی وزیر اعظم تھیں باقی تمام لوگ اپنے وقت میں موساد کے بڑے عہدیدار تھے۔

جنگ رمضان جو اکتوبر 1973ء میں شروع ہوئی اس سے تیس روز پہلے الریس زکریا میرے پاس آئے ان کے ساتھ مصری خفیہ ادارے کے ایک اور آفیسر الحاج احمد بھی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں موساد کو ایک خط ارسال کروں جس پر نمبر 28 رقم ہو، میں نے کہا کہ موساد نے مجھے کہا ہے کہ پہلے خط پر 2 نمبر لکھا کروں۔ زکریا نے کہا مجھے معلوم ہے مگر تم 28 لکھو۔ تھوڑے دن بعد انہوں نے مجھے کہا کہ اب میں ایک اور خط موساد کو ارسال کروں اور اس پر نمبر 54 لکھوں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اس سے پہلے موساد کو 27 خط لکھ چکا ہوں میں نے پھر ان دونوں سے پوچھا کہ کیوں؟ زکریا نے کہا جیسا تم سے کہا جارہا ہے بغیر کسی سوال کے ایسا ہی کرو۔

اس کے بعد الریس زکریا جو اس وقت بھی بہت بڑے منصب پر ہیں نے مجھے کہا کہ "اسرائیل کے پاس مواصلات کا ایک ایسا جدید آلہ ہے جو کسی اور ملک کے پاس نہیں ہے میری خواہش ہے کہ تم اللہ کا نام لے کر کوشش کرو تا کہ یہ آلہ ہمیں مل سکے۔ اس مشن کے لئے مصری

انٹیلی جنس نے میری تربیت شروع کردی۔ الریس زکریا نے مجھے کہا کہ جب موساد کے اہلکار سے ملاقات ہوتو اسے بتاؤ کہ تم انہیں 27 خط ارسال کر چکے ہو۔ ان ہدایات کے بعد میں موساد کے اہلکار سے ملاقات کے لئے اٹلی روانہ ہوگیا۔ موساد کے اہلکار نے میری بات سن کر کہا کہ ان تک میرے صرف دو خط پہنچے ہیں۔ میں نے حیرت سے اسے کہا کہ نہیں میں نے 27 خط ارسال کئے ہیں تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ دو خط ہیں کیا تم مجھے میری رقم نہیں دینا چاہتے؟ موساد میرے ہر خط کی قیمت الگ سے ادا کرتی تھی میری بات سن کر موساد کے اہلکار نے کہا یہ معاملہ سمجھ سے باہر ہے تمہیں ''بڑے گھر'' جانا ہوگا بڑے گھر سے مراد اسرائیل تھا۔ میں یہاں سے اسرائیل روانہ ہوگیا جہاں میری ملاقات شمعون پیریز اور وائٹ مین سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''تمہیں یقین ہے کہ تم نے ہمیں دو خطوط سے زائد خط ارسال کئے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں میں نے 27 خط ارسال کئے ہیں لیکن میرا اس میں کیا قصور ہے ڈاکیا میرا بھائی تو نہیں ہے۔ میں نے ہر چیز دیکھ بھال کر ارسال کی ہے اگر آپ لوگ میرا معاوضہ نہیں دینا چاہتے تو میں بھی آئندہ آپ لوگوں کے لئے کام نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے چہرے پر غم کے ایسے آثار پیدا کر رکھے تھے کہ انہیں میری بات کا یقین آ گیا شمعون پیریز نے مجھے میرا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا اس کے بعد موساد میں فیصلہ کیا گیا کہ مجھے دنیا کا جدید ترین مواصلاتی آلہ دیا جائے تا کہ میں اس کے ذریعے معلومات ارسال کرسکوں۔ اس سلسلے میں مجھے اسرائیل میں تربیت بھی دی گئی اور شمعون پیریز اور وائٹ مین کی ہدایت پر یہ آلہ میرے حوالے کردیا گیا یہ بہت ہی نفیس آلہ تھا اس کے ذریعے صرف آٹھ سیکنڈ میں قاہرہ سے تل ابیب پیغام بھیجا جاسکتا تھا۔

شمعون پیریز اور وائٹ مین کی ہدایت پر یہ آلہ ایک ٹوسٹر میں رکھ دیا گیا تا کہ قاہرہ ائرپورٹ پر کسٹم حکام کو اس کی خبر نہ ہوسکے۔ میں کامیابی کے ساتھ اس آلے کو تل ابیب سے قاہرہ لے آیا یہ مصری انٹیلی جنس کی موساد کے خلاف ایک بڑی کامیابی تھی جس نے 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کا پلہ عربوں کے حق میں پلٹ دیا تھا دنیا میں اس وقت تک اس آلے کے صرف چار نمونے تھے۔ اس آلے کے ذریعے ہم اسرائیلیوں کو مصری تنصیبات کے بارے میں غلط معلومات ارسلل کرتے تھے جب اسرائیلی طیارے حملے کے لئے آتے تو مصری فضائیہ کے طیارہ شکن یونٹیں انہیں آسانی کے ساتھ تباہ کردیتے۔

عرب اسرائیل جنگ شروع ہونے کے صرف چار دن بعد ہی مجھے اس آلے کے ذریعے تل ابیب سے پیغام موصول ہوا ''فوراً بڑے گھر حاضر ہو'' میں نے مصری انٹیلی جنس کے اہلکاروں کو بتایا کہ اسرائیلی مجھے تل ابیب بلا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا کیونکہ الحمدللہ ہم نے نہر سویز پار کرلی ہے ہم فاتح ہیں اس کے علاوہ دنیا کا جدید ترین آلہ ہمارے قبضے میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ جوجو کے ذریعے جو موساد کی ایک بڑی آفیسر تھی ہم اسرائیل کی عسکری معلومات حاصل کر چکے ہیں (میں نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے 1973ء کی جنگ سے پہلے ہی جوجو کو مصری انٹیلی جنس کے لئے کام کرنے کے لئے تیار کرلیا تھا اس نے واقعی مجھے اسرائیل کے بارے میں انتہائی خطرناک معلومات مہیا کی تھیں جن سے ہم نے جنگ میں خاصا استفادہ کیا تھا) جنگ سے پہلے ہی میں جوجو کو مصر لے آیا تھا جہاں اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مصری سے شادی کرلی تھی اب وہ مصر کی ایک معزز شہری ہے اور الحمدللہ یہیں قیام پذیر ہے۔ موضوع کی طرف دوبارہ آتے ہیں۔ میں نے مصری انٹیلی جنس کے اہلکار سے کہا کہ میں اسرائیل نہیں جاؤں گا کیونکہ میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں۔ یہ کافی ہے اس سے زیادہ میں کیا کرسکتا ہوں میں نے سب کچھ تم لوگوں کو لاکر دے دیا ہے اب کیا گولڈا میئر لاکر دوں۔۔۔ میرا اسرائیل جانا اب خطرے سے خالی نہیں تھا میں گیارہ سال تک اللہ کے بھروسے پر دشمن ملک میں کام کرتا رہا تھا اسرائیلیوں کو مجھ پر شک بھی ہوسکتا تھا۔ مصری انٹیلی جنس کے اہلکار سے بات یہاں ختم ہوگئی مگر فوراً ہی صدر سادات کی جانب سے پیغام آیا کہ میں ان سے ملاقات کروں۔

میں صدر سادات کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ مجھ سے مخاطب تھے ''اگر مصر تم سے کہے کہ اپنا سر ہاتھی کے پیر کے نیچے رکھ دو تو تمہیں چاہئے کہ ایسا کرو پھر تم کیسے اسرائیل جانے کی بات مسترد کر سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''مصر سب سے پہلے ہے، میں اسرائیل جاؤں گا، مگر کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ اسرائیلی میرے ٹکڑے اڑا دیں گے پھر میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا؟'' صدر سادات نے کہا ''وہ ہماری نظر میں ہیں اور ہماری ذمہداری ہیں''۔

جنگ کے بعد میں براہ راست قاہرہ سے تل ابیب پہنچا تو بن گوریان ائرپورٹ پر میرا

حسب سابق استقبال کیا گیا۔ پہلے جاک، ابراہام اور ریمون میرے استقبال کے لئے آتے تھے مگر اس مرتبہ [illegible] بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ چھٹیوں پر ہیں [illegible] حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ موساد میں بھی بڑی تبدیلی کی گئی تھی مگر شمعون پیریز اور وائٹ مین حسب سابق اپنے اپنے منصبوں پر موجود تھے۔ ان سے ملاقات حیران کن حد تک کامیاب رہی انہوں نے ایک اور جدید آلہ میرے حوالے کیا جس کے ذریعے صرف سات سیکنڈ میں قاہرہ سے پیغام تل ابیب پہنچ جاتا تھا مجھے اس کے استعمال کی تربیت دی گئی یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع تھا اور میرے لئے ایک اور بڑی کامیابی بھی تھی۔

اپنے دور جاسوسی اور اس کے تقاضوں کے بارے میں احمد محمد عبدالرحمٰن نے کہا ''وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جاسوسی کے شعبے میں تیزی کے ساتھ جدت آرہی تھی ان تمام خطرات میں میرے جیسے لوگ اپنے وطن کی خاطر ہتھیلی پر سر رکھ کر پھر رہے تھے۔ اپنے اس پرخطر کرئیر میں صرف ایک مرتبہ میں نے غلطی کی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا پردہ رکھ لیا۔ ہوا اس طرح کہ میں فرانس کے شہر لیل میں تھا یہ 1968ء کی بات ہے جب میں مصری انٹیلی جنس کے ایک آفیسر کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا مصری خفیہ ادارہ مجھے ہدایت کر رہا تھا کہ میں کوئی بات تحریر میں نہ لایا کروں مگر میں اصرار کر رہا تھا کہ میں کبھی کبھی بھول جاتا ہوں اس لئے لکھ لیتا ہوں اس کے بعد میں نے ضروری باتیں نوٹ کر لیں ابھی ہوٹل سے باہر ہی گیا تھا کہ موساد کے اہلکار میرے سامنے تھے جبکہ اس وقت مصری خفیہ ادارے کی چند ہدایات میری جیب میں لکھی ہوئی موجود تھیں مجھے فوراً خطرے کا احساس ہوا میں نے اپنے کمرے میں جا کر اس کاغذ کو جلا دیا اس کے بعد بھی میں نے لکھنے کی کوشش نہیں کی یہ میری واحد غلطی تھی جو میں نے اپنے پرخطر زندگی کے دوران کی تھی۔ 1978ء میں اس کام سے ریٹائر ہو گیا اسی سال کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا مجھے انور سادات کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جس میں میرے کام کی تعریف کے ساتھ اسرائیل کے ساتھ امن کی بات چیت کا ضمنی ذکر کیا گیا تھا ایک عام مصری کی طرح میں بھی اس معاہدے کے خلاف تھا اور [illegible] کی دلیل یہ ہے کہ آج بھی حالات جوں کے توں ہیں مقبوضہ فلسطین میں مسلمانوں کو [illegible]

[illegible] ہیں اور وہ ان کے بچے پیدا کرتی ہیں۔

موساد میں یہودی لڑکیوں کا کردار ہمیشہ سے تجسس اور دلچسپی کا باعث رہا ہے میں آج بھی بے شمار ایسی یہودی حسیناؤں کو جانتا ہوں جو موساد کا خطرناک ترین ہتھیار ہیں۔ مجھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ موساد کی جانب سے مصر میں میری نگرانی نہیں کی گئی؟ تو میں کہوں گا کہ کبھی ایک جاسوس کو دوسرے کے پیچھے نہیں لگایا جاتا اور نہ کسی کو دوسرے کے بارے میں کچھ بتایا جاتا ہے مثلاً اگر مصر میں اسرائیل کے دس جاسوس کام کر رہے ہوں تو انہیں ایک دوسرے کے بارے میں آگاہی نہیں دی جاتی یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اگر ایک پکڑا جائے تو وہ دوسروں کے بارے میں دشمن ملک کو معلومات نہ مہیا کر سکے۔ موساد کے بارے میں میری رائے ہے کہ یہ ایک خطرناک اور طاقتور انٹیلی جنس ایجنسی ہے مگر اس میں بھی کئی قسم کے جھول ہیں۔ زیادہ تر دیومالائی قصے بیان کئے جاتے ہیں جبکہ حقیقت اس سے برعکس بھی ہوتی ہے میں نے موساد کے اہلکاروں کو دیکھا ہے جو عقل سے زیادہ نقل سے کام لیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے شمعون پیریز کو صاف صاف کہا کہ فلاں موساد کا اہلکار جو مجھے پیرس میں ملا تھا اسے کسی قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور نہ وہ عقل سے کام لیتا ہے جس پر شمعون پیریز خاصا شرمندہ ہوا تھا۔ میں اپنی ذمہ داریوں کے دور میں 38 مرتبہ تل ابیب گیا ہوں میں نے یہاں یورپ سے زیادہ سکون سے کام کیا۔ میں اکثر یہاں بھی ام کلثوم کے گانے سنتا رہتا تھا۔

آپ یہ دیکھیں کہ موساد کو امریکہ اور یورپ سب کی اعانت حاصل ہے ان ترقی یافتہ ممالک کی جدید ٹیکنالوجی سے صرف یہ ایجنسی ہی استفادہ کر سکتی ہے مگر دوسری جانب مصر کا خفیہ ادارہ ہے جس کی مغرب کیا مدد کر سکتا ہے مگر پھر بھی اس ادارے نے ناکافی سہولتوں کے باوجود وطن کی خدمت کی اور کئی محاذوں پر موساد کو کامیابی کے ساتھ شکست دی ہے۔ ہم نے موساد کے ہی جدید آلات کو اس کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس تناظر میں یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ مصری خفیہ ادارہ طاقتور ترین ادارہ ہے۔ الیس زکریا جو مصری خفیہ ادارے کے اہلکار تھے [illegible] ہیں۔ اس ساری تمہید کے بعد میں یہ کہوں گا کہ دنیا نے آج تک مغربی خفیہ اداروں کے کارنامے صرف فلمی

www.facebook.com/kurfku/blogspot.com
کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش KURF

اسکرینوں پر دیکھے ہیں جن میں پانچ فیصد بھی حقیقت نہیں ہوتی اس لئے دنیا یہ سمجھتی ہے کہ یہ ناقابل شکست ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے مسلمان ممالک کے خفیہ اداروں کے اہلکار جب وطن کے لئے جان کی بازی لگاتے ہیں تو اس کی مثال سی آئی اے اور موساد دینے سے قاصر ہوتی ہے مگر چونکہ میڈیا مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں ہے اس لئے یہ باتیں عام لوگوں تک رسائی سے محروم رہتی ہیں۔"

سقوط سوویت یونین میں کے جی بی کا کردار

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں ہونے والے آج تک بڑے بڑے فتنوں کے پیچھے ہمیشہ یہودیت ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ فری میسن اور میسونی تحریک کے نام سے یہودیت نے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے صیہونی مفادات کا تحفظ کیا ہے جہاں چاہا اپنے مفادات کی خاطر جنگ وجدل کرادی اور جہاں چاہا اپنے مطلب کی حکومت قائم کرالی۔ اسی طرح اس صدی کے بڑے واقعات میں ایک واقعہ سوویت یونین کے خاتمے کا ہے۔ میسونیت یہودیوں کے دعویٰ کے مطابق دنیا کی قدیم ترین تحریک ہے جس کا اولین اجتماع یہودیوں کے دعوے کے مطابق صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں ان کے خیمے میں ہوا یعنی یہودیوں نے انبیاء بنی اسرائیل کو اس تحریک کے بانیان ٹھہرایا ہے۔ راقم کو دسمبر 1997ء میں ایک تحقیقی مقالے کے سلسلے میں لائڈن یونیورسٹی جانا تھا۔ یورپ کے اس دورے کے دوران اینڈھون اسلامی مرکز بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں اسلامی مرکز کے ڈائریکٹر جلال عثمان کحیل کا ایک انٹرویو بھی کیا تھا' یہ انٹرویو جنوری 1999ء کے ندائے ملت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس دورہ کے دوران راقم کی اپنے استاد اور عالم عرب کے مشہور اسکالر ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالے عموماً عالم عرب کے بین الاقوامی اخبارات اور جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری یہودیت اور اس میں پائے جانے والے فرقوں اور

تحریکوں سے متعلق علوم کے ماہر تصور کئے جاتے ہیں۔ آپ بھی لائڈن یونیورسٹی ایک تحقیقی کام کی غرض سے آئے تھے جہاں آپ کام ختم کرنے کے بعد امریکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے وہاں سے آپ نے مصر واپس لوٹ جانا تھا۔ میرے موضوع کو ڈاکٹر صاحب نے بہت دلچسپی سے سنا اور اس سلسلے میں کچھ ہدایات بھی دیں۔

ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری کے ساتھ ایک لمبی نشست میں بیشمار موضوعات زیر بحث آئے جن میں سے ایک موضوع ''میسونی تحریک اور سوویت یونین کی تحلیل میں اس کا کردار'' کے حوالے سے بھی تھا اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے راقم کو کچھ پوائنٹ بھی نوٹ کرائے جو زیادہ تر سابق سوویت یونین کے اخبار ''پراودہ'' کے کالم نگار اور روسی ادیب ''فاتین بروسکوف'' سے اخذ کردہ تھے۔ بروسکوف نے سوویت سرزمین پر میسونیوں (یہودی تحریک) کے اثرات کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا۔ جس میں بتایا گیا کہ کس طرح یہودیوں نے اس خفیہ تحریک کے ذریعے سوویت سرزمین کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے اور جب ان کے مفادات کی وابستگی ختم ہوگئی تو کس طرح انہوں نے سوویت یونین کا شیرازہ بکھیر دیا۔

سوویت ادیب بروسکوف کے مطابق ایک لمبے عرصے سے یہ بات سننے میں آتی رہی کہ سوویت یونین اور کمیونزم کی بیخ کنی میں میسونی تحریک کا ہاتھ ہے' مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کے جی بی ان سازشوں سے آگاہ نہیں تھی؟ یورپ اور امریکہ کے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مفادات کو خطرے میں ڈال دینے والی سوویت خفیہ ایجنسی کس طرح سوویت یونین کی تباہی سے قبل از وقت آگاہ نہ ہوسکی؟ یہ ایک اہم سوال ہے .... جس کا جواب دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔ لوبیانکا میں کے جی بی کے مرکز میں مسلسل خاموشی طاری ہے۔ جنرل فلیپ بوبکوف نے اپنی یادداشتوں میں کے جی بی سے متعلق ذکر کیا ہے مگر یہ بھی زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ ان سوالات کا جواب ہے جو کے جی بی اور سوویت یونین کی تباہی سے متعلق ذہنوں میں اٹھتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سوویت یونین کے بکھرنے سے پہلے کے جی بی میں [illegible] اور میسونی تحریک سے نمٹنے کے لئے ایک سیل قائم کیا گیا مگر جیسے ہی سوویت یونین کو بکھیرنے کے لئے پولٹ بیورو میں کام شروع ہوا کے جی بی میں یہ سیل بند کر دیا گیا اور سیل سے وابستہ [illegible]

افراد کو فوراً فارغ کر دیا گیا کچھ لوگ جن کا تعلق اس سیل سے تھا مشکوک سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے تھے ان میں سے بعض لوگوں کے یورپ میں میسونی کرتا دھرتاؤں کے ساتھ مبہم تعلقات رہے تھے۔ اس کا ذکر برطانیہ سے تعلق رکھنے والے جیمز ڈیب اور سٹیفن نائٹ نے خفیہ تحریکوں سے متعلق اپنی تصنیفات میں بھی کیا ہے۔ ان کے مطابق **1990-91**ء میں منائی بریٹ نامی تنظیم نے ماسکو میں اپنا دفتر کھولا تھا۔ اس سلسلے میں اخبارات نے میسونی تحریک کی روس میں خفیہ سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی تھیں' ان اخبارات کے مطابق ان تحریکوں کو مشرقی فرانس سے تعلق رکھنے والی بعض سرکردہ ''شخصیات'' کنٹرول کرتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری کے مطابق روسی ادیب بروسکوف بار بار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ان سب سرگرمیوں کے ہوتے ہوئے کے جی بی کہاں تھی؟ روس میں جہاں لوگ سوویت یونین کے خلاف سوچتے ہوئے بھی گھبراتے تھے کہ کہیں اس خفیہ ایجنسی کو خبر نہ ہو جائے' اتنا جاندار ماضی رکھنے والی ایجنسی کس طرح ان سرگرمیوں سے غافل رہی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتظامی طور پر اس مضبوط ایجنسی کو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر انتظامی امور کا سربراہ اپنے اپنے طور پر معاملات کو ڈیل کر رہا تھا جس نے اس تنظیم کی وحدت کو بری طرح متاثر کیا' یہی وجہ ہے کہ کے جی بی کے تمام ''بڑوں'' کا ملک کی سالمیت اور مفاد کے ضمن میں کردار مشکوک ہو جاتا ہے۔

جب قومی سلامتی سے متعلق کوئی تنظیم مرکزیت سے ہٹ جاتی ہے تو اس کے دوسرے مؤثر حصوں میں بھی خرابی سرطان کی طرح سرایت کر جاتی ہے' یہی کچھ کے جی بی کے ساتھ ہوا جو سوویت یونین کے ٹوٹنے کا اصل سبب بنا کیونکہ اس کی صفوں میں میسونی تحریک (یہودی) کے لوگ شامل ہو چکے تھے۔

امریکہ کے مشہور جریدے اٹلانٹک ریویو نے سابق سوویت صدر یوری آندروپوف کے انتقال کے ایک ہفتے بعد دنیا کو یہ خبر سنائی کہ آندروپوف پرانے میسونی تھے' اس طرح گورباچوف جو یورپ کے نزدیک ہردلعزیز شخصیت تھے کا تعلق بھی میسونیوں کے ساتھ تھا' یہ دونوں اشخاص اپنے اپنے دور میں کے جی بی کے سربراہ بھی رہے ہیں۔

میسونی تحریک نے سوویت ریاست وجود میں آنے سے بہت پہلے ہی علاقے میں اپنا خطرناک کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ شہنشاہ پاؤل اول کا قتل بھی میسونیوں کے ہاتھوں ہوا'

ں کے بعد 1825ء میں روسی حکومت کے خلاف بدامنی پھیلانے میں اس خفیہ تحریک کا ہاتھ تھا اسپوٹین روسی تاریخ کا دیومالائی کردار اسی تحریک کے ہاتھوں شکار ہوا۔ فروری اور اکتوبر 1917ء کے انقلاب کے روح رواں الیکزینڈر کیرنسکی اور اس کے ساتھی اس وقت مشرقی رانس میں تحریک کے ہیڈکوارٹر سے ہدایات لیتے تھے۔ بالشویک انقلاب کی طنابیں بھی یسونیوں نے اپنے ہاتھ میں رکھیں اس انقلاب کے روح رواں اور سرخ فوج کے بانی لیون روٹسکی 1916ء میں نیویارک میں قیام کے دوران میسونیوں سے روابط استوار کر چکے تھے۔ یون ٹروٹسکی کا نام روسی میسونیوں کی فہرست میں صفحہ اول پر آتا ہے۔ اس کا انکشاف ناکافی ثبوت کے ساتھ کئی روسی اخبار کر چکے ہیں۔ بالشویک انقلاب کی کامیابی کے بعد میسونیوں کی سرگرمیاں قانونی قرار پائیں مگر یہ اتنے پردوں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں کہ صرف کسی محقق کی تحقیق میں ہی ان کا مبہم سا ذکر ملتا تھا۔ سابق سوویت یونین میں بڑی تعداد یہودیوں کی بھی آباد تھی اس لئے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد ان کی بڑی تعداد کو اسرائیل منتقل کرنا مقصود تھا تاکہ مقبوضہ عرب علاقوں میں زیادہ سے زیادہ یہودی بستیاں بسائی جاسکیں' باوجود اس کے کہ یہ کام عالمی سطح پر سراسر غیر قانونی تھا صرف یہودی مفادات کے لئے عمل میں لایا گیا۔ اس بات کے قوی شواہد موجود ہیں کہ سوویت یونین سلامتی کے ادارے میں کبھی بھی میسونی تحریک کے سدباب کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا حالانکہ سوویت عہد میں یہ اتنا مشکل نہیں تھا بلکہ آخری سالوں میں اس سے مکمل طور پر صرفِ نظر کرلیا گیا۔ بلغاریہ کی خفیہ ایجنسی کے سابق رکن میخائل گلوشیف کے مطابق جو بعد میں برطانیہ فرار ہو گیا تھا 1936ء میں سٹالن کی جانب سے ایسے اقدامات کئے گئے تھے کہ کمیونسٹ پارٹی کو میسونیوں سے پاک کیا جائے' سٹالن کے ان شخصی اقدامات کی تصدیق ہنگری کے مؤرخ فاسیلی ایفانوف نے بھی کی ہے۔ اس کے مطابق 1938ء تک میسونی نام کی بظاہر کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی.... مگر مغرب کی جانب سے اقتصادی مفادات وابستہ ہونے کی بنا پر اسے اپنا ہاتھ ''ہلکا'' رکھنا پڑا۔ برطانوی مؤرخ سٹیفن نائٹ کے مطابق 1945ء میں روسی میسونیوں کی وجہ سے برطانوی خفیہ ایجنٹوں کی کارروائیوں سے بے خبر رہے حالانکہ برطانوی خفیہ ایجنسی نے ماسکو میں اپنا دفتر بنا رکھا تھا.....!

سابق سوویت یونین کا مشہور خفیہ ایجنٹ جو تیس سال تک کے جی بی سے وابستہ رہا

جنیوا میں صحافی کی حیثیت سے قومی سلامتی کے ادارے میں خدمات انجام دیتا تھا' لکھتا ہے کہ ''میسونیوں نے کے جی بی سے بھرپور استفادہ کیا' اس ایجنسی کے متعدد اہلکار میسونیوں کی خفیہ کمین گاہوں سے ہدایات لیتے تھے''۔ اسی طرح کی ایک دھماکہ خیز خبر 1981ء میں اٹلی کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی جسے بعد میں روسی اخبارات نے بڑے اہتمام سے نشر کیا تھا' یہ خبر دوسری عالمی جنگ کے دوران فاشسٹ پارٹی سے متعلق تھی کہ اس کے قیام میں بھی میسونیوں کا ہاتھ رہا ہے اور فاشسٹ پارٹی کی جانب سے ہونے والی غارت گری کے پیچھے میسونی عناصر کارفرما تھے۔

1990ء میں سابق برطانوی جاسوس جارج بلیک جو آج کل ماسکو میں مقیم ہے کی دداشتیں شائع ہوئیں جارج بلیک بھی ادارہ قومی سلامتی سے وابستہ تھا جہاں اس نے میسونیوں کی بڑی خدمات انجام دیں' جارج بلیک مصر کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا جہاں اس نے پنے نام کے ساتھ ''بلیک'' کا اضافہ کر کے اپنی قومیت کو چھپا لیا تھا اس طرح وہ برطانیہ کے خفیہ دارے تک رسائی حاصل کر سکا تھا۔ اپنی یادداشتوں میں اس نے برطانوی قید سے فرار کی استان بھی رقم کی ہے کیونکہ حقیقتِ حال کھل جانے پر برطانیہ کے خفیہ ادارے نے اسے اپنی راست میں لے لیا تھا جہاں سے وہ کونٹ مونٹی کرسٹو کی مدد سے فرار ہو سکا' یہ اس وجہ سے ممکن سکا کہ میسونی تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کے جی بی کے خارجی شعبے کے سابق سربراہ لی پریماکوف نے اخبار ''کوسومولسکایابرافدا'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''جارج بلیک ج بھی اپنے دائرہ کار میں مصروف عمل ہے''۔ 1992ء میں نیویارک سے شائع ہونے والی الڑفینکن کی تصنیف ''سازشیں اور جرائم'' میں بتایا گیا ہے کہ 11 فروری 1988ء کو واشنگٹن وائٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں میسونیوں کا اجتماع منعقد ہوا جس میں انہوں نے اپنے لی اور سابق صدر ریگن کو ان کی خارجہ پالیسی میں کامیابیوں کی مبارکباد دی تھی' لیکن اس اع میں شریک ہونے والے افراد کے نام آج تک منظر عام پر نہ آسکے مگر اس قدر معلومات ل ہوسکیں کہ اس میں دفاع' خارجہ اور خفیہ ایجنسی کے بڑے بڑے نام شامل ہیں''۔

مندرجہ بالا تمام عوامل اس نقطہ ارتکاز پر مرکوز ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں موجودہ یہ غیر مرئی ت جس کی لگامیں یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں' کس طرح دنیا کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے

ہے۔سوویت یونین کے زوال کا سبب صرف افغانستان کی جنگ یا اقتصادی بدحالی میں ہی تلاش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اصل میں اس کے پیچھے دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے' اس لئے اس بات پہ تعجب کرنا کہ کے جی بی میں کیسے نقب لگائی گئی زیادہ حیرت انگیز نہیں رہتا خاص طور پر جب یہ بات سامنے آ جائے کہ اس تنظیم کے اجلاس وائٹ ہاؤس میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری کے مطابق امریکہ' یورپ اور تیسری دنیا کے بڑے بڑے دماغ جن میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور اعلیٰ حکومتی اہلکار شامل ہوتے ہیں اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ اس لئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ سوویت یونین کی پولٹ بیورو اور لوبیانکا میں کے جی بی کے مراکز تک اس غیر مرئی خفیہ طاقت کو رسائی حاصل نہ ہو سکی ہو۔

کے۔جی۔بی۔اور جنرل سودوبلاتوف

اپریل 1994ء میں واشنگٹن کے ایک پبلشنگ ادارے لٹل اینڈ کومپانی نے سابق روسی جنرل پافل اناتولیفیتش سودوبلاتوف کی یادداشتیں شائع کی ہیں یہ کتاب جہاں بہت سے انکشافات سے بھری پڑی ہے وہاں اس میں کچھ غیر دلچسپ واقعات بھی ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں مولف لکھتا ہے کہ:

"میرا نام پافل اناتولیفیتش سودوبلاتوف ہے میرے خیال میں یہ نام آپ لوگوں کے نزدیک زیادہ معروف نہیں ہے کیونکہ اس نام کو سوویت یونین کے زمانے میں 58 سال تک انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا۔ میں ہی ٹروٹسکی کے قتل کا ذمہ دار ہوں، دوسری جنگ عظیم کے دوران سوویت یونین کی جانب سے جو گوریلا کارروائیاں ہوتی تھیں ان کی منصوبہ بندی بھی میرے ہی ذمہ تھی اس کے علاوہ جرمنی اور اس کے زیر قبضہ علاقوں میں جنگ کے بعد سوویت یونین کی جانب سے میں ہی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ میں نے ہی امریکہ اور برطانیہ کے ایٹمی رازوں کی سب سے پہلے جاسوسی کرائی جس کے لئے میں نے دنیا کے ایک بڑے حصے میں جاسوسی کا منظم نیٹ ورک قائم کیا جس کے ذریعے ہم نے امریکہ اور برطانیہ کے ایٹمی سائنسدانوں سے خفیہ روابط استوار کئے ان سائنسدانوں میں البرٹ آئن سٹائن، رابرٹ اوپن ہامر، وان ریکو فرمی، لیو سیلارڈ ، برونو پونٹیکورفو، کلاوس فوکس، نیلز بوہر اور اس کے علاوہ دوسرے بہت سے

سائنسدان شامل ہیں جو ہمارے لئے کام کرتے تھے۔"

اس کتاب کو تالیف کرنے میں جن افراد نے جنرل اناتولیفیتش سودوبلاتوف کی مدد کی ان میں ان کا اپنا بیٹا اناتولی بھی شامل تھا جو بعد میں ماسکو یونیورسٹی میں پروفیسر بنا۔ اس کے علاوہ امریکی جریدے ٹائم کے ماسکو میں تعینات سابق نامہ نگار جیرالڈ شکیٹر اور اس کی بیوی لیونا سکیٹر شامل ہیں۔ کتاب **544** صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دس اضافی صفحات خفیہ دستاویزات اور تصاویر پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ بیس گھنٹے پر مشتمل انٹرویو کی ویڈیو کیسٹ بھی ہیں جن میں جنرل سودوبلاتوف کا انٹرویو بھی ہے جو سٹین فورڈ یونیورسٹی کے جو فیر انسٹی ٹیوٹ آف وار اینڈ پیس اینڈ ریولیشن کے تحت حاصل کیا گیا۔

1996ء کے آخر میں ماسکو کے اشاعتی ادارے "جیا" نے جنرل سودوبلاتوف کی روسی زبان میں یادداشتیں شائع کیں جن کا عنوان "کریملن اور جاسوسی۔ ایک گواہ کی یادداشتیں" ہے۔ یہ کتاب **491** صفحات پر مشتمل ہے جبکہ سترہ صفحات خفیہ دستاویزات، تصاویر اور خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب **13** ابواب پر مشتمل ہے جن میں **1930**ء سے لیکر **1950**ء کے درمیان کے ان خفیہ واقعات اور حالات کا ذکر کیا گیا ہے جو جنرل پاول سودوبلاتوف کی سرکردگی میں سوویت یونین کے لئے کئے گئے۔

جنرل سودوبلاتوف نے لکھا ہے کہ "میں **1907**ء میں اوکرانیا کے شہر میلیتوبول میں پیدا ہوا میرے والد کا انتقال ٹی بی کے مرض میں **1917**ء میں ہوا۔ **1919**ء میں ہمارے علاقے کی سڑکوں پر عموماً اس قسم کی بحث ہوتی تھی کہ سرخ فوج اس علاقے کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ میں نے انقلاب کا زمانہ بھی دیکھا جو کم از کم میرے لئے نفع بخش تھا سرخ فوج کو مجھ سے نفع حاصل کرنا تھا میں نے جنگ کا زمانہ بھی دیکھا اس وقت میری عمر **12** سال تھی"

جنرل سودوبلاتوف بچپن میں ہی گھر سے فرار ہو کر میلیتوبول شہر سے جاتی ہوئی فوج میں شامل ہو گیا تھا جسے "وائٹ گارڈ" کے دباؤ پر شہر خالی کرنے کے لئے کہا گیا تھا انہیں بھی ایسے نوجوان کی تلاش تھی جو کچھ لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ فوج میں سودوبلاتوف کو کمیونیکیشن (رابطہ) کے محکمے میں ذمہ داری سونپی گئی یہیں سے اس نے جاسوسی کے ادارے کی طرف توجہ دی۔ **1931**ء میں اسے "دتشی کا" کے علاقے میں ان جرمن اور یونانی نژاد باشندوں سے

روابط قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو میلیتوبول میں آباد ہو گئے تھے اور روسی ایجنسی کے لئے کام کرتے تھے۔

چھ سال بعد اسے اوکرانیا کے شہر خارکوف میں حکمران پارٹی کے خفیہ سیل کا انچارج بنا دیا گیا یہیں پر اس کی ملاقات ایما کو جانوفا نامی لڑکی سے ہوئی جو پارٹی میں اہم عہدے پر فائز تھی اس سے اس نے بعد میں شادی کر لی۔ **1933**ء میں سودوبلاتوف کو ماسکو میں پارٹی کے خارجی سیل کی ذمہ داریاں سونپ دی گیں جس کے بعد اس کا شمار خفیہ ایجنسی کے صف اول کے افسروں میں ہونے لگا اس کے فوراً بعد اس کی کارروائیوں کا دائرہ ملک سے باہر تک پھیل گیا۔

1938ء میں سٹالن کے خصوصی حکم پر اسے اوکرانیا کے قوم پرست لیڈر یفجینی کونفالیتس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاص مہم سونپی گئی۔ کونفالیتس ان دنوں ہالینڈ کے شہر روٹرڈیم میں مقیم تھا اپریل **1938**ء میں سودوبلاتوف ہالینڈ پہنچا **23** مئی **1938**ء کو اس نے شخصی طور پر کونفالیتس کو تحفے کے طور پر مٹھائی کا ڈبہ دیا جس میں دھماکہ خیز مواد چھپا ہوا تھا اسی دھماکے میں کونفالیتس کی موت واقع ہوئی یہ کارروائی اس زمانے کی روسی خفیہ ایجنسی کے خطرناک سیل (تشکیلیت) کے تحت عمل میں لائی گئی تھی جس کا اس زمانے میں سودوبلاتوف انچارج تھا اس کے بعد **1939**ء میں سٹالن نے سودوبلاتوف کو حکم دیا کہ اس کے دشمن اللہ ودلیف ٹرسکی کے قتل کا منصوبہ ترتیب دیا جائے ٹرسکی ان دنوں سٹالن کے خوف سے فرار ہو کر میکسیکو میں مقیم تھا یہ منصوبہ باقاعدہ سٹالن کی موجودگی میں بنایا گیا تھا اس ملاقات کے بعد سودوبلاتوف کو روس کی خفیہ ایجنسی کے نمبر ایک افسر کے منصب پر فائز کر دیا گیا اس منصب پر وہ **1942**ء تک فائز رہا۔

20 اگست **1940**ء کو ٹرسکی روسی خفیہ ایجنسی کے اہلکار "رامن میرکادیر" کے ہاتھوں قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہو گیا اور اسی دن ہسپتال میں اس کی موت واقع ہوئی۔ ٹرسکی کے قتل کے بارے میں سودوبلاتوف اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "کہ ہمیں اس کی موت کی خبر سرکاری نیوز ایجنسی طاس کے ذریعے ہوئی نہ کہ اپنے کسی ایجنٹ کے ذریعے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حملے کے فوراً بعد ہمارے دو ایجنٹ موقع سے فرار ہو گئے میر کادیر نے کارروائی کے فوراً بعد کار کے ذریعے کیوبا فرار ہو جانا تھا جو ٹرسکی کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک سڑک کے کنارے

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش
KURF

تھی۔" 1941ء میں سودوبلاتوف نے یورپ اور شمالی امریکہ میں سیاستدانوں کے قتل کے منصوبے کی سربراہی بھی کی اس کے لئے روسی خفیہ ایجنسی میں ایک خاص شعبہ تشکیل دیا گیا تھا جس کے تحت یورپ اور امریکہ میں جاسوسوں کا نیا نیٹ ورک قائم کیا گیا تھا۔

جنرل سودوبلاتوف اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ "1944ء میں خفیہ ایجنسی کی قیادت کے ایٹمی شعبے کی جانب سے مختلف قسم کے احکامات آنے شروع ہو گئے۔اس شعبے سے تعلق رکھنے والی ایک اعلیٰ شخصیت (لافرینتی بیریا) نے مجھے اس سلسلے میں ایک نیا شعبہ ((ایس)) کے نام سے تشکیل دینے کا مشورہ دیا اس شعبے میں بعد میں یورپ اور امریکہ کے ایٹمی معاملات سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی شخصیات شامل ہوئیں اسی شعبے کے ذریعے خفیہ سیل (تشکیست) نے سوویت ایجنٹوں کے ذریعے ایٹمی معلومات روس پہنچائیں۔

1953ء میں کے جی بی کے ایک بڑے عہدے دار کی گرفتاری کے فوراً بعد سودوبلاتوف کو بھی روس میں گرفتار کرلیا گیا جس پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے کے جی بی کے بعض ناپسندیدہ عہدے داروں کو قتل کرا کے ان کی لاشوں کو غائب کرادیا جنرل سودوبلاتوف نے اس الزام کی صحت سے انکار کردیا کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود سودوبلاتوف پر مقدمہ قائم کردیا گیا اور فرد جرم عائد کر کے اسے پندرہ برس کی سزا سنادی گئی۔1968ء میں اسے قید سے رہائی نصیب ہوئی مگر یہ سارا عمل اتنا خفیہ رکھا گیا کہ فروری 1992ء میں یہ سارا معاملہ مکمل طور پر منظر عام پر آسکا۔

سودوبلاتوف نے 1970ء میں اپنی یادداشتیں قلمبند کرنے کا منصوبہ بنایا مگر وہ عملی طور پر اس منصوبے پر زیادہ عمل نہیں کرسکا تھا مگر اب اس کے مطابق اس نے 1990ء تک کے جی بی کی بعض بڑی اور خفیہ کارروائیاں تک قلمبند کردی ہیں۔ 1992ء میں سودوبلاتوف کے بیٹے اناتولی نے جیرالڈ شیکٹر (ماسکو میں ٹائم کا نامہ نگار) کو بتایا کہ اس کے باپ نے نیکیتا خروشیف کو اپنی یادداشتیں قلمبند کرائی ہیں جس پر تقریباً ایک سال صرف ہوا ہے اس پر جیرالڈ شیکٹر نے اس سابق جنرل جس کی عمر اس وقت تقریباً 85 برس تھی کے انٹرویو کا پروگرام ترتیب دیا شیکٹر کے مطابق اس عمر میں سابق جنرل کی یادداشت دھوکہ بھی کھا سکتی ہے اس لئے اس کی باتوں کے ساتھ ساتھ کے جی بی سے متعلق کاغذات کی پڑتال بھی ضروری ہے اس لئے کتاب کے مصنف

نے نہ صرف کے جی بی کے سابق افسران سے اس سلسلے میں مدد حاصل کی بلکہ ان روسی شخصیات سے بھی استفادہ کیا جو امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کی ایٹمی ٹیکنالوجی اڑانے کے مشن پر مامور تھے۔

بافل سودوبلاتوف کی یہ کتاب سوویت یونین کی خفیہ سرگرمیوں سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کا مشہور ماہر طبیعات رابرٹ اوپن ہامر اور دوسرے مشہور امریکی سائنسدان جنہوں نے 1943ء سے لیکر 1945ء تک مشہور منہاٹن ایٹامک پراجیکٹ پر کام کیا تھا وہ سوویت خفیہ ایجنسی کو اس پراجیکٹ کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرتے رہے تھے جنرل سودوبلاتوف کے مطابق سوویت سیکورٹی کا ادارہ NKFD کے پاس امریکہ کے ایٹم بم کی تمام تفصیلات جمع ہو چکی تھیں جو اوپن ہامر اور دوسرے امریکی سائنسدانوں کی مدد سے حاصل کی گئیں تھیں اس سلسلے میں روسی خفیہ ادارے کے پاس انتہائی حساس نوعیت کی دستاویزات تھیں یہ دستاویزات اوپن ہامر نے مہیا کی تھیں اس کے علاوہ بہت سی معلومات زبانی بھی مہیا کی جاتی تھیں جنہیں بعد میں روسی اہلکار تحریر میں ڈھال لیتے تھے۔اوپن ہامر نے امریکہ کی ایٹمی ٹیکنالوجی اور ایٹم بم کی تیاری کی تمام ترکیبات پانچ حصوں میں سوویت یونین کے حوالے کی تھیں۔سودوبلاتوف اوپن ہامر کے متعلق لکھتا ہے کہ "اوپن ہامر کو فکر لاحق تھی کہ اگر صرف امریکہ کو ایٹمی ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل ہوگئی تو اس طرح دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور دنیا تباہی کے دھانے پر پہنچ جائے گی۔اسی خوف کے پیش نظر اوپن ہامر اور بوھر فیرمی نے دنیا کو ایٹمی تباہی سے بچانے کے لئے امریکن ایٹمی ٹیکنالوجی سوویت یونین کے حوالے کی تا کہ دنیا میں طاقت کا توازن برقرار رکھا جاسکے۔"

بافل سودوبلاتوف کے مطابق سوویت خفیہ ادارے نے یہ معلومات اوپن ہامر کے علاوہ اطالوی نژاد سائنسدان انریکو فیرمی، ہنگرین نژاد امریکن سائنسدان لیوسیلارڈ، مہاجر روسی سائنسدان جیوجی جاموف ، ڈینمارکی سائنسدان نیلز بوھر کے ذریعے حاصل کی تھیں۔سودوبلاتوف بوھر کے بارے میں کہتا ہے کہ شخصی طور پر یہ عظیم انسان ہمارا جاسوس نہیں تھا مگر اس کا اپنا ذاتی خیال تھا کہ ایٹمی قوت کو مشترکہ طور پر تمام انسانیت کے لئے استعمال ہونا چاہیے۔اس کے بعد سے سوویت یونین کے لئے ایٹمی توانائی کے دروازے تیزی کے ساتھ کھلنا شروع ہو گئے امریکہ اور برطانیہ کی خفیہ ایٹمی سرگرمیوں کی تمام تفصیلات اس تک آسانی سے پہنچ

رہی تھیں **NKFD** کے ایجنٹ گریگری مارکوفیتش خفیتش نے جو سان فرانسیسکو میں مقیم تھا نے سب سے پہلے امریکی پراجیکٹ کی خبریں ارسال کیں اس کے علاوہ متعلقہ معلومات خفیہ جگہوں میں قائم مراکز سے حاصل کی جارہی تھیں۔ پراجیکٹ پر کام کرنے والے سائنسدان پراجیکٹ سے متعلق بعض اوقات پوری پوری فائلیں ارسال کردیا کرتے تھے اس کے بعد سرد جنگ کا دور شروع ہوا جس میں امریکہ نے اپنی ایٹمی صلاحیت کو روس کے خلاف استعمال کرنے کی متعدد بار دھمکیاں بھی دیں مگر آخری وقت تک وہ سوویت یونین کی ایٹمی استعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

سودوبلاتوف اپنی کتاب میں رقم طراز ہے کہ ’’**1943-42**ء کے دوران ہی سوویت یونین کو اوپن ھامر کے ذریعے امریکہ کی ایٹمی شعبے میں پیش رفت کا علم ہو چکا تھا مگر ہم نے کبھی بھی اوپن ھامر اور فیرمی وغیرہ کو اپنا ایجنٹ نہیں سمجھا یہ تمام لوگ فکری سطح پر بڑی سوچ کے حامل تھے ہم ان سے معلومات یہ سوچ کر نہیں حاصل کرتے تھے کہ یہ لوگ سوویت یونین کے ایجنٹ کے طور پر کام کررہے ہیں بلکہ ان کا شمار ایسے خوفزدہ انسانوں میں ہوتا تھا جو ایٹمی طاعون کے پھیلنے کے خوف میں مبتلا تھے ان کے خیال میں یہ قوت اگر صرف ایک ہاتھ میں مرتکز ہو کر رہ گئی تو عالم انسانیت کسی وقت بھی بڑی تباہی کا منہ دیکھ سکتی ہے۔‘‘ جنرل سودوبلاتوف اس موضوع پر مزید لکھتے ہوئے روشنی ڈالتے ہیں کہ ’’خیفیتس پہلا شخص ہے جو سب سے پہلے **6** دسمبر **1941**ء کو اوپن ھامر سے ملا تھا یہ ملاقات اسپین کے مہاجرین کے لئے امداد جمع کرنے کے بہانے سے کی گئی تھی خیفیتس نے اسے اپنا نام مسٹر براون بتایا تھا جو سوویت قونصلیٹ میں نائب قونصل کی ذمہ داری ادا کررہا تھا خیفیتس جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا جسے انگریزی کے ساتھ ساتھ جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر بھی مکمل عبور تھا اسے اٹلی سے امریکہ بھیجا گیا تھا وہ **1930**ء میں نائب مندوب کی حیثیت سے روم میں خدمات انجام دے رہا تھا اس دوران اس نے انریکو فیرومی اور اس کے نوجوان فیلوز اور شاگردوں سے ذاتی تعلقات استوار کر لئے تھے برونو بونتیکور کے سابق شاگرد بھی اس کے حلقہ ارادت میں تھے یہ تعلقات بعد میں سوویت یونین کے لئے معلومات کے حصول کے لئے پوری استعمال کئے گئے۔ خیفیتس نے اوپن ھامر کو کھانے کی دعوت پر مدعو کیا جس میں گفتگو کے دوران اس نے ایٹمی اسلحے کی تیاری کی خبروں پر تشویش کا اظہار بھی کیا اسی

دوران اوپن ھامر نے مشہور سائنسدان آئن سٹائن کے صدر امریکہ روزویلٹ کو بھیجے گئے خط کا بھی ذکر کیا جس میں امریکہ کو فوجی مقاصد کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔‘‘ سودوبلاتوف کے مطابق خیفیتس بلا کا ذہین آدمی تھا اسے لینن گراڈ میں بین الاقوامی امور کا ماہر تصور کیا جاتا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اوپن ھامر کو پیسے کا لالچ نہیں دیا جاسکتا اور نہ اس پر کسی قسم کا دباؤ کارگر ثابت ہوگا ایسے شخص کو مشترک مفاد کے راستے ہی شیشے میں اتارا جاسکتا تھا۔۔۔ اوپن ھامر آنے والے دور میں ایٹمی تباہ کاریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا اس کے اچھے برے نتائج سے وہ واقف تھا آخر کار خیفیتس کی دلیل اس کی سمجھ میں آگئی اور یہ طے پایا کہ ان ملاقاتوں کو انتہائی خفیہ رکھا جائے گا اور اس طرح امریکہ اور یورپ کی ایٹمی فصیل میں روسیوں نے بڑی ہوشیاری سے نقب لگادی۔ روسی جانتے تھے کہ اوپن ھامر کی جنگ کے بعد بھی وہی صورت برقرار رہے گی جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ اسے بلند مقام دیا۔

1943ء کے آخر میں سوویت خفیہ ادارے نے لینن گراڈ کے کاریں بنانے کے ایک انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل سیمیونوف سیمیون کو امریکہ کے انسٹی ٹیوٹ آف میساچوسٹس میں مزید تعلیم کے لئے بھیج دیا سیمیونوف کو سودوبلاتوف نے **1938**ء میں خفیہ ادارے سے وابستہ کر دیا تھا۔ سیمیونوف تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی امریکہ میں ہی رہا اس نے امریکہ کے ایٹمی پراجیکٹ مینھاٹن سے تعلق رکھنے والے بہت سے ماہرین کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ جن سے بعد میں انتہائی قیمتی معلومات حاصل کی گئی تھیں۔ سودوبلاتوف لکھتا ہے کہ ’’ ہمارے ہاتھوں میں برونو بونتیکورفو کی جانب سے قائم کئے گئے پہلے ری ایکٹر کی تمام تفصیلات آچکی تھیں **12** دسمبر **1942**ء میں شکاگو کے ایٹمی ریکٹر کی معلومات فیرومی کے ذریعے پہنچ چکی تھیں جس کے بعد **11** فروری **1943**ء میں سٹالن نے حکم صادر کردیا کہ ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے جس کی نگرانی میں ایٹمی اسلحے کی تیاری شروع کی جاسکے۔ جون **1943**ء تک امریکہ میں ہمارے ایجنٹوں نے ایٹمی شعبے میں خفیہ تحقیقات سے متعلق **286** خفیہ رپورٹیں ارسال کردی تھیں۔ جس کی وجہ سے سودوبلاتوف کو فروری **1944**ء میں سوویت خفیہ ادارے کے حساس شعبے ایس کا سربراہ بنادیا گیا تھا۔‘‘

سوڈوبلاتوف کے مطابق ''بیریا کورتشاتوف اور دو ماہر طبعیات اسحٰق کیکوین اور ابراھام الیخانوف نے مجھے کہا کہ جنرل سوڈوبلاتوف آپ کو ضروری امداد مہیا کریں گے آپ نے امریکہ میں اپنے ذرائع استعمال کر کے وہاں کے ایٹمی پروگرام کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا ہیں۔مگر اس سلسلے میں ہمیں اب کچھ مشکلات کا سامنا تھا میں نے واشنگٹن میں اپنے آدمی فاسیلی زاروبین کے ذریعے ہیفیتس کو پیغام پہنچایا کہ وہ امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ فی الحال روابط بند کر دے کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق امریکہ کے خفیہ ادارے کچھ عرصے سے ان کی نگرانی کر رہے ہیں اس سے ہمارے مقاصد میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی کیونکہ امریکہ میں ہمارا سب سے بڑا ہدف نیو میکسیکو میں واقع لاس اموس کی ایٹمی تجربہ گاہ اور اس میں کام کرنے والے سائنسدان تھے۔اس کے علاوہ ہماری نظر میں ریاست ٹینیسی میں واقع ''اوکریگی ایٹمی ریکٹر'' کی بھی کافی اہمیت تھی ہم نے اس ریکٹر تک پہنچنے میں جن ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں ان میں جن کا نام ''ایس'' کی خفیہ فائلوں میں سرفہرست تھا وہ اوپن ہامر، فیرومی تھے جو منہاٹن ایٹمی پروجیکٹ سے وابستہ تھے ان ہی کی وساطت سے مزید ماہرین طبعیات سے ہمارے تعلقات استوار ہوئے۔امریکہ میں زاوبین کی بیوی یلیزافیتا نے اوپن ہامر سے ایٹمی معلومات مہیا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہمارے لئے امریکہ میں اس رابطہ کو استوار کرنا خاصا مشکل کام تھا کیونکہ یہ بات امریکی خفیہ ایجنسی کے علم میں آسکتی تھی یہ خاندان کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھا ان کی مدد سے ہم نے اوپن ہامر کو ایک دستاویز پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کے مطابق وہ امریکہ میں بائیں بازو کے عناصر کی اخلاقی مدد کرنے کا پابند تھا ایسا ہوجانے کے بعد اس خدشے کا احتمال ختم ہوگیا کہ اوپن ہامر کسی وقت بھی اپنا موقف بدل سکتا ہے اس وقت امریکی انتظامیہ جرمنی سے فرار ہو کر امریکہ بس جانے والے فاشسٹ عناصر کے تعاقب میں سرگرداں تھی ہٹلر کے یورپ میں منصوبے ناکام ہوتے محسوس ہو رہے تھے اس شور وغل میں سوویت یونین کو امریکہ میں کھل کر کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔۔۔ فیرومی کا اثر ورسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ لاس آموس ٹینیسی اور واشنگٹن کی ایٹمی لیبارٹریوں میں کام کرنے والے ماہرین کو ہمارے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا تھا اس نے ان ریکٹروں سے حاصل کردہ معلومات واشنگٹن میں ہمارے آدمیوں تک پہنچانی شروع کر دی تھیں جنہوں نے وہاں سانتافی میں ایک میڈیکل سٹور

بنا رکھا تھا اسی میڈیکل سٹور میں ٹروٹسکی کے قتل کے منصوبے کو حتمی شکل دی گئی تھی۔اس کے علاوہ 1933ء میں روس سے فرار ہو کر امریکہ میں بس جانے والے ایٹمی سائنسدان جیورجی جاموف پر ہم نے دباؤ ڈالا تھا کہ وہ ہمارے لئے امریکہ میں کام کرے بصورت دیگر فاشسٹوں کی امداد کرنے کے الزام میں اس کے پیچھے امریکی ایجنسیاں بھی لگ سکتی ہیں اس نے اس خوف کے پیش نظر ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور لاس اموس سے حساس نوعیت کی ایٹمی ٹیکنالوجی اڑانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔اس طرح ہم نے امریکہ اور برطانیہ سے جو خفیہ معلومات حاصل کی تھیں ان سے اپنے ایٹمی پروگرام کو تیزی کے ساتھ ترقی دی اس میں یورینیم اور پلاٹینیم کی افزودگی اور ایٹمی ریکٹروں کی تنصیب کا کام شامل تھا 1944ء تک ہم امریکہ کے منہاٹن پروجیکٹ کو تحریری طور پر سوویت یونین منتقل کر چکے تھے اس طرح سوویت یونین مئی 1946ء میں اپنا پہلا جدید ترین ایٹمی ریکٹر قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا مگر اس سلسلے میں ہمیں ابھی بعض تکنیکی رکاوٹوں کا سامنا تھا اس لئے ہم نے ٹیکنیشنوں کا ایک وفد امریکہ روانہ کیا جس نے اوپن ہامر، فیرومی اور سیلارد سے خفیہ ملاقات کر کے مزید رہنمائی حاصل کی اس کے علاوہ ایک وفد ڈینمارک روانہ کیا جس نے وہاں کے ماہر طبعیات بریلیٹسکی سے رابطہ کیا جس نے ان تکنیکی معلومات کو کھول کر بیان کیا جو ہمارے خفیہ نیٹ ورک نے امریکہ اور یورپ سے حاصل کی تھیں۔''

بافل سوڈوبلاتوف کی بیان کردہ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاس اموس سے صرف چین نے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ اس سے بہت پہلے سوویت یونین اس قسم کی بھرپور کارروائی ڈال چکا تھا۔جس کے بعد سابق سوویت یونین میں ایٹمی سائنسدانوں کی اتنی بڑی کھیپ تیاری ہوگئی کہ اب سوویت یونین کی تحلیل کے بعد ان ماہرین کو کام نہیں ملتا تھا۔

کے۔ جی۔ بی۔ اور جنرل شبارچین

تاریخ عالم میں سوویت یونین کی تحلیل بیسویں صدی کے بڑے واقعات میں سے ایک ہے جس پر اسرار کی ایک دبیز تہہ شاید ایک طویل عرصے تک اسی طرح جمی رہے۔ گذشتہ بارہ برسوں کے دوران اس موضوع پر مختلف جہات سے قلم اٹھایا گیا ہے مگر ہر دفعہ واقعات کا تسلسل ایک سمت ہی اشارہ کرتا ہے اور وہ ہے سابق سوویت یونین کی خطرناک خفیہ ایجنسی کے جی بی (KGB)۔ کہا جاتا ہے کہ مملکتوں کے کئی ستون ہوتے ہیں مگر سوویت مملکت صرف ایک مضبوط ستون پر قائم تھی جسے کے جی بی کہا جاتا ہے اسی مضبوط ستون میں امریکہ اور یورپی ممالک نے نقب لگائی جس کے بعد اس مملکت کا حشر سب کے سامنے ہے۔

سوویت یونین کے خاتمے سے تھوڑا عرصہ پیشتر امریکہ اور روس ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی کے میدان میں پوری طرح برسرپیکار رہے ہیں مگر بدقسمتی سے اس میں شکست روس کے حصے میں آئی۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں امریکہ کو اس سلسلے میں خفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں سابق سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی **KGB** کے خارجی امور کے سابق سربراہ جنرل شبارچین کے بعض انکشافات سرد جنگ کے دور میں لڑی جانے والی اس خفیہ کشمکش پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

جنرل لیونیڈ شبارچین **1935**ء میں ماسکو میں پیدا ہوئے۔ **1958**ء میں ماسکو کے

انسٹی ٹیوٹ آف فارن افیئرز سے اپنی تعلیم مکمل کی جس کے بعد انہوں نے سوویت وزارت خارجہ میں ایک سفارت کار کی حیثیت سے اپنے کام کی ابتداء کی۔ **1962**ء تک وہ بھارت، پاکستان اور ایران میں **KGB** کی جاسوس سرگرمیوں کے انچارج رہے۔ اس کے بعد انہیں **KGB** میں افغانستان کے امور کا انچارج بنایا گیا۔ **1981**ء میں انہیں **KGB** کے خارجی امور کا بڑا منصب عطا کیا گیا جس پر وہ اپنی برطرفی یعنی **1991**ء تک فائز رہے۔ جنرل شبارچین انگریزی، ہندی، فارسی کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے ہیں۔

1991ء میں **64** سالہ جنرل شبارچین جس نے **25** سال تک **KGB** کے خارجی امور کی سربراہی کی تھی امریکہ کو سابق سوویت یونین اور اس کی خفیہ ایجنسی کے راز فراہم کرنے کی پالیسی کے خلاف رویہ اپنانے پر برطرف کردیئے گئے تھے۔ سابق سوویت یونین میں اس حساس ترین منصب پر فائز رہنے کی بنا پر شبارچین نے بین الاقوامی سطح پر عالمی سیاست اور بین الاقوامی تبدیلیوں کا نہ صرف بغور جائزہ لیا بلکہ بہت سے بین الاقوامی واقعات کا حصہ بھی رہے ہیں۔ **2000**ء میں خلیج ٹائمز اور روزنامہ الاتحاد کی مشترکہ ٹیم نے بعض دوسرے عرب صحافیوں کے ساتھ مل کر جنرل شبارچین کے ساتھ ماسکو میں ایک نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں گفتگو کے دوران جنرل شبارچین نے **KGB** اور روس کے حوالے سے بہت سے بین الاقوامی واقعات سے پردہ اٹھایا۔

64 سالہ شبارچین جس نے **KGB** کے حوالے سے نصف صدی تک پاکستان ایران اور بھارت میں خدمات انجام دی تھیں نے کہا کہ ''مجھے اس وقت اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا جب مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ امریکہ نے واشنگٹن میں روسی سفارتخانے میں گفتگو سننے کے خفیہ آلات نصب کررکھے ہیں میں نے ولادیمر باکٹین کو کہا کہ یہ امریکہ کی کھلی بددیانتی ہے ہم کیسے امریکہ کو اس کی اجازت دے سکتے ہیں جبکہ امریکہ ہم سے **KGB** کی ریکارڈ فائلیں بھی مانگ رہا ہے مگر ولادیمر باکٹین نے کہا کہ یہ گورباچوف کا فیصلہ ہے اور اس سلسلے میں ہمیں پہلا قدم اٹھانا ہے اور ہم نے اب تک روس میں امریکیوں کی جو جاسوسی کی ہے اس سے متعلق تمام کاغذات میں خود امریکی وزیر خارجہ جیمس بیکر کے حوالے کروں گا یہ سن کر مجھے اپنے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کا احساس ہوا اور میں سوچنے لگا کہ جو چیزیں ہم نے اتنی محنت سے حاصل کیں تھیں انہیں اتنی

آسانی کے ساتھ امریکہ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ امریکی خفیہ ادارے کو اس بات کا علم تھا کہ ہم نے ماسکو کے امریکی سفارتخانے میں سننے کے خفیہ آلات نصب کر رکھے ہیں مگر یہ کہاں اور کس طرح نصب ہیں ان کا امریکیوں کو علم نہیں تھا۔"

روسیوں کی جانب سے امریکیوں کے لئے یہ ایک بیش قیمت تحفہ تھا جو سیاسی مفادات کے حصول کے لئے امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ اس تمام کام میں کلیدی کردار KGB کے سابق اہلکار اولیج کالوجین کا ہے اولیج کالوجین واشنگٹن میں KGB کی سرگرمیوں کا انچارج رہا ہے ان ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ گورباچوف کا غیر رسمی مشیر بن گیا تھا جنرل شبارچین کا خیال ہے کہ KGB کو تباہی کے دھانے تک پہنچانے میں اس کا بنیادی کردار ہے۔ کیونکہ گورباچوف کے مشیر کے طور پر اس کی تعیناتی پر امریکیوں نے غیر معمولی اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اسی کے مشورے پر گورباچوف نے امریکیوں کے حوالے KGB کے قیمتی راز اور ماسکو میں امریکی سفارتخانے میں نصب گفتگو سننے کے آلات کی تفصیلات امریکیوں کے حوالے کی تھی۔

جنرل شبارچین کے مطابق 22 اگست 1991ء کو جب گورباچوف بحیرہ اسود کے علاقے فاروس سے واپس ماسکو پہنچے تو اس کے چہرے پر شکست کے آثار نمایاں تھے یہی آثار بعد میں سوویت سلطنت کی تباہی کا سبب بنے۔ جنرل شبارچین کے ساتھ ایک میٹنگ میں گورباچوف نے شبارچین کو KGB کا سربراہ بنانے کا عندیہ دے دیا کیونکہ اس پہلے وہ سابق سربراہ جنرل کورچشکوف کو اس کے عہدے سے سرکاری حکم عدولی کی بنا پر برطرف کر چکے تھے۔ مگر صرف 27 گھنٹے کے بعد گورباچوف نے شبارچین کو KGB کے فارن سیل میں فون پر بات کرتے ہوئے اطلاع دی کہ وہ اپنے فیصلے سے رجوع کرتے ہوئے ناگزیر وجوہات کی بنا پر ولادیمیر باکاٹین کو سرکاری ایجنسی کا سربراہ بنا رہا ہے۔ اس کی شاید یہ وجہ تھی کہ باکاٹین واشنگٹن سے زیادہ قریب تھا اور سرد جنگ کے خاتمے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اب مغربی ممالک نے روس کو ایک نئی جہت سے دیکھنا تھا۔ شبارچین کے مطابق کسی بھی ملک میں چاہے کوئی بھی نظام ہوا سے چاہئے کہ اپنے ملک کے خفیہ اداروں کی ہر صورت حفاظت کرے کیونکہ یہی ادارے ملکی سلامتی کے ضامن ہوتے ہیں۔

جنرل شبارچین کے مطابق ستمبر 1991ء گورباچوف اور KGB کے سربراہ باکاٹین نے سوویت یونین کو منصوبے کے تحت انتہائی درجے کے افلاس میں مبتلا کر دیا تا کہ اس کی تحلیل کا جواز پیدا کیا جا سکے اس صورت میں میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں اس نظام کا حصہ بن جاؤں یا اپنے منصب سے الگ کر دیا جاؤں میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

جنرل شبارچین نے KGB میں رہتے ہوئے عالمی سطح پر دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا بغور جائزہ لیا اور سوویت یونین کی جانب سے اس میں اپنا کردار بھی ادا کیا۔ ایران کے بارے شبارچین کے خیالات ستر اور اسی کی دہائی میں رونما ہونے والے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ 1978ء کے نصف ثانی میں شاہ ایران کو زبردست اندرونی مزاحمت کا سامنا تھا تہران میں سوویت سفارتخانہ روزانہ کی صورتحال ماسکو روانہ کرتا تھا انتہائی طاقتور نیٹ ورک ہونے کے باوجود تہران میں روسی سفارتکار جن میں انٹیلی جنس ونگ کے سربراہ جنرل شبارچین بھی شامل تھے ابھی تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ آیا شاہ کتنی دیر تک اس مزاحمت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اور کب اسے تخت سے اتار دیا جائے گا؟ یہ وہ دور تھا جب تہران کی شاہراہیں شاہ کے خلاف احتجاجی جلسے جلوسوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں اور علامہ خمینی کی پیرس سے تہران آمد کا ہر طرف چرچا تھا۔ اسی دور میں امریکی ایک مرتبہ پھر حرکت میں آئے شاہ کے اقتدار کو بچانے کے لئے ایک امریکی جنرل کو انتہائی غیر معمولی اور خفیہ دورے پر ایران بھیجا گیا تھا جس نے فوج اور دوسرے حکومتی اداروں کے اہم اہلکاروں سے ملاقات میں یہ نقطہ اٹھایا کہ اگر موجودہ حالات کے پیش نظر ملک میں ایسا فوجی انقلاب لے آیا جائے جو بعد میں شاہ کی حمایت کا اعلان کر دے تو اس طرح ایران کے اقتدار میں خمینی کی آمد کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ ایران کی فوج اور اہم حکومتی اداروں میں علامہ خمینی کے نظریاتی حلیف داخل ہو چکے تھے جس کی وجہ سے امریکی خواہشات کے مطابق فوجی انقلاب کا امکان نہیں رہا تھا اسی بات کے پیش نظر تہران میں KGB کے ذرائع کے مطابق اس امریکی جنرل نے شاہ ایران سے شخصی طور پر ملاقات کی تھی جس میں شاہ کو جلد تہران چھوڑنے کا عندیہ دیا گیا تھا کیونکہ ایران کی فوج میں امریکن نواز ایرانی جنرل بدلتے حالات کے ہاتھوں عملی طور پر معطل ہو چکے تھے ان کے لئے علاقے میں امریکی خواہشات کو عملی جامہ پہنانا اب ممکن نہیں

تھا۔ بلکہ بہت سے جنرل ملک سے فرار کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے ان میں سے کچھ ایسا کرنے میں کامیاب بھی رہے مگر جو عین وقت پر فرار نہ ہو سکے انہیں نئے نظام کے تحت عبرتناک سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ KGB کی معلومات کے مطابق امریکی حکومت اور CIA ایران کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے ان کی معلومات صحیح حالات کے مطابق نہیں تھیں یہی وجہ ہے کہ آخری دنوں میں ایرانی معاملات سے متعلق تمام امور امریکیوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

جنرل شبارچین کے مطابق ایران میں اس بڑی تبدیلی کے فوراً بعد ہم نے آندرے پوف (جو اس وقت KGB کے سربراہ تھے بعد میں روسی صدر بھی مقرر ہوئے) کی سربراہی میں ماسکو میں ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا جس میں ایران کے بدلتے ہوئے حالات اور مستقبل پر غور کیا گیا۔ ایرانی حالات کے پیش نظر سوویت یونین نے ایران کی حزب اختلاف سے بھی رابطہ استوار کیا ہوا تھا روسی اچھی طرح جانتے تھے کہ نظام کی تبدیلی کے بعد اب ایرانی امریکیوں کی طرح روسیوں کو بھی اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ جنرل شبارچین کے مطابق ایک مرتبہ خود علامہ خمینی نے کہا تھا کہ ''امریکہ برطانیہ سے اور برطانیہ امریکہ سے بدتر ملک ہے اور سوویت یونین ان دونوں سے بدترین ہے۔'' آندرے پوف کے ساتھ ماسکو میں ہونے والی اس میٹنگ میں جنرل شبارچین کے ساتھ مستقبل میں ہونے والے ایران سوویت تعلقات کا جائزہ لیا گیا۔ شاہ کے اقتدار سے ہٹ جانے کے بعد علاقے کے حالات یکدم پلٹ چکے تھے۔ جنرل شبارچین کے مطابق ہمیں نئے سرے سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایران کے ساتھ تعلقات استوار کرنے تھے۔ شروع شروع میں عالمی سطح پر یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ ایران کا موجودہ انقلاب زیادہ دیرپا نہیں ہوگا۔ جنرل شبارچین بھی انہیں لوگوں میں شامل تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ایران کی مضبوط اپوزیشن پارٹی جلد ہی نئے نظام کا خاتمہ کر دے گی مگر وقت نے ان خیالات کو غلط ثابت کر دیا۔ جنرل شبارچین کے مطابق ''ماسکو میں ہونے والی اس اہم میٹنگ کے بعد کے جی بی کے سربراہ آندرے پوف نے مجھے علیحدگی میں لے جاتے ہوئے اپنے ان حیران کن خیالات سے آگاہ کیا جو بعد میں سچ ثابت ہوئے۔ آندرے پوف کا کہنا تھا کہ ایران کے موجودہ انقلاب میں علامہ خمینی کی گرفت خاصی مضبوط ہے جبکہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی

KURF

ایرانی اپوزیشن پارٹی اس کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایران کی بائیں بازو کی پارٹیوں پر پوری طرح نظر رکھو کیونکہ جلد ہی ایرانی اقتدار پر اسلام پسندوں کا غلبہ مکمل ہونے والا ہے۔ جس کی عمر بہت طویل ہوگی۔ ایران کا مستقبل خمینی کے ہاتھ میں ہے۔'' آندرے پوف کی رائے سے پہلے میرا خیال تھا کہ ایرانی بائیں بازو کی پارٹیاں شاہ کے بعد زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکیں گیں مگر جیسے ہی میں تہران واپس پلٹا تو مجھے آندرے پوف کی باتیں سچ ہوتی محسوس ہوئیں۔ ایران مکمل طور پر اسلام پسند عناصر کی زد میں آ چکا تھا اور ہمیں واقعی ایران کے ساتھ تعلقات کو نئے سرے سے استوار کرنا تھا۔'' ایران کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کے جی بی میں خارجی امور کے سابق سربراہ جنرل شبارچین نے اس بات کو مکمل طور پر رد کر دیا کہ سابق سوویت یونین کا ایرانی انقلاب کے خلاف کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے کا کوئی پروگرام تھا یا اس نے ایران کی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی کمیونسٹ پارٹیوں کو اس سلسلے میں امداد مہیا کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم نے ایران میں حکومت کے خلاف کمیونسٹوں کی حمایت کی۔ ایران کی مشہور کمیونسٹ پارٹی تودہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی کمزور ترین جماعت شمار کی جاتی تھی۔ اس میں اتنی قوت نہیں تھی جتنی کہ امریکی پراپیگنڈے میں بیان کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تودہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل کیا توری نے ایرانی ٹیلیویژن پر اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے ایران میں کمیونسٹ انقلاب لانے کی کوشش شروع کی مگر یہ اعتراف تشدد کی بنیاد پر کرایا گیا تھا۔ جس کا حقیقت سے دور تک واسطہ نہیں کیونکہ ایرانی حالات اس وقت کسی اور انقلاب کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے وہ امریکہ جو شاہ کے زمانے میں ایران میں سوویت یونین کی نسبت زیادہ اثر و رسوخ رکھتا تھا ناکام ہو چکا تھا۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ سوویت یونین اس قسم کا حماقتی قدم اٹھاتا۔ ایران میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تنظیمیں شاہ کے زمانے میں ہی کافی تباہی کا سامنا کر چکی تھیں۔ عسکری قوت ہونے کے باوجود انہیں ایرانی فوج نے قوت کے ساتھ کچل کر رکھ دیا تھا۔ شاہ کے اقتدار سے ہٹ جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔

مجاہدین خلق کے بارے میں جنرل شبارچین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ کے جی بی نے ایران کی اس مضبوط اپوزیشن جماعت سے تعلقات استوار رکھے تھے

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

شک نہیں کہ یہ ایران کے خلاف ایک مضبوط عسکری جماعت تھی جنرل شبارچین نے اس سلسلے میں حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ ''شاہ اور بعد میں موجودہ نظام کے خلاف اگر کوئی جماعت قوت رکھتی تھی تو وہ صرف مجاہدین خلق جماعت تھی۔'' یہ الگ بات ہے کہ اس میں بھی کئی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ مگر دینی تعصب کے باوجود یہ جماعت امریکہ دشمنی میں سوویت یونین کی جانب مائل تھی۔ کے جی بی نے اس جماعت کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار کر رکھے تھے جنہیں کسی قسم کے خطرے کا سامنا نہیں تھا مگر پھر بھی اس سلسلے میں بسا اوقات مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ تہران کے خفیہ مقام پر ہمارے ایک شخص نے اس جماعت کے ایک رہنما سامانی سے ملاقات کرنی تھی۔ یہ ملاقات تہران کے ایک فلیٹ میں ہوئی مگر تھوڑی دیر بعد ایرانی خفیہ پولیس کا چھاپہ پڑا اور سامانی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ہمیں اندازہ ہوا کہ ایران کی خفیہ ایجنسی کس قدر فعال اور منظم ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم مزید احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انقلاب آنے کے فوراً بعد ایرانیوں نے اپنی خفیہ ایجنسی ساواک کو اپریل 1979ء میں توڑ دیا تھا تا کہ انقلاب کے تقاضوں کے مطابق اسے نئے سرے سے منظم کیا جا سکے مگر سوویت یونین اور کے جی بی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے سیل کو ویسے ہی برقرار رکھا گیا۔ ایرانی خفیہ ایجنسی کا یہ شعبہ ایران میں کے جی بی کی سرگرمیوں کا مسلسل جائزہ لے رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف امریکن سی آئی اے بھی ایران میں روسی سرگرمیوں کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسلامی گارڈ نامی یونٹ کا ایک رکن جس کا ظاہراً نام ''قصاب'' تھا، امریکیوں کو ایران میں خفیہ سوویت سرگرمیوں سے متعلق معلومات فراہم کرتا تھا۔ اس کا اصل نام کانسانی تھا۔ تہران کے امریکی سفارت خانے میں کے جی بی نے مجاہدین خلق کے بعض ارکان کے ساتھ مل کر گفتگو سننے کے خفیہ آلات نصب کئے تھے جس کی بنیاد پر ہمیں اپنے خاص ذرائع سے اس بات کا پتہ چلا کہ قصاب امریکن سی آئی اے اور نیشنل گارڈ کے درمیان رابطے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ مگر جس کے ذریعے یہ انکشاف ہوا جلد ہی اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ایرانی حکومت کو سوویت یونین اور مجاہدین خلق کے درمیان تعلقات کا بڑی حد تک علم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف ہم ایران کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہتے تھے۔ جس کے لئے اس وقت تہران میں سوویت سفیر ولادیمیر فینز گرادوف نے علامہ خمینی سے ملاقات کی اور سوویت یونین کی طرف سے نیک

خواہشات کا پیغام پہنچایا۔ دوسری ملاقات دسمبر 1979ء میں ہوئی جب سوویت فوجیں افغانستان میں داخل ہو چکی تھیں۔ ہم نے خمینی سے ملاقات کے لئے قم کا سفر اختیار کیا۔ یہ ملاقات سوویت یونین کی اس وضاحت پر مبنی تھی جو وہ افغانستان میں مداخلت کے سلسلے میں خمینی کے سامنے کر رہا تھا۔ یہ ملاقات بڑے اچھے ماحول میں ہوئی۔ افغانستان کے بارے میں ہماری وضاحت سننے کے بعد علامہ خمینی نے صرف ایک جملہ کہا کہ ''افغانستان میں مداخلت کر کے سوویت یونین بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہے۔'' اس ملاقات کے دوران میں نے محسوس کیا کہ علامہ خمینی سوویت یونین کے بحیثیت ملک خلاف نہیں بلکہ وہ کمیونزم کے خلاف تھے۔ جن کی سیاسی پالیسی آئیڈیالوجی سے زیادہ مصلحتوں پر مبنی تھی۔ بہر حال میں نے محسوس کیا کہ ہم نے علامہ خمینی کو یہ باور کرانے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے کہ ہم بڑے نہیں بلکہ چھوٹے شیطان ہیں؟

ایران عراق جنگ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جنرل شبارچین نے کہا کہ ''ایران عراق جنگ کے شروع میں ہم نے عراق کو امداد دینا ترک کر دیا تھا حالانکہ سوویت مفادات پر اس کے منفی اثرات محسوس کئے جا سکتے تھے مگر اس وقت تک ہم ایران کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں تھے مگر جلد ہی ماسکو کے پالیسی ساز اداروں نے فیصلہ کیا کہ عراق کو اسلحے کی سپلائی دوبارہ جاری کی جائے۔ عراق نے افغانستان میں سوویت مداخلت پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا یہی وجہ تھی کہ ماسکو نے بغداد کے ساتھ قربتیں بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ان قربتوں کی اور بھی بہت سی وجوہات تھیں۔ عراق کا سیاسی نظام سوویت نظام سے کافی میل کھاتا تھا اس کے علاوہ بغداد اور ماسکو کے درمیان باہمی تعاون کے کئی پروجیکٹ پایہ تکمیل تک پہنچنے کو تھے بعد میں روس عراق تعلقات پر ایران نے متعدد مرتبہ احتجاج بھی کیا مگر اس کے باوجود روس اور ایران کے تعلقات ایسے نقطہ پر نہیں پہنچ سکے جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ایرانی قیادت باہر کی دنیا کے لئے انقلابی اور متعصب ہو سکتی ہے مگر حقیقت میں اس چیز کا اندازہ غلط لگایا گیا۔ ایرانیوں نے بہت سے امور میں اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے۔ سفارتی محاذ پر روسیوں نے اپنے مفادات کے زیر سایہ ایران عراق جنگ رکوانے کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ کیونکہ افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد اس سے

متصل علاقے میں جنگ کی کیفیت برقرار رہنا سوویت یونین کے مفاد میں نہیں تھا۔ مگر مصلحت کی یہ کوششیں ہمیشہ ناکام رہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ امریکہ تھا جو اس سلسلے میں انتہائی خطرناک رول ادا کر رہا تھا۔ علاقے میں اس کے اپنے مفادات تھے سوویت یونین افغانستان کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ علاقے کے دوسرے ملکوں میں جنگ کا جاری رہنا امریکی مفاد میں تھا تاکہ وہ اپنی سرگرمیوں کو علاقے میں جاری رکھنے کے لئے ان حالات سے فائدہ اٹھا سکے۔''

کویت پر عراقی قبضے اور خلیج میں تباہ کن جنگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے کے جی بی کے خارجی امور کے سابق سربراہ جنرل شبارچین نے حیرت انگیز انکشافات کئے۔ انہوں نے کہا کہ ''سب سے پہلے ہمارے لئے یہ بات انتہائی حیران کن تھی عراق کویت پہ چڑھ دوڑا۔ صدام حسین کی کویت کے خلاف نرم گرم گفتگو سے ہم پوری طرح آگاہ تھے تیل کی قیمتوں نے نہ صرف صدام حسین بلکہ علاقے کے دوسرے ممالک کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ لیکن ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ عراق کویت کے خلاف اتنا انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے۔ مگر اس سے زیادہ حیران کن بات ہمارے نزدیک یہ تھی کہ امریکیوں کو عراق کی فوجی قوت کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ نہ ہی امریکن سی آئی اے اس بات سے آگاہ تھی کہ عراق میں قوت کے مراکز کہاں کہاں ہیں یہاں تک کہ کویت پر عراقی قبضے کے بعد بھی امریکیوں کو کویت میں عراقی فوجی قوت کا مکمل طور پر علم نہیں تھا۔ اس سلسلے میں امریکیوں نے بلاواسطہ ذرائع کو استعمال کیا۔ عراق کی سیاسی اور عسکری قوت سے کے جی بی مکمل طور پر آگاہ تھی ہم جانتے تھے کہ عراق میں قوت کے مراکز کہاں کہاں ہیں اس وقت تک ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان خفیہ معلومات کے تبادلے کا کوئی معاہدہ نہیں تھا مگر نیٹو سے تعلق رکھنے والے کچھ یورپی ممالک ماسکو کے ساتھ اس تعاون سے منسلک تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے انہیں کچھ محدود معلومات فراہم کر رکھی تھیں۔ عراقی فوجوں کے کویتی سرحد عبور کرنے کے چند گھنٹوں بعد ہی ہم تک یہ اطلاعات پہنچ چکی تھیں کہ عراق کویتی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے بعد مطلوبہ مقاصد حاصل کرے گا اور اپنی فوجوں کو واپس عراق کی حدود میں لے جائے گا۔ کویت پر قبضے کا فیصلہ عراق کی انقلابی کونسل نے نہایت عجلت میں کیا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ 1979ء میں سوویت پولٹ بیورو میں افغانستان پر قبضے کے لئے کیا گیا تھا۔ اپنے ذرائع سے اس قسم کی خبریں ملنے کے بعد ہم نے اپنی سفارتی کوششیں تیز کر دیں تاکہ عراقی

فوجیں جلد سے جلد کویت خالی کر دیں ہم نہیں چاہتے تھے کہ امریکہ کو علاقے میں کوئی بڑا کھیل کھیلنے کا موقع ملے۔ سیکورٹی کونسل میں جس وقت عراق کے خلاف طاقت کے استعمال کی قرارداد منظور کرائی جا رہی تھی اس وقت تک روس اس بات پر ڈٹا ہوا تھا کہ عراق کو بغیر جنگ کے کویت خالی کرنے کا موقع دیا جائے۔ کے جی بی نے شرق الاوسط سے متعلق اس سنگین صورتحال کو فوراً گورباچوف تک پہنچا دیا تھا اور اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ علاقے میں ایک بڑی جنگ امریکہ کے مفاد میں ہے۔ مگر گورباچوف نے کے جی بی کی ان تصریحات کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ تھوڑا وقت جو قیمتی تھا ضائع کر دیا اور سیاسی سطح پر اس وقت کے سوویت وزیرخارجہ ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے اور سوویت یونین کے پولیٹیکل بیورو کے رکن الیگزینڈر یاکوفلیف کو مسئلہ کے حل کے لئے نامزد کیا مگر مذکورہ بالا دونوں شخصیات کے فکری اور سیاسی رجحان کو جاننے والے اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے مسئلے کو کس کے حق میں حل کیا ہو گا...... گورباچوف نے شرق الاوسط کی اس نازک ترین صورتحال کو ان دونوں اشخاص کی آراء کے تناظر میں دیکھنا شروع کیا اور حالات نے اس طرف اپنا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا جس طرف امریکہ چاہتا تھا۔ کے جی بی میں بری طرح نقب لگ چکی تھی دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کے جی بی کے ہاتھ پیر باندھے جا رہے تھے۔ سی آئی اے نے نیٹو سے تعلق رکھنے والے ان یورپی ارکان ممالک سے عراق کی فوجی قوت کے متعلق معلومات حاصل کرنے شروع کر دیں تھیں جو انہیں کے جی بی نے فراہم کی تھیں۔ امریکہ عراق کی فوجی قوت کے بارے میں اب زیادہ روشنی میں آتا جا رہا تھا۔ صدام حسین نے عراق پر قبضے کے لئے انقلابی کونسل کے جن ارکان کی حمایت حاصل کی تھی وہ انتہائی قلیل تعداد میں تھے بغداد میں کوئی بھی کویت پر قبضے کے حق میں نہیں تھا۔

صدام حسین کی طرف سے بہترین حکمت عملی ہوتی اگر وہ کویت سے اپنی فوجوں کو جلد واپس بلا لیتا مگر یہ فیصلہ کرنے میں اس نے دیر کر دی جس کی بڑی بھاری قیمت عربوں نے ادا کی اور آج تک ادا کر رہے ہیں۔ گورباچوف نے اس حساس ترین عالمی تنازعے کے دوران پریماکوف کو ذاتی ایلچی کے طور پر بغداد روانہ کیا میرا بھی خیال ہے کہ پریماکوف نے صدام حسین کو کویت خالی کر دینے پر راضی کرنے کی کوشش کی ہو گی مگر وزیرخارجہ شیورڈ نارڈزے پریماکوف پر غضبناک تھے سوویت قیادت اس وقت تک چاہ رہی تھی کہ عراق کا عسکری ڈھانچہ امریکہ اور اس

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

کے اتحادیوں کے ہاتھوں تباہ نہ ہو مگر واشنگٹن نے ایسی صورتحال پیدا کر دی جس سے واپسی کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ ماسکو جنگ روکنا چاہتا تھا جبکہ واشنگٹن صدام حسین کے اقتدار کو ختم کرنے سے کم پر راضی نہیں تھا۔ مگر یہ واشنگٹن کی ایسی خواہش تھی جسے وہ پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں امریکہ نے اپنی حیثیت سے نیچے آ کر کئی اقدامات بھی کئے جس میں عراق کی اپوزیشن پارٹیوں کو عسکری اور مالی امداد دینا شامل تھا۔ کے جی بی کی معلومات کے مطابق امریکہ نے شمالی اور جنوبی عراق سے تعلق رکھنے والی اپوزیشن جماعتوں کو وافر مقدار میں صدام حکومت کے خلاف امداد پہنچائی مگر اس امداد کے نتائج خود ان جماعتوں کے لئے ہی تباہ کن ثابت ہوتے رہے۔''

امریکی منصوبے کے مطابق عراق کی تقسیم سے متعلق جنرل شبار چین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''عراق کو اگر تقسیم کرنے کی کوشش کی تو نہ صرف پورے علاقے کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا بلکہ شرق الاوسط میں طویل جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اگر جنوبی عراق کو الگ کیا جاتا ہے تو وہاں شیعہ اکثریت اپنی حکومت قائم کرے گی جس سے سب سے زیادہ خطرہ خود کویت اور بحرین کو ہو جائے گا۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ عراق کو اس سمت سے تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح ترکی کبھی اجازت نہیں دے گا کہ عراق کو شمال سے تقسیم کیا جائے وہاں کی کرد اکثریت ترکی کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عراق کی تقسیم علاقے کے لئے کسی خطرناک آتش فشاں سے کم نہیں۔ جس کے پھٹنے سے پورا علاقہ اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ یوگوسلاویہ کی تقسیم اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ جنوبی روس میں کیا ہو رہا ہے؟ خود افغانستان کی مثال سب کے سامنے ہے۔ کیا افغان مجاہدین نے امریکی اسلحے سے سوویت یونین کے خلاف جنگ نہیں لڑی۔ آج یہ وہی مجاہدین ہیں جو امریکہ کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ 1990ء میں ہم نے وزارت خارجہ کے ذریعے امریکہ کے خفیہ اداروں کو خبردار کیا کہ افغانستان منشیات کی پیداوار کا بہت بڑا مرکز بن چکا ہے۔ افغانستان میں منشیات کی پیداوار سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد اور تنظیموں کی لسٹ سی آئی اے کو فراہم کی گئی۔ اس میں ان خفیہ راستوں کا بھی ذکر تھا جو پاکستان سے ہوتے ہوئے باہر کی دنیا تک جاتے ہیں مگر امریکی اس سلسلے میں بھی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔''

جنرل شبار چین کے مطابق ''امریکہ نے عراق اور ایران میں اپنے خفیہ ہاتھوں کے ذریعے کئی سالوں پر محیط جنگ کو ہوا دی۔ سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد امریکہ کبھی نہیں چاہے گا کہ روس ایران کے قریب آئے یا شرق الاوسط میں کوئی کردار ادا کرے۔ اس وقت بھی ایران روس کے درمیان بہت سے مشترکہ منصوبوں کے خلاف امریکہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ اس وقت بھی امریکی بچے کھچے روس کو مزید کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سابق صدر یلسن کا یہ کہنا کہ روس شام اور ایران کے ساتھ اپنے عسکری معاہدوں کو محدود کر رہا ہے روس کی اہانت کے مترادف تھا یہ سب کچھ امریکی امداد کے حصول کے لئے کیا جا رہا تھا امریکہ نے اس امداد کو پھانسی کا پھندہ بنا کر روس کے گلے میں ڈال رکھا تھا.....''

سازشیں، مشکلیں اور رکاوٹیں
ایٹمی قوت بننے والے اسلامی ملک؟

28 مئی 1998ء کو پاکستان نے چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکہ کر کے نہ صرف مغرب کی جوہری بالادستی کا پرچم سرنگوں کر دیا تھا بلکہ اس طرح اس نے پہلی ایٹمی اسلامی ریاست ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ اس مشکل ترین خواب کی تعبیر تک پہنچنے کے درمیان جو سالوں پر محیط کٹھن ترین دورانیہ ہے اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور میں ہونے والی ایٹمی کشمکش کا جائزہ لینا ہوگا جس میں بہت سے ممالک خصوصاً اسلامی ممالک ناکام رہے۔ سینکڑوں ایٹمی سائنسدانوں کو سازش کے ذریعے اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے مگر دوسری طرف پاکستان تمام تر مشکلات اور عالمی مخالفت کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا رہا۔

ایٹمی صلاحیت کے حصول کی جنگ صرف پاکستان ہی نہیں لڑ رہا تھا بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک بھی اسی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے۔ جن میں عراق، ایران، لیبیا، شام، مصر، شمالی کوریا، بھارت، جنوبی افریقہ اور چین شامل ہیں۔ اسرائیل کو ہم اس لئے لسٹ میں شامل نہیں کریں گے کیونکہ اسے اس سلسلے میں امریکہ اور یورپی ممالک کی بھرپور مدد حاصل تھی۔

بھارت کا ایٹمی طاقت بننے کا جنون ہی اصل میں جنوبی ایشیا میں ایٹمی دوڑ شروع

ہونے کا سبب بنا، اسی سلسلے میں بھارت کو ایک انفرادیت حاصل تھی کہ اس کا ایٹمی پروگرام اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا یعنی 1945ء میں بھارت کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر ہومی بھابھا نے بھارت کے مشہور صنعت کار خاندان ٹاٹا کی مالی معاونت سے بمبئی کے شمال کی جانب 35 میل کے فاصلے پر ایک پرائیویٹ نیوکلیئر پلانٹ نصب کیا تھا اس پلانٹ کے ایندھن کی مین سپلائی امریکہ، کینیڈا اور فرانس سے تھی۔ ڈاکٹر ہومی بھابھا کیمبرج یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ماہر طبیعات تھا۔ 1947ء میں بھارت کے وجود میں آنے کے بعد ڈاکٹر ہومی بھابھا کو بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو کا قرب حاصل ہو چکا تھا۔ 1945ء میں جاپان پر ایٹمی حملوں کے بعد دنیا پر اس ٹیکنالوجی کی ہلاکت خیزی ظاہر ہو چکی تھی اور عام طور پر یہ تاثر زور پکڑ چکا تھا کہ عالمی سطح پر اپنا وجود منوانے کے لئے اس طاقت کا حصول ناگزیر ہے۔ بھارت اس سلسلے میں خوش نصیب ملک تھا جسے برطانوی استعماریت کے ترکے میں بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک عدد ایٹمی ری ایکٹر بھی ملا تھا۔ جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر بھابھا کو ایٹمی ٹیکنالوجی پر مکمل دسترس حاصل کرنے کا سگنل دے دیا تھا۔ جس کے تحت 1949ء میں ہی بھارت کے ایٹمی کمیشن نے فرانس سے روابط استوار کر لئے تھے۔

1951ء میں فرانس نے بھارت کی باقاعدہ طور پر ایٹمی میدان میں معاونت شروع کر دی تھی۔ ایک معاہدے کے تحت بھارتی ایٹمی سائنسدانوں کو فرانس کی ایٹمی لیبارٹریز میں فنی تربیت دی جانے لگی۔ فرانس کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر فرقانس پیرن کے مطابق ''ایٹمی میدان میں ہم بھارت کے بہت قریب تھے اس سلسلے میں صرف کینیڈا ہی نہیں، بلکہ ہم بھی علاقے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتے تھے''۔ فرانس کے تعاون کے علاوہ ڈاکٹر بھابھا 1960ء میں کینیڈا سے ایک بڑا ایٹمی ری ایکٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ ری ایکٹر پلاٹینیم پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ کینیڈا بھارت کے ری ایکٹروں کے لئے بھاری پانی اور نیوکلیئر فیول کی ضروریات پوری کر رہا تھا اس سلسلے میں راجستھان کے مقام پر پلانٹ نصب کر دیا گیا تھا اس سے پہلے اس قسم کے دوری ایکٹر تری پورہ اور مدراس کے مقام پر کام کر رہے تھے جن کے لئے ڈاکٹر بھابھا نے امریکہ سے اکیس ٹن بھاری پانی حاصل کیا جو کسی بھی بین الاقوامی ضمانت یا تحفظات کے بغیر مہیا کیا گیا تھا بلکہ اس سلسلے میں بھارت اور

امریکہ کے درمیان ایک معاہدہ بھی عمل میں آیا تھا جس کے مطابق امریکہ بھارت کے تری پورہ میں واقع ایٹمی ری ایکٹر کو تیس سال تک ایندھن مہیا کرنے کا پابند تھا۔

بھارت کا ایٹمی پروگرام ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ 1962ء میں اس کی چین کے ساتھ سرحدی جنگ شروع ہوگئی جس میں اسے شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعے کو ابھی صرف دو سال ہی ہوئے تھے کہ اکتوبر 1964ء میں چین نے اپنا پہلا ایٹمی دھماکہ کردیا جس پر بھارتی وزیراعظم نہرو نے اعلان کیا کہ ''ہم بھی اپنی سلامتی کو یقینی بنائیں گے'' اس اعلان کے ساتھ بھارت نے اسرائیل کے ساتھ ایٹمی وعسکری تعلقات استوار کرلئے' امریکہ اور کینیڈا سے جو معاونت بھارت کو حاصل تھی اس میں بھی اسرائیلیوں کا مکمل ہاتھ تھا۔

فرانس کے ایٹمی کمیشن میں ڈائریکٹر برائے تعلقات عامہ ڈاکٹر برٹنڈ گولڈسمتھ کے مطابق ''ڈاکٹر بھابھا بم حاصل کرنا چاہتا تھا اس سلسلے میں بھارتیوں نے خفیہ طور پر 1968ء میں ہی دھماکہ کرلیا تھا''۔ مگر بھارت کا یہ خفیہ دھماکہ ریکارڈ پر نہیں ہے اس لئے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ بات پایہ ثبوت پر ہے کہ ایک مرتبہ بھابھا نے برطانیہ کے نوبل انعام یافتہ لارڈ بلیکٹ کو واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ''میری یہ خواہش ہے کہ ہم ایٹمی ہتھیار بنائیں'' اس سلسلے میں بھابھا نے 1964ء کے بعد اسرائیل کے متعدد دورے بھی کئے جس کے نتیجے میں بھارت اسرائیل مشترکہ ایٹمی کمیشن بھی ترتیب دیا گیا جس نے آگے چل کر بھارت کے ایٹمی پروگرام میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کے سرپرست اول اور اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریان نے آئن سٹائن کی ایٹمی دریافت کے بعد ایک بیان میں کہا تھا کہ ''دنیا میں اس حیرت انگیز ایجاد سے صرف چند ممالک ہی زیادہ دیر استفادہ نہیں کرسکیں گے بلکہ جلد ہی دوسری قومیں بھی اس پر دسترس حاصل کرلیں گی''۔ اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ اسرائیل بھی اس ٹیکنالوجی کو حاصل کرلے گا۔ اسرائیل کو شروع میں ایٹمی ایندھن کے حصول میں دشواری کا سامنا تھا اس سلسلے میں امریکی لیبارٹریوں میں کام کرنے والے امریکی یہودی سائنسدان اس کے معاون تھے۔ ٹیکنالوجی کے معاملے میں اسرائیل کو خاص دشواری نہیں تھی۔ اس کمی کو امریکی یہودیوں نے بڑی حد تک پورا کردیا تھا۔ سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق 1968ء

میں اسرائیل کے پاس ایٹم بم آچکا تھا اس وقت کے سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈوکیٹ نے 550 صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ سی آئی اے کے ڈائریکٹر رچرڈ ہیمز کے سپرد کی تھی جس نے اس رپورٹ کو اس وقت کے امریکی صدر جانسن کے سپرد کردیا مگر صدر جانسن نے رچرڈ ہیمز کو سختی کے ساتھ اس رپورٹ کو آؤٹ کرنے سے منع کردیا بلکہ اسے ہدایت کی کہ اس رپورٹ کو وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کے سامنے بھی لانے سے گریز کیا جائے۔ اس سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ نے ہمیشہ سے ہی اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں چشم پوشی اختیار کررکھی تھی اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کے متعلق رپورٹ تیار کرنے کے جرم میں سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈوکیٹ کو جارج بش نے جب وہ سی آئی اے کے سربراہ تھے' خرابی صحت کا بہانہ بنا کر جبری رخصت پر بھیج دیا تھا۔ اس سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایٹمی معاملات میں اسرائیل کو امریکی تحفظات حاصل تھے۔

اسی طرح دسمبر 1997ء میں عالم عرب کے صحافتی حلقوں میں برطانوی وزارت خارجہ کی ایک خفیہ رپورٹ کی بازگشت زور وشور سے سنائی دے رہی تھی۔ مصر کے اخبار ''الاہرام'' اور دبئی سے شائع ہونے والے اخبار ''الاتحاد'' نے سب سے پہلے اس رپورٹ کو عالم عرب میں متعارف کرایا۔ برطانوی وزارت خارجہ کی یہ رپورٹ اسرائیل کے ایٹمی ری ایکٹر ڈیمونہ سے متعلق امریکہ اور یورپی ممالک کی مفاہمانہ پالیسی پر مبنی تھی۔ اسرائیل کے عسکری شعبے میں ڈیمونہ ایٹمی ری ایکٹر کا نام نیا نہیں ہے۔ مغربی ذرائع کے مطابق اب تک اس ایٹمی ری ایکٹر میں 70ء کی دہائی میں فرانس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ فرانس کا یہ شرمناک کردار 1956ء کے برطانیہ اسرائیل اور فرانس کے مصر پر حملے کے جواب میں تھا۔ 1970ء کی ہی دہائی میں حسابات برابر کرنے شروع کئے تھے۔ فرانس کے اس غیض وغضب کا سامنا اس وقت کے مصری لیڈر جمال عبدالناصر نے کیا جنہوں نے پیرس اور تل ابیب کے درمیان ایٹمی مفاہمت کے راز دنیا پر کھول دیئے تھے۔

فرانس نے اسرائیل کو افزودہ یورینیم کی اتنی مقدار مہیا کردی تھی جو اس سے پہلے امریکہ اور برطانیہ نے بھی نہیں کی تھی۔ اس ضمن میں فرانس اور اسرائیل کے نمائندوں کی لندن اور واشنگٹن میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ برطانوی وزارت داخلہ کے ان معاملات سے متعلق

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

فائل کا نام ''امریکہ اور برطانیہ کی متحدہ آنکھ'' رکھا گیا جو اس بات پر شاہد ہے کہ یہ گٹھ جوڑ شرق الاوسط کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے منعقد کیا گیا تھا اور جیم اسپین اس کانفرنس میں شرق الاوسط سے متعلق مکمل معلومات کے ساتھ شریک ہوا تھا''۔ اس خفیہ رپورٹ کے مطابق اس کانفرنس سے دو ہفتے قبل امریکی معائنہ ٹیم نے اسرائیل کے ڈیمونہ ری ایکٹر کا معائنہ کیا تھا۔ ان کے مطابق اس ری ایکٹر میں جوہری بموں کی پیداوار کا کوئی نشان نہیں ملا۔ انہوں نے اس ری ایکٹر کو بین الاقوامی ایٹمی پابندی سے مبرا قرار دیا تھا۔ برطانوی وزارت خارجہ کی ایک دوسری رپورٹ جس کا نمبر (1/241-ER) ہے کے مطابق امریکی معائنہ ٹیم کو ڈیمونہ ایٹمی ری ایکٹر کے بعض مقفل حصوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جبکہ معائنہ ٹیم کے ارکان کا خیال تھا کہ ان حصوں میں ایٹم بم بنانے سے متعلق مشینری نصب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ معائنہ ٹیم کے ارکان کو دروازے سے ہی واپس لوٹا دیا گیا تھا۔ ٹیم کے ایک رکن کے مطابق ری ایکٹر کے ان حصوں میں پلاٹینیم کو بھی افزودہ کیا جاتا تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق جیم اسپن کہتا ہے کہ اسرائیل کے ان اقدامات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ایک اور نیا ایٹمی ری ایکٹر بنا لے گا۔ اسپین کے مطابق اسرائیل شروع سے ہی ایٹم ہتھیار بنانے کی کشمکش میں مبتلا تھا کیونکہ ڈیمونہ کے ری ایکٹر میں تیار ہونے والا تمام کا تمام ایٹمی فضلہ جوہری بموں میں استعمال کیا گیا۔ اس رپورٹ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلیوں نے شروع سے ہی امریکیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس ری ایکٹر کے قیام کا اساسی مقصد کیا ہے۔

معاہدے کے مطابق استعمال شدہ ایٹمی فضلہ فرانس کو واپس کیا جانا تھا جس کی توثیق پیرس میں کی گئی تھی۔ واشنگٹن اس سلسلے میں فرانس کو واپس ملنے والی مقدار میں دلچسپی رکھتا تھا تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ اسرائیل کی ایٹمی قوت بتدریج کس حد تک آگے بڑھ رہی ہے۔ رپورٹ جو اس وقت برطانوی وزیر خارجہ براؤن کے دفتر میں موجود تھی کے مطابق جیم اسپین کو فرانسیسی مندوب ڈی نتالی نے آگاہ کیا تھا کہ حکومت فرانس نے اسرائیل سے سرکاری طور پر استعمال شدہ ایٹمی فضلہ واپس کرنے کی اپیل کی ہے مگر دو مرتبہ کوئی مثبت جواب نہ آنے کے بعد اب ہم تیسری مرتبہ اس ایٹمی فضلہ کو واپس کرنے کی درخواست کرنے والے ہیں۔ اسپین نے فرانسیسی نمائندے سے کہا اگر اسرائیل نے معاہدے کے مطابق ایٹمی فضلہ واپس کرنے سے

انکار کر دیا تو فرانس کا اس پر کیا ردعمل ہوگا؟ فرانسیسی نمائندے کا جواب تھا کہ حکومت فرانس اسرائیل کو اس منصوبے کے لئے دینے والے قرض منجمد کر دے گی اسی لئے میں نے لندن میں برطانوی وزارت خارجہ کے نمائندے کو کہا کہ ہو سکتا ہے اسرائیل کو فرانس سے مزید ایٹمی مواد کی ضرورت نہ ہو اور ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسرائیل ایٹمی مواد کی مطلوبہ مقدار کہیں سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس خفیہ رپورٹ کے مطابق جو مزید معلومات سامنے آئی ہیں ان کے مطابق اسپین نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ڈیمونہ کے ایٹمی ری ایکٹر کے معائنے کے لئے ہمیں چھ ہفتے درکار ہیں اور ہم اس سلسلے میں برطانوی موقف کی تائید کرتے ہیں جبکہ برطانوی نمائندوں کا بیان تھا کہ ہمیں اس ضمن میں امریکی معلومات درکار نہیں ہیں کیونکہ امریکی اس سلسلے میں اسرائیل کے مکمل معاون ہیں........ برطانوی نمائندوں کے مطابق ''ہماری انٹیلی جنس رپورٹوں سے یہ بات واضح ہے کہ ڈیمونہ کے ایٹمی ری ایکٹر میں ایٹم بم بنانے کا کام ہوتا ہے جبکہ امریکی ماہرین کو اس کے دروازے سے ہی پلٹا دیا گیا تھا''۔ دوسری طرف اسپین کا کہنا تھا کہ برطانوی وزارت خارجہ کی رپورٹ سفارتی ذرائع پر مبنی تھی نہ کہ یہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے حاصل کی گئی تھی''۔ جم اسپن کا کہنا تھا کہ ''میں نہیں چاہتا کہ یہ رپورٹ امریکیوں کے ہاتھ لگے اور مجھ سے پوچھ گچھ ہو' کیونکہ ہم پوری طرح سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے''۔ اسپن کے اس بیان سے صاف ظاہر تھا کہ امریکہ کے اعلیٰ حکومتی حلقوں نے اسرائیل کے اس دہشت گردانہ عمل سے آنکھیں بند کر رکھی تھی۔ برطانوی وزارت خارجہ کو ڈیمونہ ری ایکٹر کے بعض خطرناک حصوں کی رپورٹیں مل چکی تھی جو امریکی ٹیم کو معائنے کے دوران وہاں نظر نہیں آئے۔

ڈیمونہ کا ایٹمی ری ایکٹر اسرائیل کے صحراء النقب میں واقع ہے اس کا دوسرا نام لاس آموس ہے۔ اس ری ایکٹر میں جوہری بموں کے ڈیزائن اور پیداوار کے شعبے ہیں۔ یہ اسرائیل کے علاقے سوریق کے شمال میں واقع ہے اسی مقام پر اسرائیلی میزائلوں اریحا۔ 2 اور تل نوف کے گودام بھی ہیں۔

اسرائیل کے لئے جہاں اپنے ایٹمی پروگرام کو ترقی دینا تھی وہاں اسلامی ممالک کی ایٹمی صلاحیت کے حصول کی کوششوں پر بھی نظر رکھنا تھی' جس کی بڑی مثال یہ ہے کہ عراق کے

جامعہ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنے میں اسرائیل کا بڑا ہاتھ ہے جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل نے بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنے کی متعدد بار کوشش بھی کی۔ انہی کوششوں کا ایک حصہ بھارت کو ایٹمی طور پر مضبوط کرنا تھا اس سلسلے میں بھارت کے ساتھ اسرائیل کا ایٹمی تعاون شروع سے رہا مگر ان تعلقات میں گرمجوشی اس وقت پیدا ہوئی جب 1982ء میں انٹرنیشنل اٹامک کمیٹی نے اعلان کیا کہ پاکستان اپنے ذرائع سے یورینیم افزودہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے اس خبر نے نہ صرف بھارت میں بلکہ اسرائیل اور مغربی ممالک میں بھی کھلبلی مچادی تھی جس پر اسرائیلی وزیراعظم نے اپنے بھارتی ہم منصب راجیو گاندھی کے ساتھ مل کر 1985ء میں امریکی صدر ریگن سے ملاقات کی تھی۔ جس میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر بھرپور طریقے سے اظہار تشویش کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں مئی 1992ء میں تل ابیب کے مقام پر بھارت اور اسرائیل کے درمیان پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف مشترکہ لائحہ عمل اپنانے پر اتفاق کیا گیا تھا اس میں سرفہرست پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے متعلق خفیہ معاملات کا تبادلہ بھی تھا۔ 1993ء میں اسرائیل نے واضح طور پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو خطرناک صورتحال کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی سال مئی کے مہینے میں اسرائیل کے سابق وزیراعظم شمعون پیریز نے بھارت کا دورہ کیا جس کے دوران انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ''اسرائیل پاکستانی ایٹمی خطرے اور اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف بھارت کی بھرپور مدد کرے گا''۔

اسرائیل نے بھارت کے ''تاراپور'' اور ''کالپاکام'' کے ایٹمی ری ایکٹروں کی تنصیب کا کام براہ راست اپنے ایٹمی ماہرین کی نگرانی میں مکمل کروایا اس کے جواب میں بھارت نے اسرائیل کو افزودہ یورینیم اور کیمیاوی مواد کی بڑی مقدار سپلائی کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپریل 1997ء میں سری لنکا کی بحری سیکورٹی فورس نے بھارت کے چار چھوٹے بحری جہاز قبضے میں لے لئے تھے۔ ان جہازوں پر 18 ٹن بنکولفان فاسفیٹ مادہ لدا ہوا تھا' یہ کیمیائی مادہ انسانی اعصاب شل کرنے والی گیس اور دیگر کیمیاوی ہتھیاروں میں کام آتا ہے۔ ان جہازوں کی دستاویزات سے انکشاف ہوا کہ یہ بحری جہاز ممبئی سے اسرائیلی بندرگاہ حیفا جا رہے

KURF

تھے۔

اسی مہینے بھارت کے اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' نے اسرائیل کے حوالے سے خبر دی کہ ''اسرائیل بھارت کو فضائیہ کے شعبے میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ جدید ریڈار سسٹم بھی مہیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسرائیل بھارت سے پاکستانی حدود کے قریب اپنے جنگی طیاروں کے لئے ہوائی اڈوں کی سہولت حاصل کرنے کا خواہاں ہے تاکہ اسے بوقت ضرورت پاکستان کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ اس کے فوراً بعد مصر کے سیاسی اور عسکری ماہرین برائے جنوبی ایشیا نے واضح طور پر اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اسرائیل کسی وقت بھی پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرسکتا ہے۔ سعودی عرب کے اخبار ''الریاض'' نے 27 مئی 1998ء کی اشاعت میں مصر کے صحافتی حلقوں کے حوالے سے خبر دی تھی کہ ''پوکھران'' کے علاقے میں بھارتی ایٹمی دھماکے کے دوران اسرائیلی ایٹمی ماہرین بھی موجود تھے''۔

بھارت کی ایٹمی معاونت کے ساتھ ساتھ اسرائیل نے بھارت کے ساتھ مل کر ضروری سامان کے حصول کے لئے یورپ میں مختلف ناموں سے دفاتر بھی بنا رکھے تھے۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد نے تمام یورپ میں اپنے اسٹیشن قائم کر رکھے ہیں جو مختلف شکلوں میں کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے 1976ء میں کوپن ہیگن میں موساد کے اسٹیشن کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے بعد برسلز' ایمسٹرڈیم' فرینکفرٹ' روم اور پیرس کے اسٹیشن کام میں لائے گئے جہاں ''را'' کے ارکان بھارتی ماہرین کی نقل و حرکت اور سامان کی ترسیل پر نظر رکھتے تھے۔ موساد کے یہ اسٹیشن نہ صرف اس مقصد کے لئے استعمال ہو رہے تھے بلکہ ان کے ذریعے پاکستان' عراق' لیبیا اور ایران کی ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کی کوششوں کے سلسلے میں بھی نظر رکھی جاتی تھی۔ اس زیرزمین جدوجہد میں متعدد بار ان ممالک کے افراد کا موساد اور را کے ایجنٹوں سے سامنا بھی ہوا جس نے کئی مرتبہ تصادم کی شکل بھی اختیار کی تھی۔

اسلامی ملکوں میں پاکستان کے علاوہ جن ممالک نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ان میں عراق سرفہرست ہے جو اس صلاحیت کو حاصل کرنے کے لئے بھرپور مالی وسائل بھی رکھتا تھا۔ اسرائیل کو بھارتی معاونت حاصل ہونے کے باوجود اس کا پاکستان کے معاملے میں زیادہ زور نہیں چلتا تھا۔ اس لئے پاکستان کے بعد جس اسلامی ملک

ایٹمی صلاحیت کے خلاف زیر زمین جنگ لڑی وہ عراق تھا اس میں وہ کئی وجوہات کی بناء پر کامیاب بھی رہا۔

عراق کا ایٹمی پروگرام خاصے منتشر انداز میں شروع ہوا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس مطلوبہ ماہرین کی کمی تھی اور شروع میں جو سائنسدان عراقی پروجیکٹ سے منسلک تھے وہ مختلف شہریتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بھی کئی سائنسدانوں کو موساد نے یورپ میں ٹھکانے لگا دیا تھا۔ عراقی ہر چیز سرمائے کی بنیاد پر خرید لینا چاہتے تھے جو ممکن نہیں تھا اس میدان میں خونِ جگر کی بھی ضرورت تھی جو صرف مقصد سے اخلاص کی بنیاد پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ زیادہ تر عراقی ماہرین یورپ میں عیاشیوں میں پڑ گئے تھے اسی مقام پر لا کر موساد انہیں قابو کرتی رہی۔

عراق کے ایٹمی پروجیکٹ کی ابتداء 1973ء سے ہی ہو چکی تھی' مصری نژاد ڈاکٹر مشہدی کو عراقی ایٹمی پروگرام کا انچارج مقرر کیا گیا تھا جسے بعد میں موساد نے پیرس کے میرڈین ہوٹل میں قتل کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں عراق نے سب سے پہلے فرانس روابط استوار کیے۔ سیاسی سطح پر فرانس کے عراق کے ساتھ تعلقات ہمیشہ مثالی رہے ہیں۔ فرانس کے ایٹمی کمیشن کے نچارج جیک شیراک نے دسمبر 1974ء میں عراق کا دورہ کیا جس نے اسرائیلیوں کے کان کھڑے کر دیئے۔ یہ خبر سب سے پہلے اسرائیلی اخبار ہیرٹز کے پیرس میں سترسالہ نامہ نگار ایلی سی نے آؤٹ کی۔ جس کے مطابق عراق اور فرانس کے درمیان ایٹمی ری ایکٹر کی سپلائی کے لئے بات چیت ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ جس کا نام اوسرک ری ایکٹر تھا۔ ایلی میسی کے طابق ''میں نے 1976ء میں فرانسیسی اخبار میں ایک چھوٹی سی آئیٹم کی تصویر دیکھی جو عراق بھیجی جا رہی تھی جس سے میں چونک گیا اور فوراً فرانس کے ایٹمی کمیشن کے دفتر جا پہنچا جب میں نے متعلقہ افراد سے اس کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا چیز عراق بھیجی جا رہی ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ مکمل طور پر ایک کاروباری ڈیل ہے مگر کمیشن نے اس سے متعلق جو لٹریچر مجھے دیا اس کے طابق اس پارسل میں عراق کے اوسرک ری ایکٹر کے لئے 93 فیصد افزودہ یورینیم بھیجا جا رہا تھا جو ایک ایٹم بم بنانے کے لئے کافی تھا۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے تمام صورتحال اپنے اخبار کو اسرائیل ارسال کر دی۔ یہ عراق اور فرانس کے خفیہ ایٹمی تعاون کی پہلی

KURF

مستند خبر تھی۔ اس کے چند روز بعد ہی ''ٹریبون جونی'' نے سٹوری شائع کر دی جس میں فرانس اور عراق کے خفیہ ایٹمی روابط کھول دیئے گئے جس پر فرانس کے دفتر خارجہ نے سختی سے اس خبر کو مسترد کرتے ہوئے بیان دیا کہ یہ مکمل طور پر ایک کاروباری ڈیل ہے کوئی خفیہ معاملہ نہیں ہے۔ اس کے بعد تل ابیب کی جانب سے پیرس میں اسرائیلی ایمبیسی کو فرانسیسی وزارت خارجہ میں اس معاملے کی چھان بین کا کام سونپا گیا' یہاں سے بھی اس قسم کی معلومات حاصل ہو سکیں۔'' اسرائیلی اخبار کا نامہ نگار میسی اس معاملے میں انتہا پسندی کی حد تک جانا چاہتا تھا مگر اس کے خیال میں اسرائیل میں اس معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا تھا!

1977ء تک اسرائیلیوں کو عراق کے ایٹمی معاملات کو زیادہ خراب کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس دوران اسرائیل نے فرانس سے باضابطہ احتجاج بھی کیا مگر ویلری جسکارڈ حکومت نے اس احتجاج پر کان نہ دھرے۔ اسرائیلیوں کے لئے یہ وقت کافی سخت تھا۔ بیلجیم کی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان کے مطابق عراق سے خطرہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ ایک NPT ملک ہے جبکہ اسرائیل نے اس معاہدے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسرائیلی عراق کے ایٹمی پروگرام سے اپنا تخریب کاری کا رشتہ توڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ فرانسیسی انہیں مسلسل نظر انداز کر رہے تھے اسی نظر اندازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیلیوں نے (La Seyne-sur-Mer) میں دھماکہ کرا دیا تھا اب اسرائیل کے ساتھ امریکہ بھی فرانس سے احتجاج کر رہا تھا اس نے عراق سے ری ایکٹر کی سپلائی کا معاہدہ کیوں کیا۔ فرانس نے عراق کے ساتھ معاہدے پر دستخط اگست 1976ء میں کیے تھے جبکہ امریکہ کی فورڈ انتظامیہ نے نومبر میں ہی اپنے یورپین اتحادیوں کے ساتھ مل کر فرانس پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ برطانیہ اس میں پیش پیش تھا۔ مگر فرانسیسی حکومت اسے اپنے کاروباری معاملات میں مداخلت تصور کر کے مسترد کر رہی تھی جس کی وجہ سے اسرائیل نے یورپ میں زیر زمین کارروائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

1980ء میں عراق کے لئے ایٹمی ساز و سامان کی فرانس میں شپمنٹ جاری تھی کہ اسرائیلی کمانڈوز نے اسے دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ اس میں عراق کی اپنی کمزوری بھی تھی اس نے اس سلسلے میں سامان سٹور کرنے سے پہلے اپنی سیکورٹی کا کوئی خاص بندوبست نہیں کیا تھا۔ جس سے اسرائیلیوں کو کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ اس طرح عراق میں ایٹمی تنصیبات بھی زیادہ محفوظ نہیں

جامعۃ کراچی دار التحقیق برائے علم و دانش

تھیں' جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیلی طیاروں نے 30 ستمبر 1980ء کو جب ایران عراق جنگ شروع ہوئے ابھی نو روز ہوئے تھے عراقی ایٹمی ری ایکٹر کو اپنے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس طرح عراق کو اب تک جو کچھ حاصل ہو سکا تھا وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسرائیل اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔

اسلامی ممالک میں ایران بھی ایٹمی صلاحیت کے حصول کے لئے لمبے عرصے سے کوشاں تھا۔ ایٹمی توانائی کے حصول کی کوششیں سابق شاہ ایران کے دور میں ہی شروع ہو چکی تھیں۔ شروع میں تمام ملک میں 23 ایٹمی ری ایکٹر نصب کرنا تھے' 70ء کی دہائی میں ایران اس میدان میں باقاعدہ طور پر شامل ہو چکا تھا۔ 1974ء میں شاہ ایران نے ایرانی ایٹمی کمیشن کی بنیاد رکھی' اس کے بعد امریکہ' فرانس اور مغربی جرمنی سے باقاعدہ مذاکرات شروع کئے گئے۔ امریکہ نے اس وقت تہران کی مہر آباد یونیورسٹی کے سائنسی شعبے کے لئے پانچ میگاواٹ کا ایٹمی ری ایکٹر مہیا کیا تھا۔

شاہِ ایران کے زوال کے بعد امریکہ' فرانس اور مغربی جرمنی نے ایران کے ساتھ تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ 1979ء تک مغربی جرمنی نے ایران میں ایک ری ایکٹر کی تنصیب کا کام 65 فیصد تک مکمل کر لیا تھا جبکہ ایک دوسرے ری ایکٹر کا کام 75 فیصد مکمل ہو چکا تھا جبکہ فرانس ایران کے علاقے دارِخوفین میں ایک ری ایکٹر کی تنصیب کا کام کر رہا تھا یہ تمام منصوبے ایرانی انقلاب کے بعد روک دیئے گئے۔

شاہ ایران نے اپنے زمانے میں تین مغربی ممالک سے ایرانی ری ایکٹروں کے لئے افزودہ یورینیم کی سپلائی اور ایرانی ماہرین کی تربیت کا معاہدہ بھی کیا تھا' مگر شاہ ایران کے ساتھ ہی یہ تمام معاہدے بھی ختم ہو گئے۔ 1984ء میں ایران نے ایک مرتبہ پھر اس ٹیکنالوجی کی جانب توجہ مبذول کی مگر اس مرتبہ اسے خاصی دشواریوں کا سامنا تھا۔ اسرائیل اور امریکہ کی رکاوٹ اس کے آڑے تھی۔ 1974ء میں ایران نے بوشہر کے مقام پر ایٹمی ری ایکٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ری ایکٹر جرمن ساختہ تھا۔ 1987ء میں ایران نے اپنے ایٹمی پروگرام کے لئے باقاعدہ بجٹ میں فنڈ مقرر کیا۔ مغرب کی طرف سے ٹیکنالوجی کے حصول میں ناکامی کے بعد ایران نے اس مقصد کے لئے چین اور روس کی جانب اپنی توجہ مبذول کر دی۔ ایرانی

ماہرین مغرب کی سازشوں کے باوجود اپنے کام میں مگن رہے۔ انہیں ایک ری ایکٹر بنا لینے کی صلاحیت تو حاصل ہو چکی تھی مگر افزودہ یورینیم کا حصول سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جبکہ مغربی ممالک اور امریکہ کا دعویٰ تھا کہ ایران نے اپنے جزیرے خزرج اور دوسرے مقامات پر یورینیم افزودہ کرنے کے پلانٹ نصب کر رکھے ہیں۔

عراق کا تلخ تجربہ ایران کے سامنے تھا' عراقی سائنسدان خصوصاً ڈاکٹر مشہدی کی پیرس میں ہلاکت کے بعد ایران اپنے ماہرین مغربی ممالک میں بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا جبکہ اس کی نسبت روس اور چین قدرے محفوظ علاقے تھے۔ مئی 1987ء میں ایران نے ارجنٹائن کے ساتھ ایٹمی تعلقات استوار کر لئے تھے اس کے ساتھ ایک معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ ارجنٹائن ایران کو 5.5 فیصد افزودہ یورینیم مہیا کرے گا جو ایران مہر آباد کے ایٹمی ری ایکٹر میں استعمال کر سکے گا مگر 1992ء میں ارجنٹائن نے امریکہ اور یورپ کے دباؤ پر ایٹمی ایندھن کی ترسیل روک دی۔ غرض یہ کہ ایران نے اس ٹیکنالوجی کو زیادہ تر روس اور چین کے راستے سے حاصل کیا اور اس میں بڑی حد تک مہارت حاصل کر لی۔

ایٹمی توانائی کے حصول سے متعلق یہ چند ممالک کی مساعی کا مختصر ترین جائزہ تھا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان نے کس مصیبت سے گزر کر اپنے آپ کو اس مقام تک پہنچایا ہے جسے آج قوم ''یوم تکبیر'' کے نام سے جانتی ہے۔